مسیرۃ البشر

تہذیبِ انسانی کا سفر

آفاق صدیقی

Agha Suhail Ahmed
ذاتی کتب خانہ

محترم ادب دوست
ڈاکٹر خالد حسین نور الٰہی صاحب کے لیے
خلوص کے ساتھ
آغا سہیل احمد
5.5.03

Agha Suhail Ahmed

مسیرۃ البشر

تہذیب انسانی کا سفر

تصنیف.......................پروفیسر آفاق صدیقی

ترتیب وتدوین.......................سلیم فرخی

ناشر

حرا مطبوعات

5c\2-L214 ناظم آباد کراچی

پوسٹ بکس نمبر 10455 صدر، کراچی

جملہ حقوق بحق حرا مطبوعات محفوظ

نام کتاب.................... مسیرۃ البشر

مرتب.......................... سلیم فرخی

پہلی اشاعت............. نومبر ۲۰۰۰ء

قیمت......................... ۱۵۰ روپے

ناشر

حرا مطبوعات

تعاون

جہان حمد پبلی کیشنز لیاقت آباد، کراچی

Agha Suhail Ahmed

انتساب

شہید پاکستان حکیم محمد سعید

کے نام

جن کی مثالی شخصیت اور انسانیت نواز کارنامے

ہمیں دل و جاں سے عزیز ہیں

آفاق صدیقی.......................... سلیم فرخی

حرا مطبوعات

5C/2-L214 ناظم آباد کراچی

پوسٹ بکس نمبر 10455 صدر کراچی

Agha Suhail Ahmed

اشاریہ

عرض مرتب ۹

آفاق صدیقی ۱۱

چند تاثرات ۱۲

۱-تاریخ کی روشنی میں ۱۹

۲مقصد تخلیق آدم ۲۲

۳-مذاہب عالم ۲۵

۴-انسانی عزم و ہمت ۲۷

۵-قدیم تہذیبی گہوارے ۳۰

۶-وادیٔ نیل کی تہذیب ۳۲

۷-اہرام مصر ۳۵

۸-مصری تہذیب ۳۸

۹-مصری شہنشاہیت ۴۱

۱۰-زوال مصر ۴۴

۱۱-دجلہ و فرات کی وادی ۴۷

۱۲-موہن جو دڑو کی تہذیب ۵۰

۱۳-چینی تہذیب ۵۲

۱۴-ہڑپہ کی تہذیب ۵۵

۱۵-کوٹ ڈیجی ۵۸

۱۶-بودھ مذہب ۶۱

۱۷-اشوک کا دور ۶۴

۱۸-تہذیب انسانی اور ہندومت ۶۷

۱۹-سامری تہذیب ۷۰

۲۰-آشوری تہذیب ۷۴
۲۱-بابلی تہذیب ۷۷
۲۲-آشوری عروج و زوال ۸۰
۲۳-کلدانی تہذیب ۸۳
۲۴-ایرانی تہذیب ۸۶
۲۵-ایرانی شہنشاہیت ۸۹
۲۶-زرتشتی مذہب ۹۲
۲۷-ایرانی تہذیب کا ورثہ ۹۵
۲۸-قدیم یونان ۹۸
۲۹-قدیم یونانی معاشرہ ۱۰۱
۳۰-یونان کا جمہوری اور جابری نظام ۱۰۴
یونانی نو آبادیات ۱۱۰
۳۱-یونانی تہذیب اور امراء کا اقتدار ۱۰۷
۳۲-یونان اور ایران کی جنگیں (۱) ۱۱۳
۳۳-یہودیت ۱۱۶
۳۴-بنی اسرائیل ۱۱۹
۳۵-یہودی مذہب ۱۲۲
۳۶-یونانی تہذیب ۱۲۵
۳۷-رومن امپائر ۱۲۸
۳۸-رومن اور کارتھیج کی لڑائیاں ۱۳۱
۳۹-روم کا دور شہنشاہیت ۱۳۴
۴۰-یونان اور ایران کی جنگیں (۲) ۱۳۷
۴۱-روم جمہوریت سے شہنشاہیت تک ۱۳۹
۴۲-ایتھنز اور اسپارٹا کی جنگیں ۱۴۱

Agha Suhail Ahmed

۴۳-روم کی ابتدائی تاریخ ۱۴۴
۴۴-سکندر اعظم ۱۴۷
۴۵-رومی فتوحات ۱۵۰
۴۶-رومی جمہوریت ۱۵۳
۴۷-عیسائیت (۱) ۱۵۶
۴۸-عیسائیت (۲) ۱۵۹
۴۹-روم کا تہذیبی ورثہ ۱۶۲
۵۰-ظہور قدسیؐ ۱۶۵
۵۱-بعثت نبویؐ ۱۶۸
۵۲-بعثت نبویؐ کے بعد ۱۷۱
۵۳-ہجرت نبویؐ سے پہلے ۱۷۴
۵۴-ہجرت نبویؐ ۱۷۷
۵۵-حضورؐ کی مدنی زندگی ۱۸۰
۵۶-تعلیمات نبویؐ ۱۸۳
۵۷-سیرت طیبہؐ ۱۸۶
۵۸-غزوات ۱۸۹
۵۹-فتح مکہ ۱۹۲
۶۰-حجتہ الوداع ۱۹۵
۶۱-حضرت ابوبکرؓ ۱۹۸
۶۲-خلافتِ فاروقیؓ ۲۰۱
۶۳-خلافت عثمان غنیؓ ۲۰۴
۶۴-حضرت علیؓ ۲۰۷
۶۵-خلافت بنو امیہ ۲۱۰
۶۶-حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ۲۱۳

۶۷-خلافت عباسیہ ۲۱۶

۶۸-خلافت فاطمیہ ۲۱۹

۶۹-اسپین کی اموی سلطنت ۲۲۲

۷۰-ظہورِ اسلام اور تاریخ و تہذیب ۲۲۵

۷۱-اسلام کا مذہبی نظام ۲۲۸

۷۲-اسلام اور علم معرفت ۲۳۱

۷۳-اسلامی تعلیم کا نظام ۲۳۴

۷۴-مسلمانوں کا عقیدہ تخلیق و ارتقاء ۲۳۷

۷۵-انسان اور انسانیت ۲۴۰

۷۶-حصولِ علم و حکمت ۲۴۴

۷۷-براعظم افریقہ پر اسلام کے اثرات ۲۴۷

۷۸-برصغیر پر اسلام کے اثرات ۲۵۰

۷۹-مسلمانوں کی خود مختار ریاستیں ۲۵۲

۸۰-صلیبی جنگیں ۲۵۶

۸۱-مسلمانوں کے سائنسی کارنامے ۲۵۹

۸۲-اسلام کا نظام معاشرت ۲۶۲

۸۳-اسلام کا نظام سیاست و معیشت ۲۶۵

۸۴-تہذیب کا سفر اور اسلام ۲۶۸

۸۵-ہندوستان کی آریائی تہذیب ۲۷۱

۸۶-ہند آریائی تہذیب پر ایرانی اور یونانی اثرات ۲۷۵

۸۷-غزنوی سلطنت ۲۷۸

۸۸-عیسائیوں کی مذہبی کتابیں ۲۸۱

۸۹-ابنِ خلدون ۲۹۴

۹۰-تسخیر کائنات ۲۸۷

ہزاروں سال کی تہذیب انسانی کا مطالعہ ریل گاڑی میں سفر کرنے کی مانند ہے۔ مہذب دنیا کے حالات و واقعات ہمارے سامنے آتے اور گزر جاتے ہیں۔ پھر جب ہم کسی منزل پر پہنچ کر رک جائیں اور اپنے مشاہدے و مطالعے میں آنے والے تمام مناظر کو ذہن میں سمیٹنے کی کوشش کریں تو ایسا لگتا ہے جیسے فاصلے سمٹ کر چند ایسے حقائق کی صورت اختیار کر گئے ہوں .. صدیوں کی تہذیبی زندگی کا خلاصہ بن گئے ہوں۔

زندگی کے ہر شعبے کو سمجھنے کے لیے تاریخ کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ یہ ایک ایسا وسیع اور دلچسپ موضوع ہے جس سے علم کی بیشتر شاخیں وابستہ ہیں۔ تاریخ میں گزرے ہوئے واقعات بھی ملیں گے اور انسانی عزم و ہمت کی داستانیں بھی۔ اس میں انسانی نفسیات کی جھلک بھی ملے گی اور عظیم انسانوں کے وہ قصے بھی ملیں گے جن سے آگاہی حاصل کر کے اور ان پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنے مستقبل کو روشن بنا سکتے ہیں۔

بہت سے لوگوں میں کھوج لگانے کا فطری جذبہ ہوتا ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان سے پہلے کا زمانہ کیسا تھا؟ لوگ کیسے زندگی گزارتے تھے؟ انسانی کردار میں کیا کیا خوبیاں ور خامیاں موجود تھیں اور ہیں؟ انسانوں نے ایسے کون سے کارنامے انجام دیے جن کی بدولت ان کا نام ہمیشہ کے لیے تاریخ میں محفوظ کر لیا گیا۔

مجھے بھی تاریخ کے مطالعہ کا شوق رہا ہے اور ہے' اس لیے جب مجھے معلوم ہوا کہ محترم پروفیسر آفاق صدیقی نے عرب امارات کے ریڈیو نیٹ ورک کی اردو نشریات کے لیے تہذیب انسانی کی تاریخ پر "مسیرۃ البشر" کے نام سے بہت سے فیچرز لکھے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے یہ فیچرز مطالعے کے لیے عنایت فرمائے جائیں۔ ان فیچرز کو پڑھنے کے بعد انتہائی خوشی ہوئی اور حیرت بھی۔ خوشی اس لیے تھی کہ یہ ایک بہت اہم کام تھا جسے انھوں نے بڑی ذمہ داری اور خلوص سے پورا کیا اور حیرت اس بات کی تھی کہ محترم آفاق صدیقی صاحب بہت ہی مصروف انسان ہیں اور ان کا ایک مخصوص شعبہ ہے جس میں انھوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس تحقیقی کام کے لیے وقت نکالنا بے حد دشوار تھا' لیکن جب انسان کے اندر محبت اور خلوص کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو تو ایسے ہی یادگار کام انجام پاتے ہیں۔

اس تحقیقی کتاب میں تاریخ کی اہمیت و افادیت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے اور انسان کی

تخلیق کے مختلف نظریات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ تسخیر فطرت اور تسخیر کائنات کی ہر پیش رفت انسان ہی کے فکر و عمل سے منسوب ہے۔ ابتدائے آفرینش سے انسان نے اپنے فہم و ادراک، شعور و آگہی، اور ہوش وحواس کو تہذیب کی خوب سے خوب تر منزل تلاش کرنے پر صرف کیا ہے۔ اس کتاب میں انسان کے قدیم تہذیبی گہواروں کا ذکر بھی ہے اور مختلف تہذیبوں کے ایک دوسرے پر اثرات کا جائزہ بھی۔ مختلف مثلاً سامری، بابلی، آشوری، کلدانی، چینی، یونانی، ایرانی، ہندوستانی اور تہذیب اسلامی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مذاہب عالم پر بھی تحقیقی لوازمات کو یکجا کیا ہے۔ اس طرح تمام فیچر قریب قریب آٹھ دس ہزار برس کی دلچسپ کہانی سناتے ہیں۔ ہر فیچر ۱۵ منٹ کے دورانیہ پر مشتمل تھا۔ تین چار منٹ کا تعارفی ابتدائیہ اور چار پانچ منٹ کا بقیہ احوال، مگر اس سے پہلے فیچر کے تاریخی حقائق کو سامعین کے لیے زیادہ اثر آفریں بنانے کی خاطر تمثیلی مکالمے تھے۔ فیچرز کی ریکارڈنگ کراچی کے بہترین اسٹوڈیوز میں کی گئی اور جن ممتاز صداکاروں نے اپنی فنکاری کا جادو جگایا ان میں شہریار قدوسی، جمشید انصاری، ذہین طاہرہ، عائشہ خاں اور فاروق جیسے صداکار شامل تھے۔

یہ فیچرز سامعین میں بہت مقبول ہوئے۔ میں نے ان کا مطالعہ کیا تو خیال آیا کہ کاش یہ فیچر کتابی صورت میں پیش کیے جائیں، لیکن جب محترم پروفیسر آفاق صدیقی صاحب سے اس بارے میں بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ اگر یہ فیچر اپنی اصلی صورت میں شائع کیے جائیں تو ضخامت کم سے کم ایک ہزار صفحات تک پہنچے گی اس لیے مکالموں کا حصہ نکال کر ترتیب و تدوین کی جائے۔

یہ ذمہ داری راقم الحروف نے قبول کی اور اللہ کا شکر ہے دو ڈھائی سال کی محنت کے بعد اب یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔

اس کی قدر و قیمت کا بذات خود اندازہ لگائیے۔ مجھے تو خلوص دل سے محترم آفاق صدیقی صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے یہ سعادت بخشی کہ میں اس کتاب کو اپنے طور پر ترتیب دے سکوں۔

امید ہے آپ کو یہ کتاب پسند آئے گی۔

سلیم فرخی

اس کتاب کے بارے میں عزیزم سلیم فرخی جو کچھ بیان کر چکے، وہ کافی ہے۔ مجھے تو جن کرم فرماؤں اور اپنے پیارے رفقائے کار کا شکریہ ادا کرنا ہے ان میں بھائی محمد احمد خاں، جناب شفق صدیقی، جناب محمد میاں صدیقی اور سیدی طیب علی کے نام میرے دل پر نقش ہیں۔

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کا فیضان تو سارے جہاں پر ہے۔ صدر نشین محترمہ سعدیہ راشد اور تمام کارکنان سلامت باکرامت رہیں کہ علم و ادب کے فروغ میں بھی اس ہمہ جہت ادارے کی خدمات لائقِ تحسین ہیں۔

سلیم میاں نے کتاب کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ انشاء اللہ "حرا مطبوعات" کو بجا طور پر ایک وقیع اشاعتی مرکز بنائیں گی۔

احقر العباد

آفاق صدیقی

چند تاثرات

شفق صدیقی کوپن ہیگن (ڈنمارک)

زیر نظر کتاب " میسرۃ البشر " (تہذیب انسانی کا سفر) محترم آفاق صدیقی صاحب کی تصنیف ہے۔ جس کی ترتیب محترم سلیم فرخی صاحب کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچی۔

یہ محترم آفاق صدیقی صاحب کی عظیم کاوش کا نتیجہ ہے۔ نام کے اعتبار سے یہ بالکل انوکھا ہونے کے ساتھ ساتھ ان حضرات کے لیئے پرکشش بھی ہے جن کو انسانیت سے پیار ہے۔

جہاں تک راقم الحروف کی معلومات کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اپنے موضوع پر اردو زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب اور منفرد کتاب ہے۔

جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے ختم المرسلین حضرت محمد ﷺ تک تمام تہذیبی دھاروں کے تحقیقی تجزیہ کو یک جا کرنے کے بعد پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد طلوع اسلام کے بعد جو تہذیبی عمل شروع ہوا اس کے حوالہ جات بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔

اس کتاب کے مسودہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کے موصوف نے اس صبر آزما اور پتہ ماری کے کام کو انجام تک پہنچانے کے سلسلہ میں نہ جانے کتابوں کے کتنے قبرستان کھنگال کر بڑی گہری نظر سے اپنے موضوع سے متعلق مواد جمع کرنے میں یقیناً کئی سال کا عرصہ صرف کیا ہو گا۔

دنیا میں کوئی بھی شخص اپنی زندگی کے چند قیمتی سال کسی موضوع سے متعلق مواد جمع کرنے میں اسی صورت صرف کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ جب وہ سمجھتا ہے کہ اس موضوع سے متعلق مواد کی تلاش میری زندگی سے زیادہ قیمتی اور اہم ہے۔ ایسی صورت میں موصوف کی کاوش کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جو میسرۃ البشر (تہذیب انسانی کا سفر) جیسی انوکھی

تحقیقاتی دستاویزات اہل علم کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں -

تہذیب انسانی کے سفر پر قلم اٹھانا بڑے دل گردے کا کام ہے -جس پر محترم آفاق صدیقی صاحب نے بڑی عرق ریزی کے بعد اپنی تحقیقات پر مبنی جو دستاویزات پیش کی ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ موصوف، کو انسانیت اپنی زندگی سے زیادہ پیاری ہے -

انسانی تہذیب کے سفر کا آغاز چونکہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے جو کہ پہلے انسان ہونے کے علاوہ اشرف المخلوقات بھی ہیں - جن کی نسل سے ساری دنیا آباد ہے -

بحیثیت مسلمان ہم ڈارون تھیوری کے مطابق کہ" انسان بندروں کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے " پر یقین نہیں رکھتے بلکہ قرآن پر تدبر و تفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے قبل فرشتوں سے ذکر فرمایا - جس کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ البقرۃ کی آیت ۳۰ تا ۳۳ میں بیان فرمایا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے -

" اور وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں - تو انہوں نے کہا ،کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے؟ جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے - اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں - اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے - اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے - پھر ان کو فرشتوں کے سامنے کیا اور فرمایا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ - انہوں نے کہا تو پاک ہے - جتنا علم تونے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں - بیشک تو دانا اور حکمت والا ہے - اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کو حکم دیا کہ تم ان کو ان چیزوں کے نام بتاؤ - جب انہوں نے نام بتا دیئے - تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا - میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب پوشیدہ باتیں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو- سب مجھ کو معلوم ہے -

مندرجہ بالا قرآنی آیات سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ انسان فرشتوں سے زیادہ

افضل ہے - یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب کی حیثیت سے انسان کا انتخاب فرمایا -
ایسی صورت میں ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے بارے میں غور کرے کہ وہ کیا ہے ؟ کیوں ہے ؟ اور کیسے ہے ؟

اس سلسلہ میں جب ہم اپنی فکر کو حرکت دیتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان یعنی فرد کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور بقول قرآن وہ گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جس کو قرآن علق کے نام سے یاد کرتا ہے-لیکن یہی گوشت کا لوتھڑا جب کسی معاشرہ کا حصہ بن کر اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرنے کی جد و جہد پر آمادہ ہو جاتاہے تو دوسرے افراد کے تعاون کی ضرورت پیش آتی ہے - کیوں کہ دنیا کا کوئی فرد اس وقت تک کوئی اہمیت حاصل نہیں کر سکتا جب تک معاشرے کے دوسرے افراد کا تعاون اور اتحاد حاصل نہ ہو اس طرح اس کو زندگی کے مقاصد کے حصول کے لیئے جد و جہد شروع کرنے سے پہلے معاشرے کے دوسرے افراد کو اپنے ساتھ اتحاد اور تعاون پر آمادہ کرنا پڑتا ہے -اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے مقصد کے حصول کے لیئے کسی نصب العین کا تعین ضروری ہو جاتا ہے - وہ نصب العین ہی اس کی حقیقی منزل ہوتی ہے - لہٰذا اس منزل پر پہنچنے کے لیئے صحیح راہ کا انتخاب ضروری ہے - اور صحیح راہ کے انتخاب کے لیئے کسی رہنما کی ضرورت ہوتی ہے - اور صحیح رہنمائی وہی شخص کر سکتا ہے جو علم کی دولت سے مالا مال ہو - اور علم سے مالا مال ہونے کے لیئے تدبر تفکر ضروری ہے - تدبر و تفکر کے لیئے عقل و فہم ضروری ہے - عقیل و فہیم ہونے کے لیئے سب سے پہلے اپنے بارے میں مکمل معلومات ضروری ہے - کہ وہ کیا ہے ؟ کیوں ہے اور کیسے ہے ؟

جب کوئی شخص خود اپنے بارے میں تمام اسباب، معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کو خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے - اسی لیئے کہا گیا ہے کہ "من عرف نفسہٖ فقد عرف ربہٗ " اور یہ حقیقت ہے کہ جس شخص کو خدا کی معرفت حاصل ہو جائے وہ کبھی گم نہیں ہو سکتا - اور جو شخص خود گمراہ نہ ہو وہی صحیح معنوں میں صحیح راہ کا انتخاب کر کے منزل مقصود تک پہنچنے کے لیئے رہنمائی کا فریضہ ادا کر سکتا ہے - اسی قسم کے افراد کے

قرآن انبیاء، صدیقین و صالحین کے نام سے یاد کرتا ہے۔جس کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور انبیا کا سلسلہ تو خاتم المرسلین حضرت محمد ﷺ پر ختم ہو گیا - لیکن صدیقین اور صالحین کا سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا -

آدم علیہ السلام سے خاتم المرسلین ﷺ تک مختلف ادوار میں ہر علاقہ میں مختلف قسم کی تہذیبوں نے جنم لیا ان میں سے کچھ اپنی موت آپ مر گئیں اور کچھ مختلف قسم کی تبدیلیوں کے بعد ابھی تک باقی ہیں -

اس مسئلہ پر کسی قسم کی بحث شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اس بات کی وضاحت کریں کہ تہذیب انسانی کے سلسلہ میں بنیادی سوالات کیا پیدا ہوتے ہیں ؟ آخر تہذیب انسانی سے ہماری مراد کیا ہے ؟

کیا یہ کسی منظم مسلک عمل کا نام ہے ؟

یا محض فکری انداز حیات ہے ؟

یا ان کا مجموعہ ہے ؟

اس کا تعلق افراد معاشرہ کے اعمال و عادات سے ہے ؟

یا اس کی اجتماعی یک رنگی اور معاشرتی تنظیم کا نام ہے ؟

پھر اس کے نفوذ کے سر چشمے داخلی ہیں یا خارجی ؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ تہذیب و تمدن دو ایسے لازم و ملزوم اجتماعی الفاظ ہیں جن کو ی صورت بھی علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا -

در اصل تہذیب کسی قوم کے رہن سہن کے انداز سے جو ذہنی و فکری عمل کے نتیجہ میں دو خود ظہور پزیر ہو جاتے ہیں - ان کے مجموعے کو تہذیب کا نام دیا جا سکتا ہے -

عام طور پر تہذیب، تمدن ،سولائزیشن وغیرہ کے الفاظ ان اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتے ں کہ کسی قوم کے منظم مسلک عمل اور انداز حیات پر مشتمل طرز زندگی کیا ہے ؟ اسی کو ہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے -

اس اعتبار سے تہذیب کا آغاز سب سے پہلے انسان اور حضرت حوا کی پیدائش کے بعد جب

نسل انسانی کا سلسلہ شروع ہوا - اس کے بعد جیسے جیسے دنیا میں انسانوں کی تعداد بڑھتی گئی ذہنی اختلافات کی صورتیں بھی سامنے آنے لگیں اس ذہنی اختلاف کے نتیجہ میں تمام انسان دو طبقات میں تقسیم ہو گئے-ان میں سے ایک طبقہ صالحین اور صدیقین کا اور دوسرا طبقہ گمراہوں پر مشتمل تھا -اس گمراہ طبقہ کی اصلاح کی کوششیں صدیقین اور صالحین اپنے طور پر کرتے رہے پھر انہیں صدیقین اور صالحین میں سے اللہ تعالیٰ اپنے رسول منتخب فرمائے -

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے تقریباً ایک ہزار سال بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو عوام الناس کی ہدایت کے لیئے معبوث فرمایا - حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی پوری کوشش سے عوام کو گمراہی سے نجات دلانے میں شب و روز تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا جس کے نتیجہ میں گمراہوں کی بہت ہی قلیل تعداد گمراہی سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی تابعداری پر آمادہ ہو سکی - پھر اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام نے ایک کشتی تیار کی جس میں ہدایت یافتہ افراد کو بٹھا دیا - اس کے بعد گمراہوں پر پانی کی صورت اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا جس کا ذکر قرآن کریم اور انجیل میں طوفان نوح کے نام سے کیا گیا ہے -

جب طوفان نوح ختم ہوا تو دنیا کے تمام انسان ہلاک ہو چکے تھے اور صرف وہی ہدایت یافتہ افراد زندہ بچے تھے جو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کے ہم سفر تھے -

اس کے بعد پھر جب نسل انسانی بڑھنا شروع ہوئی تو اس کے ساری دنیا میں پھیل جانے کی وجہ سے ہر علاقہ میں رہنے والوں میں الگ الگ تہذیبوں نے جنم لیا جن میں کچھ تہذیبیں ترقی یافتہ کہلائیں اور کچھ غیر ترقی یافتہ- اس کے بعد ایک زمانہ آیا کہ یونان میں افلاطون کے شاگرد ارسطو نے اپنی تہذیب کو ترقی دینے کے لیئے خیال اور وجدان کے کچھ ایسے طریقے اپنائے کہ دیکھتے ہی دیکھتے یونان دنیا کے ترقی یافتہ اور مہذب ترین علاقوں میں شمار ہونے لگا -

اس کے بعد ۶۱۰ء میں جب ختم المرسلین حضرت محمد ﷺ نے اسلام کی دعوت دینا شروع کی تو دنیا کی تمام تہذیبوں سے ہٹ کر ایک نئی تہذیب نے جنم لیا -

اسلامی تہذیب کے بنیادی عقیدے توحید پر ایمان ، فرشتوں پر ایمان ، وحی پر ایمان ،

رسولوں پر ایمان ، قیامت کے دن اور جزا و سزا پر ایمان ۔

توحید پر ایمان کے معنی ہیں کہ ہم خدا کو ایک مانیں اور اپنے ہر معاملے میں اسی سے مدد مانگیں اور ہر تکلیف میں اسی سے رجوع کریں - اس اعتبار سے اگر توحید کے عقیدہ پر غیر متزلزل ایمان ہو جائے تو وہ اتنی بڑی قوت ہے کہ اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی دوسری بڑی سے بڑی طاقت نہیں کر سکتی -

اس کے بعد فرشتوں پر ایمان مستحکم ہونے سے انسان کے دل میں یہ یقین پیوست ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے تابعدار بندوں کی فرشتوں کے ذریعہ مدد فرماتا رہتا ہے -

وحی پر ایمان ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی کتابوں پر یقین کرنے کے بعد خدائی احکامات کی پابندی کو اپنے اوپر لازمی قرار دے کر اس کے مطابق اپنی زندگی گزارنے پر آمادگی ظاہر کرتا ہے -

اس کے بعد رسالت پر ایمان سے مراد ہے کہ آنحضرت محمد ﷺ کو خدا کا رسول تسلیم کریں اور آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ اور اقوال و ارشادات کو ہی حکم سمجھیں - جب کسی معاملہ میں یہ معلوم ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد یہ ہے تو اس کے سامنے بلا چوں و چرا گردن جھکا دینا ہی اسلام ہے -

قیامت کے دن اور جزا و سزا پر ایمان سے قدم قدم پر انسان خوف خداوندی کے پیش نظر اپنے آپ کو برائیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجہ میں برائیاں ختم ہوتی ہیں اور ایک صاف ستھری تہذیب تشکیل پاتی ہے-

جب تک مسلمان مندرجہ بالا باتوں پر عمل کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت سے ان کی سرحدیں بڑھتی چلی گئیں یہاں تک کہ تقریباً آدھی دنیا اسلام کے زیر اثر آگئی تھی - یہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے اخلاق و کردار اور طرز زندگی دیکھ کر اور سن کر گمراہوں کی ایک کثیر تعداد حلقہ اسلام میں داخل ہو گئی تھی -

لیکن جب مسلمانوں نے خدا اور رسول کی ہدایات کو نظرانداز کر کے اپنے ذاتی مفادات کو پیش نظر رکھنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت نے ہاتھ کھینچ لیا - اس کے بعد اپنے ذاتی

مفادات کی کشمکش میں ایسے الجھے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کی جگہ ہر علاقہ میں شخصی حکومتیں قائم ہونے لگیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج دنیا میں چھپن مسلمان ممالک ہیں جن کی مجموعی آبادی ایک ارب سے زیادہ ہے پھر بھی ہر جگہ ذلیل و خوار ہیں -

اس ذلت و رسوائی کا واحد سبب یہ ہے کہ موجودہ دور میں نام کے لحاظ سے تو مسلمانوں کی حکومتیں موجود ہیں لیکن حقیقی معنوں میں اسلامی تہذیب کا کہیں بھی کوئی نموونہ موجود نہیں ہے -

اگر مسلمانانِ عالم اپنی بقا چاہتے ہیں تو اپنی گمراہیوں سے توبہ کر کے جس تیزی سے اس گمراہی کی طرف آئے ہیں اس سے دو گنی رفتار سے واپس لوٹنا شروع کر دیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے راضی ہو جائے تو ایک وقت ایسا آجائے گا جب اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی نصرت پر آمادہ ہو جائے -اور اسلام کا پرچم اسی طرح سر بلند ہو جس طرح خلفائے راشدین کے زمانہ میں تھا -

و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین
الصلواۃ والسلام علیٰ سید المرسلین و خاتم النبیین

شفق صدیقی
بانی صدر انجمن فروغِ اردو
کوپن ہیگن (ڈنمارک)

تاریخ کی روشنی میں

تاریخ کا مطالعہ زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے۔ تہذیبِ انسانی کے سفر کو سمجھنا، حیاتِ انسانی کے ارتقاء سے باخبر ہونا اور مقصدِ حیات کو جاننا زندگی کا حق ادا کرنے کی دلیل ہے۔ تاریخ ہو یا تہذیب دونوں کا ارتقاء انسان کا رہینِ منت رہا ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین صورت اور ہیئت میں پیدا کر کے اشرف المخلوقات ہونے کی سعادت بخشی ہے۔

دنیا اور انسان کی تخلیق کے بارے میں مذہبی نظریہ تو یہ ہے کہ ان کو خالقِ کائنات نے پیدا کیا۔ مگر سائنسی نظریئے کے مطابق دنیا آگ کے اس کرّہ کا ایک حصّہ تھی جو کروڑوں سال پہلے نہایت تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ پھر دنیا آگ کے اس گولے سے جدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہوتی گئی اور آخرکار ایک کرّۂ ارض کی صورت میں نمودار ہوئی۔

مذہب اور سائنس اس سوال پر بھی جداگانہ نظریہ رکھتے ہیں کہ دنیا میں زندگی کیسے پیدا ہوئی۔ مذہب خالقِ حقیقی کی قدرتِ کاملہ کو تسلیم کرتا ہے اور سائنس مادّے کی تخلیق ہی کو تخلیقی قوّت مانتی ہے۔

مذہب انسان کا رشتہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے جوڑتا ہے جبکہ سائنس مختلف نظریات پیش کر چکی ہے۔ مگر اب تک دنیا کے ممتاز سائنس دان کسی ایک نظریئے پر متفق نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ڈارون کا نام لیا جا سکتا ہے جو دنیا اور انسان کے تخلیقی نظریات کا سب سے ممتاز سائنس دان مانا جاتا ہے۔ اس کا نظریہ کچھ یوں ہے کہ نسلِ انسانی کا رشتہ بندر اور لنگور کی ارتقائی صورت میں تلاش کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا اور انسان کی تخلیق سے نہ مذہب کو انکار ہے نہ سائنس کو۔

اس لئے تہذیبِ انسانی کے سفر میں اصل بات یہ ہے کہ مادّی اور روحانی سطح پر ہزاروں سال کی مسافت طے کر کے انسان تہذیبی ترقی کی جس منزل پر پہنچا ہے اس میں مذہب اور سائنس اپنے اپنے طور پر نمایاں کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ بنیادی اور بامقصد کوششوں کا سہرا تو بہرحال انسان ہی کے سر ہے۔ انسان جو فطرتاً مدنی الطبع ہے۔ انسان جو صرف گوشت پوست اور ہڈیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ سوچنے، سمجھنے، محسوس کرنے اور اپنی سوچوں کو عمل میں لانے کی بھرپور صلاحیتیں رکھتا ہے۔ یہ انسان ہی ہے جس نے نت نئی ایجادات سے زندگی کے تمام شعبوں کو مالا مال کیا ہے۔ دریاؤں میں کشتیاں تیرانے والا انسان، فضاؤں میں جہاز اڑانے والا انسان، گہرے سمندروں کی تہوں میں اترنے والا انسان، کشادہ سڑکوں اور شاہراہوں پر تیز رفتار موٹریں دوڑانے والا انسان، لامحدود امکانات کو عمل میں لانے والا انسان۔

زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، علم و ادب، طرح طرح کی ہنرمندیاں اور تمام سائنسی انکشافات انسان ہی کی بدولت حیات و کائنات کی زینت بنے ہیں۔

تسخیرِ فطرت اور تسخیرِ کائنات کی ہر پیش رفت انسان ہی کے فکر و عمل سے منسوب ہے۔ ابتدائے آفرینش سے انسان نے اپنے فہم و ادراک، شعور و آگہی اور ہوش و حواس کو تہذیب کی خوب سے خوب تر منزل تلاش کرنے پر صرف کیا ہے۔ تہذیب کا یہ سفر کاروانِ انسانیت کو مسلسل سخت کوشی پر اکساتا رہا ہے اور تاریخ کے مختلف ادوار اسی تگ و دو کے ابواب ہیں۔

اس حقیقت سے کوئی ہوش مند انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کو کائنات کے تمام جانداروں پر جو فضیلت حاصل رہی ہے وہ عقل و شعور اور فہم و ادراک کی بدولت ہے۔ انہیں خصوصیات کی بنا پر انسان اشرف المخلوقات ہے اور انہیں خصوصیات نے انسان میں وہ عملی صلاحیت پیدا کی جو طرح طرح کی مشکلات پر قابو پا لیتی ہے۔ جیسے جیسے انسان نے نامساعد حالات، ناسازگار ماحول اور اپنی راہ میں حائل ہونے والی دشواریوں کا تدارک کیا وہ متمدن اور مہذب ہوتا گیا۔

پروفیسر ٹوئن بی کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کے متمدن اور مہذب ہونے کا اصل سبب یہ نہیں کہ انسان دوسری مخلوق سے بہتر تھا بلکہ انتہائی مشکلات میں گھر کے اس نے تمام مشکلات کا مقابلہ جس بہادری، عزم و ہمت اور فہم و فراست سے کیا، اس نے انسان کو متمدن و مہذب بنا دیا۔ ابتداء میں انسانوں کی اقلیت مہذب بنی لیکن تہذیب کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ اس اقلیت نے انسانوں کی اکثریت کو تہذیب یافتہ بنا دیا۔ انسان نے قدرت کے عطا کردہ وسائل کو رفتہ رفتہ اپنے قبضے میں لیا۔ زندگی میں نظم و نسق قائم کیا۔ سب انسانوں کو اصولوں، روایتوں اور قانون کا احترام سکھایا۔ مہذب معاشرے قائم ہوئے، باہمی میل جول اور رواداری کی فضا پیدا ہوئی۔ اجتماعی اور انفرادی حیثیت میں انسان نے جان و مال کی حفاظت کا سلیقہ سیکھا۔ آگے چل کر انسانوں کے مختلف گروہوں نے جدا جدا خطوں میں حکومت کی داغ بیل ڈال کر گاؤں اور شہر آباد کئے۔ ریاستیں اور بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں۔

جب قدیم ترین زمانے میں انسان کی بربریت کا دور تھا تو اس کی جبلّی خصلتیں جانوروں سے زیادہ مختلف نہ تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانی دماغ میں بہتری اور ترقی کی صلاحیتیں رکھی تھیں۔ اسے سوچنے سمجھنے کی قوت عطا کی تھی۔ اس نے جانوروں جیسی جنگلی زندگی کے مقابلے میں اپنے دماغ کو استعمال کیا۔ یہی اس کی پہچان، یہی اس کی شناخت، اور یہی اس کا تشخص ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف ترین مقام عطا کیا اور بہترین مخلوق قرار دیا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا۔ یہ صورت اللہ کی فطرت ہے۔

مقصد تخلیق آدم

اس حقیقت کو اب ساری مہذب دنیا تسلیم کرتی ہے کہ حیات و کائنات کے نگار خانے میں انسان کی تخلیق بے مقصد نہیں۔ تاہم یہ سوال کہ آخر مقصدِ تخلیقِ آدم کیا تھا۔ اکثر ذہنِ انسانی میں اپنی بازگشت کرتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی تسلیم شدہ بات تو یہ ہے کہ مذہبی نقطۂ نظر سے حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر، سب سے پہلے انسان، اولین پیغمبر، خلیفہ الارض، مسجودِ ملائک اور صاحبِ علم و دانش تھے۔

حضرت امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ " آدم کو آدم اس لئے کہا گیا کہ اسے عقل و فہم دے کر تمام مخلوقات پر فضیلت دی گئی۔ بعض علماء اور حکماء کے نزدیک آدم کا لفظ 'ادیم' سے نکلا ہے۔ جس کے معنی سطحِ زمین کے ہیں۔ قرآن مجید میں تخلیقِ آدم کا ذکر کئی سورتوں میں آیا ہے اور بعض جگہوں پر آدم کی بجائے 'بشر' اور 'انسان' کی اصطلاحیں بھی استعمال ہوئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب ساری دنیا وجود میں آگئی، آسمان کی چھت قائم ہو چکی، زمین پر انواع و اقسام کی مخلوقات سانس لینے لگیں تو وقت آیا کہ ان تمام اشیاء سے استفادہ کرنے والا اور ان کو قابو میں لانے والا اس دنیا میں آئے جو اللہ تعالیٰ کی نیابت کے فرائض اور خلافت کا حق ادا کرے۔ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے " اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا کہ تو اس کو بناتا ہے جو اس زمین پر فساد کرے گا اور خون گرائے گا اور ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔" فرمایا " میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

بائبل (انجیل) میں تخلیقِ آدم کا قصہ کچھ اس طرح بیان ہوا ہے۔ " خداوند خدا نے زمین

پر پانی نہ برسایا تھا اور آدم نہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے اور زمین سے بخار اٹھتا تھا اور تمام زمین کو سیراب کرتا تھا اور خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دَم پھونکا، سو آدم جیتی جان ہوا" گویا بائیبل کی رُو سے تخلیقِ آدم کا مقصد محض کھیتی باڑی تھا۔ جبکہ قرآن مجید میں آدم کے اشرف المخلوقات" اور خلیفۃ الارض ہونے کا ذکر ہے۔ تاکہ وہ دیگر مخلوقات کو کام میں لائے اور اللہ کی نیابت بجا لائے۔

تمام مذاہبِ عالم عبادات کا نظام بھی رکھتے ہیں جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان کا رشتۂ عبودیت کسی اعلیٰ، ارفع اور ہمیشہ قائم و دائم رہنے والی ہستی سے ہے اور وہ ہستی قادرِ مطلق اور خالقِ حقیقی کی ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے " اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے اور وہی زبردست دانا ہے۔ زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے۔ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے مخفی بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دِنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ جو کام بھی تم کرتے ہو، اسے وہ دیکھ رہا ہے۔ وہی زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات، فیصلے کے لئے اس کی طرف رجوع کئے جاتے ہیں۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور دِلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے " (سورۃ الحدید۔ آیات ۱ تا ۶)

قرآنِ حکیم نے تخلیقِ کائنات اور تخلیقِ آدم کے بارے میں تمام سابقہ روایات کو یکسر باطل قرار نہیں دیا بلکہ ایسے نظریات جو عقل و فہم سے دور کا واسطہ بھی نہ رکھتے تھے ان کو باطل قرار دیا اور کچھ نظریے اصلاح کر کے اس طرح پیش کر دیئے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں تسلیم کئے جانے کے قابل ہو گئے۔ اگرچہ قرآنِ کریم میں تخلیقِ کائنات اور تخلیقِ آدم کے سلسلے میں کچھ تمثیلی قصے بھی بیان فرمائے گئے ہیں جیسا کہ حکایتِ آدم

سے واضح ہے۔ تاہم ان قصوں میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور وجودِ انسانی کی معنویت کے گہرے راز پنہاں ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے " ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی" (سورۃ بنی اسرائیل۔ ۷)

مذہبی نقطۂ نظر ہو یا سائنسی طریقۂ استدلال، اس حقیقت کو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہر انسان کی زندگی کوئی نہ کوئی مقصد رکھتی ہے جس کے لئے وہ اپنے عقل و فہم، شعور و ادراک اور عزم و ہمت کو استعمال کرتا ہے۔ گویا بامقصد کام قدیم ترین زمانے سے آج تک حیاتِ انسانی کا امتیازی وصف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بامقصد کام ہی کی بنا پر انسان کو فضیلت بخشی ہے۔ سائنس اس فضیلت کو انسان سے انسان تک محدود رکھتی ہے جبکہ الہامی مذاہب اس کا رشتہ خالقِ حقیقی سے جوڑتے ہیں۔ تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے آگے بڑھے اور اس کی نافرمانی نہ کرے۔ شیخ سعدیؒ نے اپنے چند بصیرت افروز اشعار میں فرمایا ہے کہ " بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان سب کام میں مصروف ہیں تاکہ اے انسان! تو بھی اپنی روزی محنت و مشقت سے کمائے اور غفلت شعاری سے نہ کھائے۔ کائنات کے تمام عناصر تیرے فرماں بردار بنے ہوئے ہیں۔ اور تیرے لئے طرح طرح کی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری نہ کرے" گویا حاصلِ کلام یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو اپنا معبودِ حقیقی اور حاکمِ مطلق جانتے، اسی کے حضور سجدۂ شکر بجا لائے اور خلقِ خدا کو اللہ کا کنبہ تسلیم کرتے ہوئے دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرے کہ اس کی اپنی بھلائی کے کاموں سے دوسرے انسانوں کی فلاح و بہبود کے راستے ہموار ہوں یہی مقصدِ تخلیقِ آدم تاریخ و تہذیب کے سفر میں چراغِ راہ کا کام دیتا رہا ہے اور رہتی دنیا تک عالمِ انسانیت کے سامنے بھی یہی مقصد رہے گا کہ انسان اپنے عمل سے خیرِ کثیر کے کیا کارنامے انجام دیتا ہے۔

مذاہبِ عالم

ہزاروں سال پہلے سے تہذیبِ انسانی کا جو سفر تغیر و تبدل اور ارتقاء کی صورتیں اختیار کرتا رہا ہے اس میں مذاہبِ عالم نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

جس طرح دنیا انسان کی تخلیق کے متعلق دو نظریات ہیں۔ اسی طرح مذہب کی ابتدا کے بارے میں بھی دو نظریے کار فرما رہے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان نے جب عناصرِ قدرت کی اہمیت کا اندازہ کیا تو بعض قوتوں کو اپنے وجود سے برتر جانا۔ پھر وہ ان قوتوں کی خوشنودی حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ سورج، ہوا، بارش، زمین کی زرخیزی، آگ اور اسی قسم کے عناصر صدیوں اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہے۔ انسان ان عناصر کو اپنے سے زیادہ طاقت ور اور با اختیار سمجھنے لگا۔

جہاں جہاں انسانی بستیاں آباد ہوتی گئیں وہاں اس نے عناصرِ قدرت کو قابو میں لانے کی اور ان سے فوائد حاصل کرنے کی تدابیر اختیار کیں۔ مصر میں دریائے نیل اور سورج، وادیٔ دجلہ و فرات میں ہوا اور بارش اور وادیٔ سندھ میں دھرتی ماتا کو زندگی کی بقا اور نشو و نما کے لئے اشد ضروری بلکہ لازمی خیال کیا گیا۔ ان عناصر کی عبادت کا رجحان پیدا ہوا۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دی جانے لگیں۔ ان کے بتوں کو فرضی قصوں اور دیو مالائی کہانیوں سے وابستہ کیا گیا۔ آگے چل کر مندروں کی تعمیر اور ان مندروں کے پروہتوں کی اہمیت نے بت پرستی کو بعض قدیم مذاہب کا لازمی جز بنا دیا۔ ان غیر الہامی مذاہب کی اشاعت پیغمبروں یا اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں نے نہیں کی بلکہ ضرورت کے تحت اور فتوحات کے بل بوتے پر یہ مذاہب پھیلتے رہے۔

اب تحقیقی تاریخ نے مذاہبِ عالم کے اس نظریئے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ حفریات میں جو قدیم ترین آثار ملتے ہیں ان میں ایک خدائے نادیدہ کی پرستش کے لئے عبادت گاہ کے

کھنڈرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک خدائے نادیدہ کا تصوّر اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان کا وجود۔ مظاہرِ قدرت کی پرستش کا تصوّر بعد کی صحرائی زندگی میں انسان کے ذہن کی ناپختگی سے پیدا ہوا۔ پھر جیسے جیسے ذہن انسانی بالغ اور پختہ ہوا، مذہبی تصوّر بھی بدلتا گیا۔

مذہب کی ابتدا کا دوسرا اور غالب نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں حضرت آدمؑ کے ساتھ مذہب بھی آیا۔ وہ مذہب جو خالق اور مخلوق کے تعلقات کی وضاحت کرتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ مختلف خطّوں، قوموں اور زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے مبعوث کئے گئے پیغمبر انسان کو خالقِ حقیقی کی عبادت کا درس دیتے رہے، زندگی کے اعلیٰ مقاصد بتلاتے رہے، اچھے اور برے اعمال کے لئے جزا اور سزا کے تصوّرات کو واضح کرتے رہے۔ یہی وہ پیغمبر تھے جنھوں نے الہامی مذاہب کی تبلیغ و تلقین کی۔ بتوں کو پوجنے سے روکا، ان کی ذہنی نشو ونما، روحانی ترقی اور نیکی و بدی کے تصورات میں ان کی رہبری کی۔ حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاء رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ تعالیٰ کے مبعوث کئے ہوئے نبیوں، رسولوں اور پیغمبروں نے انسانیت کو فلاح و بہبود کا سیدھا راستہ دکھایا۔ گناہوں سے نجات پانے کا سبق دیا اور اس طرح ان پیغمبروں نے انسان اور عالمِ انسانیت کا تعلق اخلاقی اور روحانی طور پر خالقِ کائنات سے قائم رکھنے میں زندگی بھر تمام امکانی کوششوں کو روا رکھا۔

نظری اور عملی طور پر مذاہبِ عالم کو الہامی اور غیر الہامی مذاہب کے صیغوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً الہامی مذاہب میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام خاص مذاہب ہیں جن کی تعلیمات کی روح تو ایک ہے مگر قالب الگ الگ ہیں۔ غیر الہامی مذاہب میں ہندومت، بودھ مت، جین مت اور کئی دوسرے مذاہب شامل ہیں۔

تمام الہامی اور غیر الہامی مذاہب کی ایک تقسیم اور بھی ہے، وہ یہ کہ ان میں کچھ مذاہب تبلیغی ہیں اور کچھ غیر تبلیغی۔ تبلیغی مذاہب میں بودھ مت، عیسائیت اور اسلام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ غیر تبلیغی مذاہب میں ہندومت اور یہودیت شامل ہیں۔ الہامی مذاہب کا اولین گہوارہ سامی النسل قوموں میں رہا اور غیر الہامی مذاہب زیادہ تر آریائی اور منگول نسلوں میں پروان چڑھے۔ ان سب باتوں کا ماحصل یہی ہے کہ مذہب ہر انسان کی گھٹّی میں پڑا ہے۔

انسانی عزم و ہمت

تمثیلی اور سبق آموز قصے کہانیاں سُننا بھی وظیفۂ تہذیب رہا ہے۔ سو ایک حکایت کچھ یوں ہے کہ ایک ببر شیر نے اپنے چھوٹے سے بچّے کو نصیحت کی "بیٹا! انسان سے ہوشیار رہنا یہ عجیب اور بڑی چیز ہے"۔

شیر کا بچّہ جیسے جیسے کچھ بڑا ہوتا گیا، اسے یہ جستجو رہی کہ انسان کو دیکھے۔ ایک دن وہ انسان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس میں کافی طاقت آچکی تھی۔ اور اپنی جوانی پر نازاں تھا۔ کچھار سے نکل کر چلا تو اتفاق سے ایک گھوڑے پر نظر پڑی۔ گھوڑے کی پھرتی اور خوبصورتی دیکھ کر سوچا شاید یہی انسان ہے۔ مگر جب گھوڑے سے پوچھا تو اس نے عاجزی سے کہا "میری کیا مجال جو انسان کے سامنے ٹھہر سکوں۔ چوبیس گھنٹے گلے میں رسّی پیروں میں بیڑیاں اور اصطبل کا جیل خانہ۔ جب انسان کا جی چاہتا ہے، میری پیٹھ پر چڑھ بیٹھتا ہے۔ میرے منہ میں لگام ڈال کر کوڑوں کی مار بھی لگاتا ہے"۔

شیر کا بچّہ سہم گیا۔ آگے بڑھا تو ایک اونٹ کو دیکھا۔ یقین آگیا کہ یہی انسان ہوگا لیکن جب دریافت کیا تو وہ بولا "میاں! میرے ڈیل ڈول پر نہ جاؤ۔ انسان نے تو میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ میں کیا مجھ سے سینکڑوں اس کے غلام ہیں۔ اس کا ذرا سا بچّہ بھی ہماری پیٹھوں پر منوں بوجھ لاد کر جانے کہاں کہاں لئے پھرتا ہے۔ اکثر اپنے پورے خاندان کو مجھ پر سوار کر دیتا ہے۔ روتا، بلبلاتا ہوں تو کوئی نہیں سُنتا"۔

شیر کا بچّہ اور بھی زیادہ ہراساں ہوا۔ آگے بڑھا تو ایک ہاتھی دکھائی دیا۔ اب اسے پکّا یقین ہوگیا کہ بھلا اس کے علاوہ انسان کیا ہوگا۔ مگر ہاتھی نے بھی وہی کچھ کہا جو گھوڑے اور اونٹ نے کہا تھا۔ آخر وہ مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا کہ جنگل میں ایک

بڑھئی کے بچے کو دیکھا جو بڑے شہتیر کو آرے سے چیر کر اس کی دراڑ میں کھونٹی گاڑتا جاتا تھا۔ شیر کے بچے نے اسے حقارت سے دیکھا اور انسان کے بارے میں پوچھا۔ جواب ملا کہ "میں انسان ہی کی اولاد ہوں" تب تو شیر کے بچے کو اور بھی غصہ آیا اور دھاڑتے ہوئے بولا "میرے باپ دادا ناحق تجھ سے ڈرتے رہے، میں ڈرنے والا نہیں، ابھی تیرا کام تمام کرتا ہوں"۔ بڑھئی کا بچہ خوفزدہ تو بہت ہوا مگر ہمت کر کے کہنے لگا: بیشک آپ مجھے ختم کر دیں مگر پہلے ذرا میرا یہ مشکل کام کر دیجئے کہ اپنا ہاتھ اس شہتیر میں ڈال کر اسے چیر ڈالیئے تاکہ آپ کی طاقت کا اندازہ ہو جائے۔ شیر کے بچے نے فاتحانہ انداز سے شگاف میں ہاتھ ڈالا اور ادھر بڑھئی کے بچے نے بڑی پھرتی سے کھونٹیاں نکال دیں۔ بس ان کھونٹیوں کا نکلنا تھا کہ شیر کے بچے کی ساری ہیکڑی دھری رہ گئی۔ چرے ہوئے شہتیر کے دونوں پٹ مل گئے۔ شیر صاحب اپنے دبے ہوئے زخمی ہاتھ پر چیختے رہے اور بڑھئی کا بچہ ہنستا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگ گیا۔

یہ تمثیلی حکایت شیر کے بچے اور بڑھئی کے بچے کی مثال کے ذریعے بیان کی گئی ہے وہ کہنے کو تو ایک دلچسپ حکایت ہے مگر غور کیا جائے تو اس میں انسان کی برتری کا پہلو نمایاں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز تو انسان کو تخلیق آدم کے ساتھ ہی عطا کر دیا تھا کہ اسے دنیا میں خلیفۃ الارض بنایا گیا مگر اس اعزاز کو برقرار رکھنے کے لئے انسان نے جو کارنامے انجام دیئے ان کا شمار مشکل ہے۔

کہتے ہیں کہ ہر ابھرنے والی قوت محض اس وقت ابھرتی ہے جب ماحول اس کے ابھرنے کے لئے حالات کو ناگزیر حد تک پیدا کر لے۔ یعنی اس کے علاوہ کوئی چارۂ نہ ہو کہ وہ خود بخود ابھر جائے۔ اس ماحول کو جو ایسی قوت کو ابھرنے کے لئے سازگار حالات پیدا کرتا ہے، چیلنج کا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک انسان کو جب مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو ان مشکلات کا حل تلاش کرنے کی کاوش انسانی جبلت میں محفوظ ہے۔ جس کا ثبوت شیر کے بچے کو قابو میں لانے کے لئے بڑھئی کے بچے نے

دیا۔ یہی انسانی کاوش ہزاروں سال سے انسانی فکر و عمل اور عزم و ہمت کو یہ سکھاتی رہی کہ چھوٹے بڑے چیلنجوں اور طرح طرح کی آزمائشوں سے گھبرانا انسان کا شیوہ نہیں۔ بقول شاعر ؎

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

شرط یہ ہے کہ انسان اپنے ارادے کو مضبوط رکھے۔ اس کی نیت میں فتور نہ آئے۔ وہ اپنی مثبت کوششوں میں کوئی کمی نہ آنے دے اور یہ بھی ضروری ہے کہ عہدِ ماضی اور عالمِ انسانیت کی ان روشن مثالوں کو اپنے سامنے رکھے جو انسانی برتری کو ظاہر کرتی ہیں۔ جو یہ بتاتی ہیں کہ انسان نے کس طرح تہذیب و تمدن کی ناہموار راہوں کو کشادہ شاہراہوں میں تبدیل کر دیا۔

تاریخ میں ان عظیم انسانوں کے تذکرے محفوظ ہیں جنہوں نے زندگی کی مہم کو سر کر کے وہ کارنامے انجام دیے جو انسان کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اگر انسانی کوششوں کے وہ شاندار نمونے تہذیبِ انسانی کے سامنے نہ ہوتے تو ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی شیر اور شیر کے بچے سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتی۔

قدیم تہذیبی گہوارے

تاریخ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انسانی تہذیب دریاؤں کی ان وادیوں میں پھلی پھولی جہاں پانی کی فراوانی تھی اور جہاں کی مٹی زرخیز تھی۔ پرانی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے زرخیز علاقوں میں اندازاً چار ہزار سال قبل مسیح میں وہ تہذیب عروج کو پہنچی جس کی ابتداء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پانچ ہزار سال پہلے ہو چکی تھی۔ دریائے دجلہ و فرات کی وادیاں جہاں بابلی اور سمیری تہذیبوں اور قوموں نے جنم لیا۔ دریائے نیل کی وادی جہاں مصری تہذیب پروان چڑھی۔ دریائے سندھ کی وادی جس نے موہن جودڑو جیسے تہذیبی مراکز پیدا کئے۔

ان تمام مذکورہ وادیوں میں انسانی تہذیب کا فروغ تقریباً ایک ہی عہد اور ایک ہی زمانے میں ہوا۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان وادیوں کی تہذیبوں میں کون سی تہذیب دوسری تہذیبوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ یہ بتانا بھی آسان نہیں کہ کس وادی میں خانہ بدوش انسانوں نے جنگلی اور وحشی زندگی کو خیرباد کہہ کر مہذب انسانوں کی زندگی کو اپنا شعار بنایا۔

تہذیبی سفر میں زمینوں کو آباد کرنا اور کاشت کاری کے ہنر سے واقف ہونا ایک اہم سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن کاشت کاری تہذیب کی معراج نہیں ہے۔ ہاں ایسا ضرور ہوا کہ زرخیز زمینوں اور دریاؤں کی وادیوں میں کاشت کاری کی وجہ سے اچھی خاصی آبادیاں وجود میں آئیں۔ ان آبادیوں نے چھوٹی بڑی بستیوں کی شکل اختیار کی پھر یہی بستیاں دیہاتوں اور شہروں کی صورت میں مختلف ناموں سے پکاری جانے لگیں۔

جو لوگ ان دیہاتوں اور شہروں میں آباد ہوئے انہوں نے اجتماعی زندگی کے

لئے کچھ اصول، کچھ ضابطے اور کچھ قانون بنائے۔ کنبوں اور قبیلوں کی باقاعدہ بنیاد پڑی۔ سرداروں اور سرپرستوں کو حکمرانوں کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ رفتہ رفتہ دریاؤں کی روانی جیسی رفتار انسانوں کے اس تہذیبی کارواں میں بھی آگئی جو ان دریاؤں کی وادیوں میں گامزن ہوا۔

ہر جیتے جاگتے انسان کی کچھ بنیادی احتیاجات ہوتی ہیں۔ مثلاً بھوک، پیاس، سرد گرم موسموں سے حفاظت کے لئے کپڑوں کا استعمال اور آرام کرنے کے لئے کوئی مناسب جگہ جسے ہم گھر کہتے ہیں۔

یہ احتیاجات ہم سب کی طرح قدیم ترین دور کے انسانوں کی بھی تھیں۔ جب انہوں نے برفانی دور میں قدم رکھا تھا۔ اس دور میں کپڑے نہیں تھے تو انہوں نے پیڑوں کی چھالوں اور پتوں سے اپنا تن ڈھانپا۔ پھر جانوروں کا شکار کر کے ان کا کچا گوشت کھانا اور کھال کو زیبِ تن کرنا۔ پہاڑی غاروں کو برف سے صاف کر کے اپنا بہت چھوٹا سا گھر بنانا۔ یہ سب ماقبل تاریخ کے قدیم ترین عہد کی باتیں ہیں۔ آگے چل کر انسان پہاڑی غاروں سے نکل کر نشیبی علاقوں میں آیا۔ آبشاروں اور دریاؤں کے جاری ہونے نے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کیا۔ درختوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑوں کے سہارے پانی کے بہاؤ میں تیرنے کا لطف اٹھایا۔ پھر وہ بڑے بڑے دریاؤں کی روانی کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ اس کے دماغ میں اختراع و ایجاد کے نئے نئے منصوبے آنے لگے۔ باقاعدہ کشتیاں بننے لگیں۔ دریاؤں کی تہوں میں اترنے اور غوطہ خوری کا ہنر بھی انسان نے سیکھ لیا۔ کہاں تو پہلے پہل وہ جنگلی جانوروں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا اور کہاں وہ تہذیبی سفر کی خوش کن منزل جب دریاؤں کی وادیوں میں دنیا کی عظیم تہذیبوں نے جنم لیا۔ مصر کی تہذیب، چین کی تہذیب، بابل و نینوا کی تہذیب، قدیم سندھ کی تہذیب اور کئی دوسری ہمعصر تہذیبیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کارسازِ حقیقی نے اپنے فضل و کرم سے انسانی زندگی کے پھلنے پھولنے کی بے پناہ گنجائشیں رکھی ہیں۔ قدیم انسان اگر ان گنجائشوں سے بہرہ مند نہ ہوتا تو تہذیب کا سفر کیسے جاری و ساری رہتا۔

وادیٔ نیل کی تہذیب

روایت ہے کہ صدیوں سے دریائے نیل کا پانی صرف تیس میل چوڑے علاقے کو زرخیز کرتا رہا تھا۔ مصر میں بارش برائے نام ہوتی تھی۔ اس لئے باقی ماندہ علاقے ریگستانی اور غیر آباد تھے۔ سال میں ایک مرتبہ دریائے نیل زبردست طغیانی سے دوچار ہوتا تھا جس سے زمین کی زرخیزی بڑھ جاتی تھی اور کچھ زائد علاقہ زیرِ کاشت آنے لگا تھا۔ ابتدا میں وہ وادی جسے دریائے نیل شاداب کر رہا تھا، ریگستانی علاقوں کے درمیان تھی۔ اس لئے کافی عرصے تک محفوظ رہی۔ جو قبیلے اور جو لوگ یہاں آکر آباد ہو گئے، وہ عرصۂ دراز تک امن و آشتی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ کاشتکاری کے ساتھ ساتھ ان انسانوں نے اپنے رہن سہن کو مستقل شکل دی اور تہذیب و تمدن کی بنیادیں رکھیں۔

تاریخ کے دھارے میں آگے بڑھتے ہوئے وادیٔ نیل کی آبادیاں، گاؤں اور قبیلوں میں منقسم ہوگئیں۔ قبائلی سرداروں کی اہمیت بڑھتی گئی۔ آبادی اور آبپاشی کے وسائل پر ان کا اختیار بڑھتا رہا اور پھر ان کی حیثیت حکمرانوں جیسی ہوگئی۔ ان کو اپنی اپنی مختصر فوجوں کے سپہ سالاروں کا درجہ بھی مل گیا تاکہ قبیلوں کی حفاظت کر سکیں۔ اس طرح آلاتِ زراعت کے ساتھ ساتھ جنگی آلات پر بھی توجہ ہوئی۔ ابتدا میں پتھروں کے آلات بنے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے اپنے مفادات کے لئے برسرِ پیکار بھی ہوا۔ فتوحات اور شکستوں کے سلسلے چلنے لگے اور پھر طاقت ور قبیلوں

نے ایک بڑی سلطنت کی بنیاد ڈال دی۔

یہ سلطنت وادئ نیل کے شمالی خطے میں قائم ہوئی اور زیریں مصر کی سلطنت کے نام سے موسوم ہوئی۔ ادھر جنوب میں بھی سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہوتی رہیں اور اس سلطنت کو بالائی مصر کی سلطنت کہا گیا۔

تاریخ میں زیریں مصر کی سلطنت کے صرف چھ بادشاہوں کے نام محفوظ ہیں اور اس لئے بڑے اہم ہیں کہ انسانی تاریخ میں بادشاہوں کے قدیم ترین نام یہی ہیں۔ بالائی مصر کی سلطنت کے کسی بھی بادشاہ کا نام تاریخ میں محفوظ نہیں۔ حالاں کہ سلطنت کئی صدیوں تک قائم رہی تھی۔

زیریں اور بالائی مصر کی سلطنتیں، دنیا کی قدیم ترین سلطنتیں مانی جاتی ہیں جو اب سے سات ہزار برس پہلے قائم ہوئی تھیں اور عرصہ دراز تک قائم رہی تھیں۔

یہ بات واضح ہے کہ وادئ نیل کی بالائی اور زیریں سلطنتیں قدیم ترین تھیں۔ ہر چند کہ دونوں سلطنتوں میں اس وقت مغائرت تھی۔ اکثر جنگیں بھی ہوتی تھیں اور خلق خدا کا بڑا خون بہتا تھا۔ دریائے نیل دونوں سلطنتوں کو سیراب کرتا تھا اس لئے آمد و رفت کے راستے بھی تھے۔ آخر کار زیریں مصر کے ایک طاقتور بادشاہ نے جس کا نام تاریخ میں محفوظ نہیں، بالائی مصر پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب پورے مصر پر ایک ہی بادشاہ کی حکومت ہو گئی، جس نے دنیا کی سب سے پہلی متحدہ حکومت قائم کی جو تقریباً آٹھ سو سال تک قائم رہی۔ اس سلطنت کا دارالسلطنت جس مقام کو بنایا گیا وہ ہیلو پولیس (Heliopolis) یعنی سورج کا شہر کہلاتا تھا۔

یہ شہر دونوں سلطنتوں کے وسط میں واقع تھا۔ اس لئے مصر کا سب سے با اثر اور متبرک شہر مانا جاتا رہا۔ دونوں سلطنتوں کے اتحاد سے پہلے کاشت کاری کا کام ہاتھوں سے لیا جاتا تھا۔ پھر ہل کا استعمال جانوروں کی مدد سے لیا جانے لگا۔ زمین کا زیادہ رقبہ زیرِ کاشت آ گیا اور پیداوار میں اضافہ ہوا۔ آبپاشی کے وسائل

بڑھے اور دریائے نیل سے نہریں نکالی گئیں۔ مصر دنیا کا سب سے پہلا زراعتی ملک بنا۔ کاشت کاروں پر ٹیکس لگایا گیا اور غلہ دوسرے ملکوں کو برآمد کیا جانے لگا۔

مصر کی دونوں سلطنتوں کا پہلا اتحاد دیرپا ثابت نہ ہوا۔ کیونکہ بالائی مصر کے ایک طاقتور سردار نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ پھر دوسرے اتحاد کا آغاز ہوا۔ مصری تہذیب کی بنیادیں تو پہلے ہی مضبوط ہو چکی تھیں۔ دوسرے اتحاد کی برکت سے دھاتوں کی دریافت اور ان کے استعمال میں بہت ترقی ہوئی۔ کانوں کی کھدائی پر توجہ دی گئی۔

جس طاقتور سردار نے متحدہ مصری سلطنت قائم کی تھی اس کا نام تاریخ میں مینز (Menes) بتایا جاتا ہے۔ اس نے اور اس کے جانشینوں نے کوہستانی خطوں میں اپنی موجودگی کے ایسے کتبے کندہ کرائے جن کو تاریخ کے قدیم ترین کتبوں کی حیثیت حاصل ہے۔

ابتدا میں مصر کے بادشاہوں نے اپنے مقبرے دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں سے بنوائے۔ لیکن اب سے پانچ ہزار سال پہلے کے بادشاہوں نے اپنے مقبروں کے لئے پتھر اور چونے کو استعمال کرایا۔ اس طرح عمارت سازی کے نئے دور کا آغاز ہوا جو اہرامِ مصر کی صورت میں عروج پر پہنچا۔

اہرام مصر کا زمانہ

مصر وادیٔ نیل کا قدیم ترین تہذیبی خطہ رہا ہے جسے ساری دنیا میں تہذیبی اولیت بھی حاصل رہی ہے۔ وادیٔ نیل کے قدیم ترین تہذیبی سفر میں پہلے تو قدیم بادشاہت کا دور آیا۔ پھر اسی دور کے تسلسل میں اب سے ساڑھے چار ہزار برس پہلے اس عہد کا بول بالا ہوا جسے اہرام مصر کا زمانہ کہا جاتا ہے اور اس زمانے کے ہر حکمراں کو فرعون مصر کہا جاتا ہے۔ اس طرح پہلا فرعون مینز (Menes) کے نام سے موسوم ہوا تھا۔ جس کے بعد بہت سے فراعین مصر نے تقریباً تین ہزار سال تک حکومت کی۔

قدیم بادشاہت کے دور میں مصر کا دارالسلطنت میمفس (Memphis) رہا جو بالائی مصر میں دریائے نیل کے کنارے واقع تھا۔ اس دور کا مصر ایک مالدار، خوشحال اور ترقی یافتہ ملک تھا۔ اس زمانے کے بنے ہوئے اہرام مصر اپنے فرعونوں کی طاقت اور ملک کی خوش حالی کا ثبوت ہیں۔

فراعین مصر عالیشان محلوں میں رہتے تھے۔ مرنے کے بعد بھی ان کی شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لئے بہترین مقبرے بنائے گئے اور ان کی لاشوں کو ممی بنا کر محفوظ کیا جانے لگا۔ فراعین کا طریقۂ حکومت یہ تھا کہ ملک کا انتظام سرکاری افسروں کے ذمّہ تھا، جن کا تقرر ہر فرعون خود کرتا تھا۔ سرکاری افسر دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک تو وہ جو ہر علاقے کے مقامی باشندوں میں سے لئے جاتے تھے، دوسرے مرکزی افسران تھے جو دارالسلطنت میں رہتے تھے۔ مقامی افسران اناج اور دیگر اشیا کی صورت میں ٹیکس وصول کرتے تھے جسے دارالسلطنت روانہ کر دیا جاتا تھا۔ ٹیکس دینے والوں کا باقاعدہ حساب کتاب

رکھا جاتا تھا۔ مرکزی افسران اناج اور اشیا کو بڑے بڑے گوداموں میں محفوظ کر تے تھے۔ مرکزی دفتر میں صدہا افراد کا عملہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی بڑا نظم وضبط تھا جسے بعد کے زمانے میں رومن امپائر میں اپنایا گیا۔

فراعین کے دور میں صنعت وحرفت، علوم وفنون اور طرح طرح کی ہنر مندیوں کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ پارچہ بافی، کاغذ سازی، مرصع کاری، جہاز رانی، جہاز سازی، زیورات بنانے کی صنعت اور لکڑی کا عمدہ فرنیچر بنانے کا ہنر عروج پر پہنچا۔ یہی نہیں بلکہ مصر کی ہمہ جہتی ترقی اور خوشحالی باقی ماندہ دنیا کے لئے ایک مثال بن گئی۔

قدیم مصر میں زمین کو دیوتاؤں کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ فراعین کی حکمرانی کے دور میں ہر فرعون دیوتاؤں کا نمائندہ تسلیم کیا جانے لگا۔ مصریوں نے دیوتاؤں کی مختلف شکلیں اور تصویریں بنائی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ زندگی اور موت دینے والے دیوتا ہی ہیں۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی پانے کا تصوّر بھی سب سے پہلے اہلِ مصر ہی کے ذہن میں آیا۔ ان کے مذہبی تصورات بڑے دلچسپ تھے۔ انہوں نے حیات بعدالموت کا عقیدہ اپنایا۔ لیکن اس سلسلے میں انہوں نے بڑی جدتیں بھی پیدا کیں۔ وہ اپنے مقبروں میں زمین دوز تہہ خانے بنانے لگے جس میں مردہ جسم کو ممی بنا کر رکھا جانے لگا۔ تہہ خانے کے اوپر ایک کمرہ ہوتا تھا جسے نذر خانہ کہتے تھے۔ اس کمرے میں مرنے والے کے عزیز و اقارب ضروریاتِ زندگی کی کھانے پینے کی چیزیں رکھ جاتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ مرنے والا اپنی تمام ضرورتیں زندہ انسانوں کی طرح پوری کرتا ہے۔ اہرام سے ملے ہوئے عبادت خانے بھی بنائے جاتے تھے جن کی دیواروں پر رنگین تصویریں بنائی جاتیں۔ ان تصویروں میں بادشاہوں اور سرداروں کی زندگی کا عکس اور ان کے کارناموں کی منظر کشی کی جاتی تھی۔ یہ تصویریں فنِ مصوری اور سنگ تراشی کا شاہکار ہیں۔

آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اہرامِ مصر کا زمانہ بڑی کشش رکھتا ہے۔ کچھ تاریخ نویسوں کا خیال ہے کہ اہرامِ مصر کی تعمیر میں ظلم و تشدد کو روا رکھا گیا۔ غلاموں اور مجرموں سے جبری مشقت کرائی گئی۔ ہزاروں فیٹ بلند مقبروں کی تعمیر میں

لاکھوں انسانوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ابتدا میں تو بادشاہوں کے معمولی مقبرے بنائے گئے مگر جیسے جیسے عمارت سازی کا فن ترقی کرتا گیا، مقبروں کی عمارتیں عالیشان ہوتی گئیں اور ایک صدی کے اندر اتنی ترقی ہوئی کہ خوفو (Khufu) نامی فرعون کا جو اہرام تعمیر کیا گیا، اس کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ سطح زمین پر اس اہرام کی چوڑائی ۷۵۶ فٹ ہے اور اس کی اونچائی ۵۰۰ فٹ ہے۔ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ مزدوروں نے بیس سال تک کام کیا۔ جب یہ اہرام مکمل ہوا تو غزہ کا اہرام اور ابوالہول کی تعمیر ہوئی جو اپنے دور کے بہت ہی طاقتور حکمراں تھے اور عوام ان کا نام لینے کی بجائے انہیں صرف 'فرعون' کہتے تھے۔

مصری زبان میں فرعون کے معنی عظیم الشان محل کے ہیں۔ چوں کہ وہ مصری حکمران بہت ہی شاندار محلوں میں رہتے تھے، اس لئے یہ نام ان کے شایانِ شان سمجھا جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ مصر پر یونان کے بادشاہ سکندرِ اعظم کے حملے تک بادشاہ مصر کا لقب فرعون ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشموں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ بناؤ اور بگاڑ سب اس کی قدرتِ کاملہ کے کھیل ہیں۔ تاہم تاریخ میں فراعینِ مصر اور اہرام مصر کے تذکرے جہاں ایک طرف ہزاروں سال پرانی تہذیبی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں وہاں دوسری جانب ہر دور کے انسانوں کے لئے عبرت آموزی اور بصیرت خیزی کا ذریعہ بھی بنے ہیں۔

مصری تہذیب کا زمانۂ وسطیٰ

فراعین اور اہرام مصر کے بعد مصری تہذیب کی قیادت شمال سے جنوب میں منتقل ہو گئی۔ اس زمانے میں شاہی افسروں کی طاقت اتنی بڑھی کہ بادشاہوں کا اقتدار تقریباً ختم ہو گیا۔ مصر کو مختلف ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ان کا انتظام جاگیرداروں کے سپرد تھا۔ بادشاہت کے کمزور ہوتے ہی ان جاگیرداروں نے اپنی قوت بڑھانی شروع کی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اپنے ضلعوں کے خود مختار حکمراں بن بیٹھے۔ آپس کی خانہ جنگی نے ملک کی خوشحالی پر بہت برا اثر ڈالا۔ ملک میں وہ خرابیاں پیدا ہو گئیں جو جاگیردارانہ نظام کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس زمانے کے حالات و واقعات تاریخ میں زیادہ واضح نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ زمانہ انتشار، بدامنی اور افراتفری کا تھا، لیکن پھر بھی مصر کی قدیم کتابوں سے اس زمانے کے حالات کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ یہ قدیم کتابیں اسی زمانے میں لکھی گئی تھیں۔

قدیم مصری سلطنت اور زمانۂ وسطیٰ کے جاگیردارانہ اقتدار میں واضح فرق یہ رہا کہ قدیم زمانے میں مصر کی فوجی طاقت بہت بڑھ گئی تھی اور عمارت سازی کا فن انتہائی عروج پر پہنچ گیا تھا۔ جبکہ زمانۂ وسطیٰ میں لوگوں کی توجہ ان علوم کی طرف ہو گئی تھی جو انسانی اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

مصری تہذیب کے زمانۂ وسطیٰ میں ڈرامہ نگاری اور شاعری کو بہت فروغ ملا۔ سب سے اہم ڈرامہ عوسیرس (OSIRIS) دیوتا کے متعلق لکھا گیا جس میں زندگی، موت، دفن اور دوبارہ زندگی پانے کی عکاسی کی گئی تھی۔ سالانہ تقریبات پر یہ ڈرامہ اسٹیج کیا

جاتا تھا۔ ڈرامے کی یہ کتاب ناپید ہوگئی لیکن اس کا ذکر مصری تاریخوں میں ملتا ہے۔ اس زمانے کی بعض کتابیں اور اس کے کچھ صفحات محفوظ ہیں۔ ایک کتاب ایسی ہے جس میں مکالمے کے علاوہ تصویریں بھی بنی ہیں اور ان تصویروں سے اداکاری کی ہدایات ملتی ہیں۔ غالباً یہ دنیا کی سب سے قدیم باتصویر کتاب ہے۔ پیپرس کے ایسے رول بھی دستیاب ہوئے ہیں جن میں گیت اور نظمیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس زمانے میں مصر فن جراحی، جیومیٹری، علم ہندسہ، انجینئرنگ اور جغرافیہ کے علوم میں اتنی ترقی کر گیا تھا کہ ان علوم پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں سے کچھ کتابیں اب بھی دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔ زمانۂ وسطیٰ کے اہل مصر نے جہاز رانی کے شوق کو دوبالا کیا اور ان کی رسائی بحیرۂ روم کے مختلف جزیروں تک ہوگئی۔

مصر کے زمانۂ وسطیٰ میں جہاں مختلف علوم و فنون اور باغبانی، زراعت کو فروغ حاصل ہوا، وہاں اہل مصر کے مذہبی عقائد میں بھی کچھ نئے عوامل کا اضافہ ہوا۔ مثلاً یہ خیال کہ اگر دنیا میں نیک زندگی بسر کی جائے تو اس کا صلہ مرنے کے بعد دوسری دنیا میں اچھا ملے گا۔ علاوہ ازیں اس دنیائے فانی سے ماورا اگلی دنیا میں خداوند عوسیرس کو سزا اور جزا کا مالک بھی قرار دیا گیا ہے اس لئے عوسیرس دیوتا کی عبادت عہد وسطیٰ میں بہت بڑھ گئی۔ "بیدوس" کے مقام پر عوسیرس کی قبر مانی گئی اور ہر دین دار مصری کی انتہائی عزیز تمنا یہ ہوگئی کہ وہ ایک بار خداوند عوسیرس کے مزار کی زیارت کر سکے۔ مگر ان تمام خصوصیات کے باوجود مصر کی مرکزی حکومت کمزور ہوتی گئی۔ جاگیردارانہ نظام نے عوام کو غربت میں جکڑ دیا تھا۔ اس لئے ان کی وفاداریاں جو پہلے اپنے حکمرانوں کے ساتھ زیادہ تھیں وہ دم توڑنے لگیں۔ فوجی لحاظ سے بھی مصر اس قابل نہ رہا کہ بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام کی جانب سے جب (Hyksos) ہائیکسوس نے مصر پر حملہ کیا تو مصری حکومت کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور ایک ایشیائی قوم اہل مصر پر حکمراں ہوگئی۔

ہائیکسوس نے جب حملہ کیا تھا تو اس وقت مصر پر چودھویں خاندانِ فراعین کی حکومت تھی۔ اس طرح فراعینِ مصر کا اقتدار کچھ صدیوں کے لئے ختم ہوگیا۔ شام کے حملہ آوروں کی طاقت گھوڑ سوار فوج پر مشتمل تھی۔ جبکہ مصریوں کی فوج پیدل سپاہیوں کی تعداد پر مشتمل تھی۔ اسی حملے کے بعد مصر میں گھوڑوں کا استعمال شروع ہوا۔

نئے حملہ آور پہلے شمالی مصر پر قابض ہوئے پھر انہوں نے جنوبی مصر پر بھی اپنا تسلط قائم کیا۔ غالباً ان ہی شامیوں کے ساتھ بنی اسرائیل بھی مصر میں داخل ہوئے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نئے حملہ آور حکمرانوں نے بھی فراعین کا لقب اختیار کیا۔

تاریخی شواہد یہ بتاتے ہیں کہ ان ہی شامی بادشاہوں یا نئے فرعونوں میں وہ فرعون بھی تھا جس نے بنی اسرائیل پر ظلم ڈھائے تھے اور جس کے مقابلے میں حضرت موسیٰؑ نے کلمۂ حق بلند کیا تھا۔

مصر میں ہائیکسوس کی حکومت ۱۵۸۰ ق م تک قائم رہی۔ پھر مصر کی ایک ریاست تھیبس (Thebes) کے حکمران نے بغاوت کرکے شامی حکمرانوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد مصر میں شہنشاہیت کا دور شروع ہوا جو تقریباً ساڑھے چار سو سال تک قائم رہا۔

مصری تہذیب کا دورِ شہنشاہیت

اہلِ مصر نے اپنی باہمی رنجشوں اور جاگیردارانہ خانہ جنگی کے نتیجے میں وقتی طور پر غیر مصریوں یعنی شام کے ہائیکسوس خاندان کی حکمرانی قبول تو کرلی تھی مگر ۱۵۸۰ ق م میں تھیبس (Thebes) کے حکمراں عاحمس اوّل (Aahmes-I) نے اپنی فوجی طاقت کو بڑھا کر غیر مصریوں کی حکومت سے آزادی حاصل کرلی تھی۔ اس طرح مصر پر اٹھارویں خاندانِ فراعین کی حکومت قائم ہوگئی۔

سابقہ غیر مصری حکمرانوں کے دور میں اہلِ مصر گھوڑوں اور رتھوں کے استعمال سے واقف ہو چکے تھے اور انہی جدید خطوط پر فوجی طاقت بڑھانے کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اس لئے نئے دورِ حکومت میں انہوں نے منظّم، مربوط اور مستقل فوج قائم کی جس کی مدد سے مصر میں نہ صرف ایک مستحکم حکومت قائم ہوئی بلکہ مصریوں نے دیگر ممالک میں بھی فتوحات پائیں اور ان کی سلطنت میں فلسطین و شام کے علاقے بھی شامل ہوگئے جو مصری شہنشاہیت کی علامت بن گئے۔

مصر کی شہنشاہیت کا دارالحکومت تھیبس دنیا کے بہت ہی مالدار اور خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہونے لگا اور کرناک (Karnak) کے مندر کی تعمیر نے اس کی خوبصورتی اور دولت مندی میں کچھ اور اضافہ کردیا۔ یہ مندر مصری تہذیب کے زمانۂ وسطیٰ کے دورِ جاگیرداری میں بننا شروع ہوا تھا مگر اس کی تکمیل شہنشاہیت کے دور میں ہوئی۔

دراصل کرناک کے مندر کو سورج دیوتا 'امن رَاع' کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس کی دیواروں پر فنِ مصوری کے اعلیٰ نمونے تھے۔ مندر کے اندر رکھے ہوئے بت،

اس کی حفاظت کرتے ہوئے ابوالہول اور سب سے بڑھ کر ستونوں پر کھڑا ہوا بہت بڑا ہال لائقِ دید تھے۔ ستونوں کا ہال، ۱۷۰ فٹ لمبا اور ۳۳۸ فٹ چوڑا تھا اس میں ۱۳۶ ستون تھے۔ یہ شہنشاہیت کے دور کی بہت ہی عالی شان یادگار تھی جس کی دیواروں پر شہنشاہوں نے اپنے کارنامے بھی کندہ کرائے تھے جن سے اس دور کے تاریخی حالات کا علم ہوتا ہے۔

اس دور میں شاہانِ مصر کے سامنے صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ ان علاقوں کو فتح کیا جائے جہاں سے مصر پر حملے کا کوئی بھی خدشہ ہو سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے بھاری فوج تیار کی گئی۔ بحری طاقت میں اضافہ ہوا اور ہر طرح کا جنگی ساز و سامان جمع کیا گیا۔ شاہانِ مصر بہادری میں خود بھی کسی سے کم نہ تھے۔ وہ خود ہی فوجوں کے سپہ سالار بھی تھے۔ ان کے خیال میں فتوحات کا سلسلہ شہنشاہیت کو قائم رکھنے کے لئے بے حد ضروری تھا۔ انھوں نے دریائے نیل کے جنوبی علاقوں کی فتوحات کے بعد لیبیا، فلسطین اور شام کو بھی مصری سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس طرح دریائے فرات تک مصریوں کا قبضہ ہو گیا۔ آگے چل کر مصری شہنشاہوں نے 'شہنشاہِ فرات و نیل' کا لقب اختیار کیا۔

مصری شہنشاہیت کے دورِ عروج میں وہ موڑ بھی آیا جب دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ملکہ نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ اس ملکہ کا نام حاطشپسٹ تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں تلواروں کی جھنکاروں نہیں بلکہ امن و آشتی کے نغموں کی گونج نے مصریوں کے دلوں کو فتح کیا۔ وہ مصری شہنشاہ توطمس اول کی بیٹی تھی۔ اس نے توطمس سوم سے شادی کی تھی لیکن ملکہ کی زندگی میں شہنشاہ کی اہمیت بالکل ختم ہو گئی تھی اور حکومت کا تمام انتظام ملکہ نے سنبھال لیا۔ وہ مردانہ لباس پہنتی تھی اس میں مردانہ رجحانات بھی زیادہ تھے۔ لیکن چونکہ اس کے دورِ حکومت میں فتوحات کا سلسلہ بالکل ختم ہو چکا تھا اس لئے اس کی دلچسپی مندروں کی تعمیر اور ملکی تجارت کو فروغ دینے پر مرکوز ہو گئی۔ شاہی خزانے تو پہلے ہی خوب بھرے ہوئے تھے ملکہ نے ان خزانوں کو اور زیادہ بھر دیا۔ ملک میں ہر طرف خوشحالی کا

دور دورہ ہو گیا۔ کرناک کے مندر میں "ستونوں کا ہال" اسی ملکہ نے بنوایا تھا۔ یہی نہیں بلکہ علوم و فنون اور ہر طرح کی ہنر مندی میں اس کا دورِ حکومت پیش پیش رہا۔ اس ملکہ نے تقریباً ۲۰ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۵۰۱ ق م میں وفات پائی اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی تب اس کے شوہر نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور فتوحات پر بھرپور توجہ دی جس کی بنا پر اس کی ہیبت عوام کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ وہ بڑا طاقتور فرعون تھا۔ اس نے اپنی ملکہ کے دورِ حکومت کی خوشگوار یادیں عوام کے دلوں سے مٹانے کے لئے کرناک کے مندر کی کچھ لاٹیں بھی مسمار کرا دیں۔ جس خوبصورت اور سب سے بلند لاٹ پر ملکہ کے کارنامے کندہ تھے اس کے سامنے ایک اونچی دیوار کھڑی کرا دی تاکہ وہ یادگار کارنامے لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں۔ مندر کی دیواروں پر اس نے اپنے کارنامے کندہ کرائے جن سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف ممالک پر اس نے سترہ حملے کئے اور سب میں فتح پائی۔ بابل کے بادشاہ بھی اس سے خائف رہتے تھے۔ وہ دولت کا بھی بہت لالچی تھا۔ لیکن مندروں کی تعمیر پر بے دریغ بھاری رقوم صرف کرتا تھا۔ اس کی ممی کے کفن پر یہ الفاظ لکھے ہیں "میرا وجود ہمیشہ باقی رہے گا"

توطمس سوم کے جانشین بھی شاہانِ مصر اور فرعون کہلائے۔ مگر ان میں خاطر خواہ اہلیت نہ تھی البتہ جب اس کے جانشینوں میں ایک شہنشاہ نے اخناتون (Aknaton) کا لقب اختیار کر کے حکومت سنبھالی تو علوم و فنون اور معاشرے کی اصلاح پر زیادہ توجہ دی۔ وہ فلسفی اور مصلح فرعون تھا۔ اس نے ایک خالق اور معبود کی عبادت پر زور دیا۔ اس کی تخت نشینی کے وقت مصر میں دو ہزار سے زیادہ بتوں کو پوجا جاتا تھا۔ مگر اس نے صرف سورج کو کائنات کا خالق و مالک قرار دیا۔ اسے جنگ و جدل سے سخت نفرت تھی۔

زوالِ مصر کی کہانی

قدیم مصر کے عروج و زوال کی کہانی تقریباً تین ہزار برسوں پر محیط ہے۔ فراعینِ کے اٹھارویں خاندان کا وہ شہنشاہ جو آخری تاجدار ثابت ہوا، اس کا نام اخناطون تھا۔ وہ فطری طور پر جابر وظالم نہ تھا بلکہ اس شخصیت ایک فلاسفر اور ریفارمر کی تھی۔ اس نے جنگ و جدل سے نفرت کی۔ فتوحات سے گریز کرتا رہا۔ ہزاروں بتوں کی پرستش سے الگ ہٹا کر اپنی رعایا کو ایک خالق و مالک کی عبادت پر مرکوز کیا۔ یہ بات الگ ہے کہ اس زمانے تک وہ عقیدۂ توحید فکر و احساس کی دولت نہ بنا تھا جو دینِ ابراہیمی اور پھر اسلام نے عالم انسانیت کو دیا۔ بہر کیف اخناطون نے خدائے واحد کا مظہر سورج دیوتا کو بنایا اور اسی کی عبادت پر زور دیا۔ وہ صلح پسند اور شریف حکمراں تھا لیکن اس کی یہ اعلیٰ انسانی خوبیاں مصری شہنشاہیت کے زوال کا سبب بنیں۔ آس پاس کے طاقتور حکمراں مصر پر حملہ آور ہوئے اور سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی۔ پھر اس کے جانشین بھی حکومت نہ سنبھال سکے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے مصری اقوام کو از سرِ نو ہزاروں دیوتاؤں کی پرستش پر مائل کر دیا۔

اخناطون کی موت کے بعد فراعین کے اٹھارویں خاندان کی حکومت ختم ہو گئی۔ اور فراعین کے انیسویں خاندان نے مصر پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ انیسویں خاندان کے دوسرے بادشاہ سیتی (Sethi) نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور مصر کی شہنشاہیت کو دوبارہ زندگی بخشی۔ اس نے عبرانیوں کو شکست دی اور فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ پھر شام بھی فتح ہوا اور سلطنت وسیع ہو گئی۔ اس کے جانشین ریمیس دوم (Remes II) نے ایشیا پر حملہ کیا۔ ایشیائی قوموں نے مصری فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی لیکن فیصلہ کن ثابت

نہ ہو سکی۔ پھر بھی ریمیس دوم نے اسے اپنی فتح قرار دیا۔ جنگ کی تصویریں مندروں کی دیواروں پر بنوائیں اور اپنی بہادری کے کارناموں کو لاٹوں پر کندہ کرایا۔ دوسرے بادشاہوں کی طرح اسے بھی مندر اور عالی شان عمارتیں بنوانے کا شوق تھا۔ ایک کوہستانی مقام پر پہاڑ کو کٹوا کر وہاں عظیم الشان مندر بنوایا جس میں بتوں کے علاوہ مندر کے باہر اپنے بھی چار مجسمے بنوائے جو ساٹھ ساٹھ فٹ بلند تھے۔ اس طرح دیوتاؤں کی عظمت کے ساتھ ساتھ اپنی عظمت بھی قائم کرنے کی کوشش کی مگر یہ عظمت اسی کے ساتھ ہی دفن ہو گئی کیونکہ اس کے بعد سلطنت کو زوال کے دن دیکھنے نصیب ہوئے۔ اس کے جانشین بہت کمزور ثابت ہوئے۔ مسلسل جنگوں نے مصر میں تباہی کا بازار گرم کر دیا۔ ایشیا اور یورپ کی زور آور قومیں مصر پر حملہ آور ہونے لگیں۔ ملک کے اندر بھی زور و شور سے خانہ جنگی کا دور دورہ ہو گیا۔

تاریخی تناظر میں انسانی تہذیبوں کا مطالعہ ریل گاڑی میں سفر کرنے جیسا ہے۔ کیونکہ تاریخی حالات و واقعات ہمارے سامنے ٹیلی گراف کے کھمبوں کی طرح گزرتے جاتے ہیں۔ جو کھمبے ہماری نظروں کے عین سامنے ہوتے ہیں، ان کے درمیان تو ہمیں ایک فاصلہ نظر آتا ہے۔ لیکن جب ہم گزرتے ہوئے پچھلے کھمبوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو وہ سب آپس میں ملے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کا درمیانی فاصلہ دکھائی نہیں دیتا۔ کچھ یہی کیفیت مصری تہذیب کے عروج و زوال کی کہانی میں نظر آتی ہے۔

بے شک اب ان تہذیبوں کے نام و نشاں قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ لیکن یہ قصۂ پارینہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ کس طرح خانہ بدوش قبائل نے وادیٔ نیل میں سکونت اختیار کی تھی۔ پھر مصری تہذیب کے کیسے کیسے خدوخال نمایاں ہوئے تھے۔ سنگ تراشی، فنِ تعمیر، مجسمہ سازی اور اسی قسم کی دوسری ہنرمندیوں میں اہلِ مصر نے کیا مقام پیدا کیا۔ کس طرح دوسرے ملکوں سے تجارتی تعلقات بڑھائے۔ کس طرح فراعینِ مصر نے اہرامِ مصر اور ابوالہول جیسی پرشکوہ تعمیرات میں اپنا نام روشن کیا۔ ان کی یہ یادگاریں آج بھی عجائباتِ عالم میں شمار ہوتی ہیں۔ ان

کے مقبروں سے حنوط شدہ جو لاشیں برآمد کی گئی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ قدیم مصریوں کو کیمیا یعنی کیمسٹری اور انسانی جسم کی نوعیت کے متعلق حیرت انگیز طور پر بڑی معلومات حاصل تھیں۔

شہنشاہیت، جس کا رواج بعد میں دوسرے ملکوں میں ہوا۔ اس کی داغ بیل بھی سب سے پہلے مصر میں ہی پڑی۔ کافی عرصے تک مصر کے مقابلے میں کوئی اور طاقت اپنا رنگ نہ جما سکی۔ لیکن عروج کے بعد زوال کا آنا بھی کچھ لازمی سا ہے۔ زوال کے اسباب تو کئی ہو سکتے ہیں۔ تاہم مصری شہنشاہیت کا زوال مسلسل جنگوں کے سبب ہوا۔ مذہبی اختلافات نے بھی سلطنت کو کمزور کیا اور یکے بعد دیگرے کئی علاقے دوسروں کے قبضے میں چلے گئے۔ مرکزیت کا استحکام باقی نہ رہا۔ خانہ جنگی، بغاوتیں، بیرونی مداخلت اور سیاسی و معاشی انتشار زوال آمادہ مصری شہنشاہیت کو اور زیادہ تباہی کی جانب ڈھکیلتا رہا۔ مصر پر ایشیائی اور یورپی ملکوں کی طرف سے حملے ہونے لگے۔ درمیان میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ مصر نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر یہ کوشش افراد کی تھی، پوری قوم کی نہ تھی اس لئے کامیاب نہ ہونے پائی اور تقریباً اس کا خاتمہ ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور تکوینی قوانین کو کون بدل سکتا ہے ؎

لاکھ کوشش کرے انساں تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

دجلہ و فرات کی وادی میں

دجلہ وفرات کی وادی کو انسان کے تہذیبی سفر کے دوران قدیم تاریخ میں تقریباً وہی حیثیت حاصل رہی ہے جو وادیٔ نیل کو حاصل رہی ہے۔ پانچ چھ ہزار سال قبل مسیح میں یہ وادی اتنی زرخیز تھی کہ عرب اور آرمینہ کے خانہ بدوش قبائل ادھر کا رُخ کرنے لگے تاکہ اس زرخیز وادی میں وہ مستقل سکونت اختیار کریں۔

جغرافیائی لحاظ سے دجلہ وفرات آرمینیہ کے برفیلے پہاڑوں سے نکل کر کبھی ایک دوسرے کے قریب اور کبھی دور ہو کر جنوب کی طرف بہتے ہیں۔ موجودہ بغداد کے قریب یہ دونوں دریا بہت قریب آجاتے ہیں اور اٹھارہ میل متوازی بہتے رہنے کے بعد پھر ایک دوسرے سے ہٹ کر بہتے ہیں۔ پھر ایک سو اسی میل کے بعد دونوں دریا آپس میں مل کر خلیج فارس میں گر جاتے ہیں۔ دجلہ وفرات کی یہ وادی میسوپوٹامیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ قدیم ترین زمانے میں یہ وادی ان تہذیبوں کا گہوارہ رہ چکی ہے جو مصر، سندھ اور ایران کی تہذیبوں کی ہمعصر تہذیبیں کہی جاتی ہیں۔ وہ تہذیبیں جنہوں نے ایشیاء میں انسانوں کو زندگی کے آداب سے رُوشناس کرایا تھا اور متمدن زندگی کی بنیاد ڈالی تھی۔

نیل کی وادی جیسی دجلہ وفرات کی وادی بھی کاشت کاری کے لئے نہایت موزوں تھی اور غالباً سب سے پہلے اسی وادی میں اناج کی کاشت ہوئی تھی۔ کیوں کہ خودرو اناج اس وادی میں کثرت سے پیدا ہوتا ہے جو زندہ انسانوں کی غذائی ضرورت پوری کرتا تھا۔

خانہ بدوش قبائل جب دجلہ وفرات کی وادی میں آباد ہوئے تو انہوں نے قبائلی

طرزِ زندگی ہی کو اختیار کیا اور قبائلی سردار کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھا۔

دریائے نیل کی طرح دجلہ و فرات میں بھی سیلاب آتے رہتے تھے۔ لیکن یہاں سیلابی پانی کو نہروں میں بہانے کی بجائے بڑے بڑے تالابوں میں جمع کیا جاتا تھا اور پانی کے ان ذخیروں پر قبیلے کے سردار کا قبضہ ہوتا تھا۔ وہی اپنی مرضی سے ضرورت مندوں کو کاشت کاری کے لئے پانی دیتا اور قبیلے کی فلاح و بہبود کے لئے اناج کی صورت میں ٹیکس بھی وصول کرتا۔ اس طرح باقاعدگی سے کاشت کاری کو فروغ حاصل ہوا، طرح طرح کی فصلیں اُگائی جانے لگیں۔ کھیت سر سبز و شاداب ہوئے۔ سماجی زندگی ان کھیتوں سے وابستہ ہوگئی اور بستیاں آباد ہونے لگیں۔ مگر ان بستیوں کو بیرونی خطرات بھی درپیش رہے۔ رفتہ رفتہ آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ شہری ریاستوں کا تصور پیدا ہوا اور شہری ریاستیں وجود میں آگئیں تو حفاظتی اقدام بھی کئے جانے لگے۔

دریائے دجلہ و فرات کی وادی یکے بعد دیگرے کئی تہذیبوں کی آماجگاہ بنی۔ جب چھوٹے چھوٹے گاؤں بڑے بڑے شہروں میں تبدیل ہوگئے۔ مختلف شہری ریاستیں وجود میں آگئیں۔ شہروں کی اہمیت ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کے ساتھ بڑھنے لگی تو ہر بڑے شہر کی علیحدہ حکومت قائم ہوگئی، جس کا حکمراں شہریوں کا مذہبی رہنما بھی ہونے لگا۔ اس لئے دجلہ و فرات کی وادی میں جو تہذیبیں پروان چڑھیں ان میں حکومت اور مذہب لازم و ملزوم رہے اور زیادہ تر حکومتیں مذہب کے نام پر قائم رہیں۔

تاریخی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ دجلہ و فرات کی وادی میں جن تہذیبوں نے پرورش پائی، ان میں چار ہزار سال قبل مسیح سے ۲۲۲۵ برس قبل مسیح تک سامری تہذیب کا دور دورہ رہا۔ ۲۲۲۵ سال قبل مسیح سے ۱۰۰۰ قبل مسیح تک سامری تہذیب کے بعد بابلی تہذیب اپنا رنگ جمائے رہی۔ پھر ایک ہزار سال قبل مسیح سے ۶۱۲ سال قبل مسیح تک آشوری تہذیب کا دور اپنی بہار دکھاتا رہا۔ اس کے خاتمے پر کلدانی تہذیب کا زمانہ آیا جو ۶۱۲ سال قبل مسیح سے ۵۳۸ سال قبل مسیح تک رہا۔ اس طرح وادیٔ دجلہ و فرات میں یکے بعد دیگرے جن تہذیبوں نے اپنے جلوے دکھائے

وہ جلوے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے قریب قریب ساڑھے پانچ سو سال پہلے اپنی آب و تاب دکھا چکے تھے۔ جس طرح پرانی روشنی پر نئی روشنی غلبہ پا لیتی ہے یا یوں کہیئے کہ اپنی ضیاء باریوں سے پرانی روشنی کو کچھ ماند کر دیتی ہے۔ یہی حال دنیا میں بنتی بگڑتی تہذیبوں کے نقش و نگار کا رہا ہے۔ لیکن جہاں تک تاریخی شواہد سے سے پتہ چلتا ہے تہذیبوں کا عروج و زوال خواہ کیسا بھی رہا ہو، اصل بات یہ ہے کہ جو تہذیب انسانی ایک مرتبہ اپنی رونمائی کر دیتی ہے، اس کے کچھ نہ کچھ اثرات دوسری تہذیبوں پر ضرور پڑتے ہیں۔ بالکل اس طرح کہ ہر نئی روشنی کا ماخذ تو پرانی روشنی ہی ہوتی ہے اور پرانی روشنی کے اثرات ہر نئی روشنی میں پیوست ہوتے ہیں۔ لیکن تبدیلی چونکہ قانونِ فطرت ہے اس لئے ہر نئی ابھرنے والی روشنی اگر زندہ رہنے کی طاقت رکھتی ہے تو اس کی توانائی زمانی اور مکانی حدود میں اپنا بول بالا کر دیتی ہے۔ وادیٔ دجلہ و فرات کی وہ قدیم تہذیبیں اب کہاں ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ کلیتاً فنا ہو گئی ہوں۔ اور کچھ نہیں تو تاریخ کے صفحات پر یقیناً زندہ ہیں۔

موہن جوداڑو کی تہذیب

موجودہ صدی کے آغاز تک یہ خیال عام تھا کہ جنوبی ایشیا اور خصوصاً ہندوستان میں تہذیب کی بنیادیں آریائی قوموں نے دو ہزار سال قبل مسیح میں رکھی تھیں۔ لیکن برطانوی دورِ حکومت کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے قدیم تہذیبی خطوں میں کھدائی کر کے جو تحقیق کی تو حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے۔

آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے دریائے سندھ کی وادی میں "موہن جو دڑو" کے مقام پر ۱۹۲۲ء سے اپنے کام کی ابتداء کی۔ وہاں کی زمین کو گہرائی تک کھودا گیا۔ جس سے وہ نوادرات اور قدیم تہذیبی آثار ملے جو یہ بتلاتے ہیں کہ آریوں کی آمد سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے موہن جو دڑو اور اس کے گرد و نواح میں ایسی مہذب بستیاں آباد تھیں جو ترقی کی مختلف منزلیں طے کر چکی تھیں۔ اس طرح سندھ کی قدیم ترین تہذیب وہی تھی جو دریائے نیل کی وادی والی تہذیب اور دجلہ و فرات کی وادی میں پروان چڑھنے والی تہذیب سے ملتی جلتی تھی۔

آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ سندھ میں جو اب سے پانچ چھ ہزار سال پہلے کے تہذیبی آثار دریافت ہوئے ہیں۔ وہ انسانی تہذیب بلوچستان اور پنجاب کے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم ابھی تک یہ بات نہیں معلوم ہو سکی کہ قدیم ترین زمانے میں وادئ سندھ کے باشندے کس نسل سے تعلق رکھتے تھے اور کس علاقے سے آئے تھے۔ بیشتر محققین نے ان کو سامی نسل سے تعلق رکھنے والے دراوڑی قبیلوں سے منسوب کیا ہے۔ مگر تحقیق کرنے والوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ قدیم انسانوں کی مختلف نسلوں کے لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے جو رفتہ رفتہ اپنے نسلی امتیازات ختم کر کے مہذب و متمدن زندگی

بسر کرنے لگے پھر کئی صدیوں تک انہوں نے مشترکہ تہذیبی قدروں کی نشوونما میں حصّہ لیا۔ اس طرح وہ تہذیب وجود میں آئی جسے وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کہتے ہیں۔ اس قدیم تہذیب کی دریافت نے تاریخِ انسانی میں ایک ایسے باب کا اضافہ کیا کہ عالمی سطح پر آج ساری دنیا کے اسکالر اسے بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ موہن جو دڑو کے جتنے آثار ابھی تک دریافت ہوئے ہیں وہ پورے شہر کا ایک تہائی حصّہ ہیں۔ دو تہائی شہر اب بھی زیرِ زمین ہے۔ یہ بھی اللّٰہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ انسانی کوششیں معلوم سے نامعلوم کی طرف بڑھتی جا رہی ہیں۔ بہرکیف اس قدیم ترین انسانی بستی کی عمارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر کی آبادی دو علیحدہ علیحدہ علاقوں میں آباد تھی۔ ایک علاقہ وہ تھا جہاں شہر کے عام باشندے رہتے تھے۔ ان کے پختہ مکانات میں دو کمرے، غسل خانہ، کنواں اور گندے پانی کے اخراج کی نالیاں ہوتی تھیں۔ دوسرا وہ علاقہ تھا جہاں شہر کا حکمراں طبقہ رہائش پذیر تھا۔ عمارتیں کشادہ اور وسیع، بہت بڑے اور خوبصورت حمّام کا اہتمام۔ ایک صاف و شفاف پانی کا وسیع و عمیق حوض۔ شہر میں بڑے بڑے گودام اور رئیسوں کے محلات۔ غرض یہ کہ ان تمام علامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ منظّم و مہذّب زندگی بسر کرتے تھے۔ معاشرتی اور اقتصادی طور پر بہت خوشحال تھے۔ مختلف دھاتوں کے استعمال سے واقف تھے۔ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ سوت کاتنے اور کپڑا بُننے کا ہنر آتا تھا۔ خواتین آرائش و زیبائش کی شائق تھیں۔ غریب لوگ کپڑے کا استعمال کم کرتے تھے۔ بچوں کی تربیت اور تفریح پر توجّہ دی جاتی تھی۔ کھلونے مٹی، پتھر اور ہاتھی دانت کے بناتے تھے۔ سیر و شکار کا رواج عام تھا۔

جہاں تک ان قدیم باشندوں کے مذہبی عقائد کا سوال ہے تو اس بارے میں زیادہ معلومات ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ ہاں یہ پتہ چلا ہے کہ مرنے کے بعد زیادہ تر اپنے مردوں کو دفن کر دیتے تھے۔ یہ بات ان مکمل انسانی ڈھانچوں سے علم میں آئی جو کھدائی کے دوران دریافت ہوئے۔ عبادات وغیرہ کے سلسلے میں وہ لوگ دیوی دیوتاؤں کے قائل تھے۔ البتہ باقاعدہ بُت خانے وغیرہ بنانے کا رواج نہ تھا۔

" جو تھا، نہیں ہے، جو ہے، نہ ہوگا یہی ہے اِک حرفِ محرمانہ "

چینی تہذیب

پیغمبرِ اسلام سرورِ دو عالم رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حصولِ علم کے سلسلے میں ارشاد فرمایا تھا کہ "علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے"۔ اس ارشادِ مبارک سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ چین کی تہذیب علمی لحاظ سے بھی بڑی پُرکشش تھی۔

زمانۂ قدیم میں چین جیسا وسیع ملک عرصۂ دراز تک بیرونی حملوں سے محفوظ رہا۔ کیوں کہ اس کی سرحدیں بلند پہاڑوں اور سمندر کی گہرائیوں سے ملتی رہیں۔ چین کے لوگ بے خوف وخطر صدیوں اپنی تہذیب کی نشوونما میں مگن رہے اور اپنے علوم وفنون کو ترقی دیتے رہے۔ ان کا اپنا نظامِ سلطنت تھا جس پر دوسرے خطّوں کی تہذیب اثر انداز نہ ہوئی۔ دریائے ہانگ ہو اور کئی دوسرے بڑے دریا اسے سیراب کرتے رہے اور انہوں نے چین کو تین بڑے حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہاں چینی، منگول، مانچو اور تبّتی نسلوں کے لوگ آباد تھے اور سب نے چین کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ پہلے انہوں نے گاؤں بسائے پھر شہر آباد کیے اور ایک ایسی چینی تہذیب کی بنیاد رکھی جو مصر، بابل اور وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کی طرح ترقی اور خوشحالی کی ضامن تھی۔ اس چینی تہذیب کی ترقی کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور تو وہ ہے جس کا علم ہمیں صرف چینی کہانیوں اور قصّوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اور اصولاً جس کی تحریری تاریخی اہمیت زیادہ نہیں۔ لیکن دوسرا دور تاریخی لحاظ سے بڑا اہم تسلیم کیا جاتا ہے جس میں مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں اور چینی تہذیب اپنے عروج کو پہنچی۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے دور کی تہذیب میں کچھ دوسری تہذیبوں کا خمیر بھی شامل ہوا۔

چین کی قدیم ترین تہذیب کے قصّے کہانیوں کا دور تین ہزار سال قبل مسیح سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح تک رہا۔ لیکن افسانوی دور میں جن بادشاہوں اور خاندانوں نے حکومت کی ان کا تاریخ سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان بادشاہوں کے مافوق البشر کارناموں کو خاص اہمیت دی گئی۔ مثلاً کنفیوشس (Confucius) کی تحریروں کے مطابق افسانوی دور کے چینیوں نے اتنی ترقی کرلی تھی کہ وہ کاشت کرتے تھے۔ انہیں سونا، چاندی، تانبہ اور سیسہ استعمال کرنے کا سلیقہ تھا۔ وہ گھوڑوں اور دیگر پالتو جانوروں سے کام لینے لگے تھے۔ ریشم کے کیڑوں سے ریشم بنانے کا ہنر اور جنگوں میں رتھ استعمال کرنے کا رواج ان کی تہذیب کے اہم عناصر تھے۔

قدیم دور میں چینیوں نے تصویری رسم الخط ایجاد کرلیا تھا جس کے ذریعے انہوں نے باقاعدہ علم و ادب کو فروغ دیا۔ کیوں کہ آگے چل کر تصویروں کی جگہ علامات اور مخصوص نشانات نے لے لی تھی۔

چینی تہذیب کے قدیم ترین پہلو ہوں یا پھر قدیم تاریخی پہلو۔ منفرد خصوصیات دونوں میں قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً فنِ تحریر کا پہلو جو علمی اور ادبی برتری کی علامت رہا۔ قدیم تصویری رسمِ خط نے جب جذبات و خیالات کی وسعتِ اظہار کے لئے مخصوص علامات و نشانات کے رسمِ خط کی صورت اختیار کرلی تو ان کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچی۔ لیکن پانچ چھ ہزار علامات سے واقفیت رکھنے والا چینی انسان لکھنا پڑھنا سیکھ سکتا تھا۔ چینی رسمِ خط دنیا کے مختلف طرز ہائے تحریر سے کچھ یوں بھی مختلف رہا کہ چینی طرز میں اوپر سے نیچے کی طرف حروف یا نشانیاں لکھی گئیں۔ جبکہ دیگر زبانوں میں حروف دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں جانب لکھے گئے۔

چینی تہذیب کا وہ دور جو تاریخی لحاظ سے تاریخ دانوں کے علم میں آچکا ہے،

اس کا آغاز شانگ (Shang) خاندان کے حکمرانوں سے ہوا۔ اس خاندان کے ۲۸ حکمرانوں نے ۱۷۶۶ ق م سے ۱۱۲۲ ق م تک حکومت کی اور اس دور حکومت میں جاگیردارانہ نظام قائم ہوا۔ چین اپنے رقبہ کے لحاظ سے وسیع ملک تھا۔ اس لئے انتظام سلطنت کو بہتر چلانے کے لئے ملک کو بہت سے صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ کمزور بادشاہوں کے زمانے میں یہ صوبے خود مختار ہو گئے۔ ملک بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ لیکن پھر بھی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے خود مختار حکمراں بادشاہ کی برتری کو تسلیم کرتے رہے اور جیسے تیسے مرکزی حکومت قائم رہی۔

شانگ خاندان کے آخری حکمراں ظالم اور عیش پسند ہو گئے تھے۔ ان کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ریاست چاؤ (Chou) کے حکمراں دوانگ (Dawang) نے بغاوت کر دی اور بادشاہ کو شکست دے کر ہمیشہ کے لئے شانگ خاندان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

قدیم چین میں چاؤ خاندان کا دورِ حکومت ۱۱۲۲ ق م سے ۲۴۹ ق م تک تقریباً ۹۰۰ برس قائم رہا۔ یہ قدیم چین کی تاریخ و تہذیب کا اہم ترین دور تھا۔ کیوں کہ اس دور کے تمام واقعات کا تحریری ثبوت موجود ہے اور اس دور سے چین کی تاریخ بالکل واضح شکل میں اقوامِ عالم کے سامنے آئی جبکہ قدیم ترین چینی تاریخ داستانوں اور کہانیوں کی مرہونِ منت تھی۔

ہڑپہ کی تہذیب

موہن جودڑو کی ہمعصر تہذیبوں میں ہڑپہ کی تہذیب کا نام بھی آتا ہے جو پنجاب کے خطے میں وادئ سندھ کی قدیم تہذیب مانی جاتی ہے۔ موہن جودڑو اور ہڑپہ کے درمیان تقریباً چار سو میل کا فاصلہ ہے لیکن ان دونوں تہذیبی مراکز میں بڑی مماثلت پائی گئی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ دونوں شہر تقریباً ایک ہی زمانے میں آباد اور پھر دریائے سندھ کی طغیانیوں سے برباد ہوئے۔ ہڑپہ کے قدیم تہذیبی آثار بھی موہن جودڑو کی طرح مٹی کے ٹیلوں کی گہری کھدائی کے نتیجے میں برآمد کئے گئے۔

دونوں شہروں کی بناوٹ اور عمارتوں کے رنگ ڈھنگ سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہڑپہ کا شہر بہت سلیقے اور ہنر مندی سے بسایا گیا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے باقاعدہ نقشہ بنایا گیا پھر اس نقشے کے مطابق کشادہ راہیں، پختہ مکانات، بازار اور گلیاں وغیرہ بنائی گئیں۔ آبادی گنجان تھی۔ عالیشان مکانات اور پبلک عمارات کی موجودگی کے آثار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایک ایسا حکمراں طبقہ ضرور تھا جو یا تو شہروں میں نظم و نسق چلاتا تھا یا پورے علاقے پر قابض تھا۔ لیکن ابھی تک یہ بات دریافت نہیں کی جاسکی ہے کہ حکمراں طبقے کی حکمرانی بادشاہوں جیسی تھی یا مجموعی طور پر طبقۂ امراء کی حکومت تھی۔ جیسی کہ قدیم یونان میں پائی جاتی تھی۔ بہرکیف اتنے قاعدے قرینے سے تعمیر کئے گئے شہر اور اتنی منظم سوسائٹی بغیر کسی حکومت اور مناسب نظم و ضبط کے وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ اس کے علاوہ تاجر پیشہ قوم کے لئے قوانین کا ہونا بھی بہت ضروری ہوتا ہے اور قوانین اس وقت تک نہیں بن سکتے جب تک کہ قانون بنانے والے اور قانون نافذ کرنے والے ادارے اور قوتیں موجود نہ ہوں۔ یہ بات

تو وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ موہن جو دڑو کی طرح ہڑپہ کے شہروں پر بھی حکومتیں قائم تھیں مگر ان کی نوعیت کیا تھی، اس کا علم ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ اگر بادشاہوں کا کوئی وجود ہوتا تو مصر کی طرح ان کے کوئی کتبے، تصاویر یا دیگر کوئی نشانی ملتی۔ لیکن بادشاہوں کے مجسموں اور تصاویر وغیرہ کی غیر موجودگی یہ بتاتی ہے کہ ہڑپہ میں بھی کوئی بادشاہی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس دور کے مذہبی عقائد کے مطابق کسی مذہبی رہنما کو اپنا حکمران بھی تسلیم کر لیتے ہوں۔

ہڑپہ میں کسی مندر یا باقاعدہ کسی عبادت گاہ کے آثار بھی نہیں ملے۔ البتہ کچھ مجسّمے ایسے ضرور برآمد ہوئے ہیں جو بتوں کی طرح کے ہیں۔ ایک ایسی مہر بھی ملی ہے جس پر کسی دیوی کی تصویر کندہ ہے۔ کچھ مہریں درختوں اور جانوروں کی شکلیں ظاہر کرتی ہیں۔ مہروں پر جو عبارتیں ہیں، ان کو ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا۔ وہ اس دَور کے انسانوں کے تعلیمی معیار کا عکس تو ہیں، لیکن زبان کون سی تھی اور رسم الخط سے کیا مفہوم نکلتا ہے اس بارے میں کوئی بات سامنے نہیں آئی ہے۔

ہڑپّہ کی تہذیب جس خطّے میں پرورش پا رہی تھی وہ دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں سے سیراب ہوتا تھا۔ زمین کی زرخیزی اور پانی کی فراوانی سے اس خطّے میں کاشت کاری کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ اور یہاں اناج کی کاشت ابتدا ہی سے کی جانے لگی تھی۔ شہر میں اناج کے گوداموں کی موجودگی، غلّے کی تجارت کا پتہ بھی دیتی ہے۔ اغلب یہ ہے کہ قدیم ہڑپہ کے باشندے زراعت اور تجارت میں یکساں کامیاب تھے۔ وہ پُرامن زندگی بسر کرتے تھے۔ آثارِ قدیمہ کی جانب سے جو کھدائی ہوتی رہی ہے اس کے نتیجے میں روزانہ استعمال کی چیزیں بکثرت ملی ہیں۔ مثلاً برتن، زیورات، اوزار، کاشت کاری کے آلات، مٹی اور پتھر کے بت اور کچھ ہتھیار وغیرہ۔

ہڑپہ کی وادی میں روئی کی کاشت بھی ہوتی تھی اور کپڑا بننے کی روایت بھی مستحکم تھی۔ سوت کاتنے کی تکلیاں اور کچھ کپڑوں کے ٹکڑے اس کا ثبوت دیتے ہیں۔ مرد اور عورت

باقاعدہ لباس زیبِ تن کر کے آرائشی ساز و سامان بھی استعمال میں لاتے تھے۔ مثلاً گلے کی مالائیں اور ہاتھوں کی چوڑیاں جو ہاتھی دانت، سونا چاندی اور تانبے کی بنی ہوئی ہیں۔ چوڑیوں کے علاوہ مختلف قسم کے ہار، کنگن، پازیب، انگوٹھیاں اور چاندی کے بندے خواتین کی آرائش کا پتہ دیتے ہیں۔

وہ قدیم معاشرہ کاشت کاروں، تاجروں اور صنعت کاروں پر مشتمل تھا۔ سفر اور بار برداری کے لیے پالتو جانوروں اور بیل گاڑیوں سے کام لیتے تھے۔ دریائی سفر کشتیوں سے ہوتا تھا۔ اس طرح تجارت اور صنعت کے فروغ میں وہ لوگ پیش پیش تھے جنگ و جدل سے گریز کرتے تھے۔ کھیل اور تفریح کے لئے شکار کرنا، پانسہ کھیلنا اور مچھلیاں پکڑنا ان کے اہم مشاغل تھے۔ پالتو جانوروں میں بیل، بھینسے، بندر، کتے، بلیاں، طوطے اور مرغ قابلِ ذکر ہیں، جن کے نقوش اور تصاویر مہروں پر کندہ ہیں۔

جس طرح موہنجو ڈرو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سات مرتبہ آباد اور برباد ہوا۔ اسی طرح ہڑپہ بھی صدیوں کے سفر میں سندھ کی طغیانیوں کے سبب اجڑتا اور اور دوبارہ بستا رہا، مگر دو باتوں پر اب تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ اول یہ کہ وہ قدیم تہذیب جسے ہڑپہ کی تہذیب کہتے ہیں وہ کس طرح وجود میں آئی تھی اور دوسری بات یہ کہ ایکدم اس تہذیب کا خاتمہ کیسے ہو گیا۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو ۲۵۰۰ ق م میں کوئی بہت ہی زبردست طوفان آیا جس نے آن کی آن میں سب کچھ مٹا دیا یا پھر کوئی ایسی وبا پھوٹ پڑی ہو گی جس نے پوری آبادی کو موت کی نیند سلا دیا۔ بہرکیف اس قدیم تہذیب کا ذکر تاریخ میں محفوظ ہے اور عجائب گھروں میں اس کی نشانیاں موجود ہیں۔

کوٹ ڈجی

وادیٔ سندھ کے قدیم ترین تہذیبی مراکز یعنی موہن جودڑو اور ہڑپّہ کی دریافت کے بعد محکمۂ آثارِ قدیمہ کی برابر یہ کوشش رہی ہے کہ مزید معلومات حاصل ہوں۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کا دائرہ کچھ اور بڑھادیا گیا اور ایک حیرت انگیز کامیابی یہ ہوئی کہ ضلع خیرپور میں قومی شاہراہ پر اب وہ دلچسپ موڑ بھی آتا ہے جہاں سے 'کوٹ ڈجی' کی قدیم تہذیب کا نشان ملتا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں محکمۂ آثارِ قدیمہ نے مسٹر ایف اے خان کی زیرِ نگرانی خیرپور سے ۱۵ میل جنوب کی طرف 'کوٹ ڈجی' کے مقام پر کھدائی کا آغاز ہوا اور دو تین برس میں اتنی قدیم اور نادر چیزیں برآمد کرلی گئیں جو ہزاروں سال پرانے تہذیبی سفر کا پتہ دیتی ہیں۔

موہن جودڑو کی طرح کوٹ ڈجی بھی دو حصّوں میں منقسم تھا۔ بالائی حصّہ اور زیریں حصّہ۔ بالائی حصّے میں عام آبادی رہتی تھی۔ اور نچلے حصّے میں ایک بہت بڑا قلعہ تھا جس میں حکمراں طبقہ رہتا تھا اور اس قلعے سے شہر کی حفاظت کی جاتی تھی۔ قلعے کی فصیل کافی اونچی اور چوڑی ہے اور اس کی بنیادوں میں پتھر کا استعمال ہوا ہے۔ قلعہ میں رہائشی مکانات کے کمرے بڑے اور کشادہ ہیں۔ ساتھ ہی ایسے کمرے بھی ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان سے انتظامی امور میں مدد لی جاتی تھی۔

کوٹ ڈجی کی کھدائی سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ یہ قدیم تہذیبی مرکز وادیٔ سندھ میں موہن جودڑو اور ہڑپّا سے بھی قدیم تھا اور یہاں کی تہذیب اب سے پانچ ہزار سال پہلے اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ آثار یہ بتاتے ہیں کہ اس بیشتر تہذیب کا اثر

موہن جو دڑو اور ہڑپہ کے لوگوں نے قبول کیا تھا اور شہروں ہیئت میں وہی ساخت اپنائی تھی جو اس خطے کی شناخت بنی ہوئی تھی۔ ایک اور امتیازی علامت یہ پائی گئی کہ موہن جو دڑو کی عمارت کے صرف سات طبقات دریافت ہوئے جبکہ کوٹ ڈیجی کی بنیادوں کے گیارہ طبقات کا سراغ ملا ہے۔

کوٹ ڈیجی کے آثارِ قدیمہ اور نوادرات سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ یہاں کے قدیم باشندے امن و امان سے رہتے تھے اور انہوں نے مختلف پیشے اختیار کئے ہوئے تھے۔ ظروف سازی کا کام بڑی عمدگی سے ہوتا تھا۔ منقش ظروف سازی یعنی برتن بنانے کا کام چکنی مٹی سے لیا جاتا تھا۔ وہ لوگ رنگوں کے استعمال سے بھی خوب واقف تھے اور مرصع کاری کا آرٹ جانتے تھے۔ پتھروں کے اوزار کثیر تعداد میں برآمد ہوئے ہیں۔ اور یہ کافی مہارت سے بنائے گئے ہوں گے۔ کچھ اوزار نوکیلے ہیں، کچھ دندانے دار اور کچھ ایسے جن کی دھار اس زمانے میں بہت تیز رہی ہوگی۔ بہر تو پتھر کے یہ اوزار اس بات کا ثبوت بھی ہیں کہ اس قدیم دور میں یہاں کے لوگ دھاتوں کے استعمال سے واقف نہ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ تہذیبی تسلسل میں بعد کو انہوں نے دھاتوں کا استعمال بھی شروع کر دیا ہو۔ مگر زیادہ تر کام وہ چکنی مٹی اور پتھروں ہی سے لیتے رہے۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس خطے کی تہذیبی قدامت اس دور سے وابستہ تھی جسے پتھر کا عہد کہتے ہیں۔

پاکستان کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے چند ممتاز عالمی اداروں اور آثارِ قدیمہ کی دریافت کے ماہرین کی مدد سے کوٹ ڈیجی کے مقام پر جو نئے آثار دریافت کئے ہیں ان میں تاریخی قلعہ، کشادہ مکانات، مختلف قسم کے برتن، پتھر کے اوزار اور کچھ ہتھیار قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی ساخت اور ہیئت سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ قدیم ترین تہذیبی مرکز وادیٔ سندھ کے قدیم تہذیبی مراکز میں اولیت رکھتا ہے۔ اسے قدیم سندھ کی متمدن زندگی کا حرفِ آغاز سمجھا جانا چاہیئے۔ بعد میں موہن جو دڑو اور ہڑپہ جیسے مراکز نے اسی کے اثرات

قبول کئے اور ان کی تہذیب عروج پر پہنچی۔

تاریخی شواہد سے اب تک یہ سراغ نہیں لگایا جاسکا ہے کہ اس سرزمین پر آریائی قبیلوں کی آمد سے مدتوں پہلے جو لوگ یہاں آکر بسے تھے وہ اسی وادی کے اصل باشندے تھے یا کسی اور علاقے سے آئے تھے۔ اس سلسلے میں کوٹ ڈیجی کی دریافت نے بھی کوئی انکشاف نہیں کیا ہے۔ البتہ اس قدیم تہذیبی مرکز کی تباہی کا خفیف سا اندازہ کچھ یوں لگایا گیا ہے کہ قلعے کی اوپری سطح پر جلی ہوئی چیزوں کی راکھ تہوں کی صورت میں دریافت ہوئی ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ شہر کی تباہی آگ لگنے سے ہوئی ہوگی۔ مگر یہ بتانا ممکن نہیں کہ آگ کسی ناگہانی حادثے کا نتیجہ تھی یا کسی دشمن نے شہر پر حملہ کرکے اسے نذرِ آتش کر دیا تھا۔ سیاہی مائل راکھ کی تہیں جو قلعے سے لے کر پورے شہر کی عمارتوں پر چڑھی ہوئی ہیں، وہ اس بات کا ثبوت دیتی ہیں کہ پورے شہر کو وسیع پیمانے پر آگ لگا کر نیست و نابود کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور یہ کوشش اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب بھی ہوئی۔

ماہرینِ تاریخ اس بارے میں یہ خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ غالباً ہڑپہ کے لوگوں نے اس متمدن شہر پر حملہ کیا ہوگا۔ کیوں کہ ان دونوں شہروں کے برتنوں میں جو مماثلت ہے اور تقابلی تجزیہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ہڑپہ کے کاریگر کوٹ ڈیجی کے کاریگروں سے متاثر ہوئے تھے۔ ظاہر ہے یہ اثرات دور دراز علاقوں تک اسی صورت میں پہنچ سکے ہوں گے کہ ہڑپہ کے قبائل نے کوٹ ڈیجی کے ترقی یافتہ تہذیبی اور تمدنی مرکز پہ بھرپور منظم حملہ کیا ہوگا اور مال و اسباب لوٹنے کے بعد شہر کو آگ لگا دی ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں اس قسم کی قیاس آرائیوں کے سلسلے بھی چلتے رہتے ہیں۔ ان کی حیثیت زیبِ داستاں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ تہذیبِ انسانی کے سفر میں وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کا جو حصہ ہے اس میں کوٹ ڈیجی کا تہذیبی مرکز بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

بودھ مذہب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً چھ سو برس پہلے کا ذکر ہے۔ کوہ ہمالیہ کی ترائی میں نیپال سے قریب ایک قدیم ریاست کا نام کپل وستو تھا جہاں کے مہاراجہ "شدودھن" کے محل میں بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد وہ راجکمار پیدا ہوا جس کا نام "سدارتھا" رکھا گیا۔ مہاراجہ نے اپنی ریاست کے ممتاز نجومیوں اور جوتشیوں کو بلایا تاکہ راجکمار کی جنم پتری تیار کرائی جائے انھوں نے حساب کتاب کر کے مہاراجہ کو بتایا کہ یہ راجکمار یا تو بہت بڑا راجہ بنے گا یا پھر بہت بڑا سادھو۔

مہاراجہ کو فکر ہو گئی کہ راجکمار کو باہر کی ہوا ہی نہ لگنے دی جائے جو سادھو یا فقیر بننے کی نوبت آئے۔ راج محل میں اس کی آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھا گیا، لیکن راجکمار کو بچپن ہی سے گہری گہری سوچوں میں ڈوبے رہنے کی عادت تھی۔ دنیا کی لذتیں اور محل کی آسائشیں اس کو مطمئن نہ کر سکیں۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے ساتھ اس کے دھیان میں بہت سی باتیں آتی رہیں۔ وہ اکثر چپ رہتا اور تنہائی کو پسند کرتا۔

مہاراجہ نے اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی شادی ایک خوبصورت شہزادی "یشودھرا" سے کرادی۔ سال بھر بعد ایک بیٹا بھی ہوا، مگر راجکمار کا بے چین دل پھر بھی نہ بہلا۔ اس کی سوچوں کو چار باتوں نے بہت اکسایا تھا۔ پہلے اس نے ایک بے بس و لاغر بوڑھے کو دیکھ کر سوچا کہ وہ خود بھی اس حالت کو پہنچے گا۔ پھر ایک بیمار کو دیکھا تو محسوس کیا کہ وہ خود بھی اس آزار میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک مردے کی ارتھی دیکھی تو موت کے بارے میں بہت کچھ سوچا۔ ایک اور نظارہ یہ دیکھا کہ ہل چلاتا ہوا کوئی کسان زخموں سے چور چور بیل کو مار پیٹ رہا ہے۔ یہ تمام احساسات اس کی روح میں جڑ پکڑ گئے۔ دکھوں سے نجات پانے کے طریقے

کی تلاش میں وہ ایک رات اپنی بیوی اور بچے پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے رات کی تاریکی میں چپ چاپ اپنے راج محل سے نکل کھڑا ہوا اور دریا کے کنارے پہنچا۔ وہاں ملاح کو اپنا قیمتی لباس دے کر اس کے پھٹے پرانے کپڑے پہنے دریا کو پار کیا اور جنگلوں میں داخل ہو گیا۔ بھوکا پیاسا جگہ جگہ گھومتا رہا۔ کہیں پوجا پاٹ کرنے والوں کو دیکھا اور ان کے ساتھ رہا مگر سکون نہ پایا۔ تن تنہا ہر قسم کی تکلیفیں اٹھاتا ہوا صوبہ بہار کے گھنے جنگلوں میں آیا اور ایک چھتنار برگد کے نیچے بیٹھ گیا۔ مسلسل فقر و فاقے سے پورا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔ مگر پیہم غور و خوض سے روح میں وہ روحانی روشنی جاگ اٹھی جو نروان یعنی نجات حاصل کرنے کا پیغام لائی۔

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا غیبی نظام ہے کہ وہ کس کی روح کو کیا کچھ عطا کرتا ہے۔ وہ راجکمار جس کی پرورش بڑے ناز و نعم سے راج محل میں ہوئی تھی، بذاتِ خود اپنی مرضی سے سچائی اور نجات کی تلاش میں طرح طرح کے آزار برداشت کرتا رہا۔ یہاں تک ہوا کہ سخت ریاضت کے دوران بے ہوشی کے دورے بھی پڑے۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ

" جستجو یاں شرط ہے ملنے کو کیا ملتا نہیں "

آخر کار وہ سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان کو حقیقی سُکھ اور روحِ انسانی کو ابدی نجات اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس کا جسم اور اس کے خیالات برائیوں اور گناہوں سے پاک ہوں۔ وہ تمام انسانوں سے محبت کرے۔ دنیاداری کے تمام تفرقے ختم ہو جائیں۔ کوئی کسی کو دکھ نہ پہنچائے۔ انسان تو انسان چھوٹے چھوٹے جانور کو بھی ستانا برا سمجھا جائے۔

تاریخ انسانی میں اس راجکمار کا نام مہاتما بودھ کہلایا اور جو مذہب اس سے منسوب ہوا اسے بودھ مت کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ مقام جہاں مہاتما بودھ کو نروان کا گیان حاصل ہوا تھا اسے "بودھ گیا" کہتے ہیں۔ عرصۂ دراز سے وہاں بودھ مت کی ایک بڑی عبادت گاہ قائم ہے۔ اسی مقام سے گوتم بودھ اپنا پیغام لے کر بنارس آئے تھے۔ جہاں رفتہ رفتہ گوتم بودھ کے عقیدت مندوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اس علاقے کے حکمراں بھی بودھ مت کے پیرو کار بن گئے۔

ان میں گوتم بودھ کے والدین اور بیوی بچہ بھی شامل تھے۔

گوتم بودھ نے ۴۵ برس تک ملک کے مختلف علاقوں میں بودھ مت کو پھیلایا۔ وہ لوگ جو ذات پات کے بندھنوں سے سخت بے زار تھے اس نئے مذہب کے شیدائی بن گئے۔ اس مذہب کی نمایاں خوبی یہ تھی کہ نہ بت پرستی کرنی پڑتی تھی نہ برہمنوں سے دب کر رہنا ہوتا اور نہ ذات پات کے فرق و امتیاز سے کوئی واسطہ رہتا۔

گوتم بودھ کی تعلیمات کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول نروان یعنی نجات، دوم کرما یعنی اعمال و افعال اور سوم اہنسا یعنی ایثار و قربانی اور سب سے بھلائی کا برتاؤ۔ ان تمام شعبوں کا مقصد اخلاق و اعمال کی نیکی تھا۔ بودھ مت کے نقطۂ نظر سے زندگی غم و آلام کا مجموعہ ہے۔ اس لئے چار حقائق یعنی دنیا کی مصیبت، مصیبت کی وجوہات، مصیبت کا خاتمہ اور اس راستے کا تعین جس پر چل کر مصیبتیں ختم ہوسکتی ہیں، وہ عوامل ہیں جن کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ مصیبتوں کا اصل سبب گوتم بودھ نے عیش و آرام کی خواہشوں کو قرار دیا۔ اس لئے خواہشوں کو کم سے کم کرنا اور پھر بالکل مٹا دینا "نروان" کا ذریعہ ہے جس کے لئے یقین کامل رکھنا، سچ بولنا، ٹھیک سوچنا، نیک عمل کرنا، نیک کوشش کرنا، حلال کمائی کھانا، صحیح احساس رکھنا اور نجات یا نروان کی آرزو میں جینا ہر بودھی یعنی بودھ مت کو ماننے والے کے لیے ضروری ہے۔

بودھ مذہب اور اشوک کا دور

مہاتما گوتم بودھ نے قدیم آریائی مذہب پر کاری ضرب لگائی تھی۔ کیونکہ ذات پات کی تقسیم کے وہ نظام جو نیچ ذات کے ہندوؤں کو سماجی پستی میں رکھے ہوئے تھے بودھ مت کی تعلیمات نے ان کو اپنی طرف مائل کیا۔ بودھ مت میں انسانی مساوات کا تصور موجود تھا اور انسانی برتری کا معیار عملی زندگی کو قرار دیا گیا تھا۔ لیکن برہمنوں اور بڑی ذاتوں کے ہندو رہنماؤں نے بودھ مت کو عوام میں پھیلنے نہیں دیا۔

اس زمانے میں ایک ہندو خاندان 'موریہ' کے نام سے موسوم تھا۔ اس خاندان میں چندر گپت موریہ جیسا حکمراں پیدا ہوا جس نے شمالی ہند میں موریہ سلطنت کو بڑی وسعت دی۔ اسی موریہ خاندان کا تیسرا بڑا حکمراں اشوک تھا جسے موریہ سلطنت کے تخت پر قابض ہونے کے لئے بڑی خوں ریز خانہ جنگی سے گزرنا پڑا۔ اس سے پہلے اشوک کا باپ نندوسار حکمراں تھا اور اشوک اپنے باپ کی حکمرانی کے دور میں ٹیکسلا کا گورنر رہ چکا تھا۔ مختلف جنگوں میں اس نے فتوحات بھی حاصل کی تھیں۔ اس طرح تخت نشینی سے پہلے ہی وہ مہم جوئی میں کمال حاصل کر چکا تھا۔

۲۷۳ء قم میں اشوک موریہ سلطنت کا حکمراں بنا اور شروع سے سلطنت کو وسیع تر کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ ۲۶۱ قم میں اس نے خلیج بنگال کے زرخیز ساحلی علاقے کو فتح کرنے کے لئے فوج کشی کی۔ اس جنگ میں طرفین کے لاکھوں آدمی مارے گئے۔ پھر خدا کی قدرت کہ اشوک کے دل پر بھیانک خوں ریزی کا اتنا اثر پڑا کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ جنگ و جدل سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لے گا۔ اسے جنگ سے سخت نفرت ہو گئی اور بودھ مت

قبول کر کے امن وسلامتی کا پیام بر بن گیا۔ اس وقت تک بودھ مت کی حیثیت ایک فرقے سے زیادہ نہ تھی لیکن جب اشوک نے بودھ مت کی تعلیمات کو ہر طرف پھیلانا اپنی زندگی کا اولین مقصد بنا لیا تو رفتہ رفتہ نہ صرف اس کی تمام رعایا بودھ مت میں داخل ہو گئی بلکہ ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں بھی اس نے اپنے سفیروں کو بھیج کر مہاتما بودھ کی امن پسند تعلیمات کو پھیلایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برما، سیلون، انڈونیشیا، چین اور جاپان تک بودھ مت کا پھیلاؤ ہو گیا۔

اشوک نے اپنی وسیع سلطنت کے ہر حصے میں ایسی لاٹیں بنوائیں جن پر بودھ مت کے اصول کتبوں کی صورت میں کندہ کرائے گئے۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی گئی وہ بودھ دھرم کی ترقی و ترویج میں ہمہ تن منہمک ہو گیا بلکہ عمر کے آخری حصے میں تو وہ خود بھی بودھ بھکشوؤں کی جماعت میں شامل ہو گیا اور دور دور کے علاقوں میں جا کر عوام و خواص کو امن و سلامتی کی تعلیم دینے لگا۔ حکومت کے تمام اہل کاروں کو بھی اس نے بودھ مت کی تبلیغ و اشاعت پر لگا دیا تاکہ منظم طریقے پر رعایا کو بودھی بنایا جا سکے۔

مثل مشہور ہے کہ جہاں چاہ وہاں راہ۔ اشوک کی زندگی میں بودھ مت کی پیروی سے ایسا انقلاب آیا تھا کہ اسے اٹھتے بیٹھتے عوام کی فلاح و بہبود اور امن و آشتی کا خیال رہنے لگا۔ وہ دور دراز کے علاقوں کے دورے کر کے بذاتِ خود بھی اپنی رعایا کے حالات سے واقفیت حاصل کرتا اور ان کی تمام تکالیف کو دور کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا۔ اس نے اپنی بنوائی ہوئی بلند و بالا لاٹوں اور مناروں پر جو کتبے نصب کرائے تھے ان میں سے بعض پر یہ عبارت پائی گئی ہے کہ تمام رعایا میری اولاد ہے۔ اس کی فلاح میرا فرض ہے۔ میں نے اپنے افسروں کو اس لئے مقرر کر رکھا ہے کہ وہ رعایا کے ساتھ اپنے بیٹوں جیسا سلوک کریں۔ میرے پیش نظر ساری دنیا کی بھلائی ہے۔ میری ساری کوشش یہی ہے کہ میری رعایا کی اخلاقی اور مادی حالت بہتر ہو۔ یہ عبارت ظاہر کرتی ہے کہ اشوک نے مہاتما بودھ کی تعلیمات کے مطابق ذات پات کے بندھنوں کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ بودھ دھرم کے جو اصول اس نے لاٹوں پر نمایاں انداز میں

کندہ کرائے ان میں پہلا اصول اہنسا کا تھا جس کے تحت ہر جاندار کی جان اتنی ہی قیمتی تھی جتنی ایک انسان کی جان۔ لہٰذا ایک جان دار کو آزار پہنچانا بڑا گناہ ہے۔ اس اصول کی رو سے شکار کھیلنے اور جانوروں کی قربانی دینے پر بھی سخت پابندی لگادی گئی۔ دیگر اصولوں میں بزرگوں اور عالموں کی عزت، ماں باپ اور اساتذہ کا حکم ماننا، رشتے داروں اور ہمسایوں سے محبت کرنا، غلاموں اور کمتر لوگوں سے مشفقانہ سلوک کرنا ضروری سمجھا گیا۔

مذہبی رواداری کے سلسلے میں اشوک نے ہر فرد کو یہ آزادی دی کہ وہ اپنے اصولوں اور مذہبی عقیدوں پر کاربند رہنے میں پوری طرح آزاد ہے۔ اشوک کے نزدیک کسی دوسرے مذہب کی مخالفت کرنا اور اس کے پیشواؤں کی بے عزتی کرنا خود اپنے مذہب کو ذلیل کرنا ہے۔

سخاوت اور نیک دلی پر زور دیتے ہوئے اس نے یہ درس دیا کہ ہر انسان کو خوش اخلاق، نیک دل اور پرہیزگار ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے انصاف پسندی اور رحم دلی بھی ضروری ہے۔

یہ اور ایسے ہی انسانیت نواز اصولوں کی اشاعت تقریباً ۳۴ کتبوں کے ذریعے کی گئی علاوہ ازیں عام لوگوں کی بھلائی کے لئے اشوک نے پوری سلطنت میں سڑکیں بنوائیں، کنویں کھدوائے اور مسافروں کے لئے سرائیں بنوائیں۔

۲۳۱ ق م میں اشوک نے وفات پائی اور اس کے بعد نہ صرف یہ کہ موریہ حکومت کا خاتمہ ہونے لگا بلکہ بودھ دھرم کو جو عروج حاصل ہوا تھا وہ بھی زوال آمادہ ہونے لگا، کیونکہ اس میں کئی فرقے پیدا ہوگئے اور رفتہ رفتہ لوگ پھر اپنے پرانے دھرم پر مائل ہونے لگے۔ بدھ مت کے زوال کا ایک خاص سبب یہ بھی ہوا کہ اس میں روح اور کائنات کے خالق کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس کمزوری سے برہمنوں نے فائدہ اٹھایا اور بودھ مت کے اثرات کو ختم کر دیا۔

تہذیب انسانی اور ہندومت

تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً ۲۰۰۰ سال پہلے آریائی قبیلے ہندوستان میں آئے تو وہ اپنے ساتھ کچھ مذہبی عقیدے بھی لائے۔ وہ مذہبی عقیدے اس ملک کے قدیم باشندوں سے مختلف تھے۔ آریائی قبیلوں نے قدیم باشندوں سے جنگ کی اور فاتح بن گئے۔ آریائی قبیلوں کے مذہبی عقیدوں کی بنیاد عناصر اور دیوتاؤں کی پرستش پر تھی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے عقیدوں کو مستقل شکل دے دی جو ہندومت کے نام سے مشہور ہوا۔ چونکہ ان کو فاتحین کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اس لئے مفتوح قوموں پر سماجی، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے ان کے گہرے اثرات پڑے۔ تاہم ہندومت کا کوئی ایک بانی یا مذہبی رہنما نہ تھا بلکہ اس کے عقائد اور تعلیمات کو آریائی بھجن اور گیتوں کے ذریعے سے پھیلایا گیا۔ بھجن اور مذہبی گیت لکھنے والے رشی منی کہلائے مثلاً ان کی مذہبی کتاب رگ وید میں دیوتاؤں کی شان اجاگر کرنے والے جو بھجن اور گیت شامل ہوئے وہ کسی ایک رشی کی تصنیف نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا اور اس کی تصنیف میں مختلف رشیوں نے حصہ لیا تھا۔

جب آریائی قبیلے وسط ایشیا میں مقیم تھے تو گلہ بانی اور کاشتکاری کرتے تھے۔ بعد میں وہ نئی زمینوں کی تلاش میں دور دور تک پھیل گئے۔ وہ جہاں بھی گئے، کاشتکاری کو اپنی اجتماعی زندگی کی بنیاد بنایا۔ جب وہ وادی سندھ پر قابض ہوئے تو کاشتکاری کے حوالے سے ان کے مذہبی عقائد پر عناصر پرستی جاری رہی۔ سورج، آسمان، بارش، زمین سبھی کو انہوں نے دیوتاؤں کا روپ دیا۔ قدیم باشندوں سے ان کی خونریز جنگیں

ہوئی تھیں۔ اس لئے جنگ کے دیوتا کو انھوں نے بڑی اہمیت دی اور اس کی شان میں بہت سے بھجن اور گیت موزوں کئے۔ اس جنگی دیوتا کے لئے قربانیاں بھی دی جانے لگیں۔

مجموعی طور پر ان کے اس مذہب کو ویدک دھرم کہتے ہیں۔ ویدک زمانے میں دیوتاؤں کی پرستش کا مقصد دنیا کی خوش حالی حاصل کرنا تھا، لیکن جب وہ ہر طرح خوشحال ہو گئے تو یہ تصور پیدا ہوا کہ کوئی ایسی غیبی ہستی بھی ہے جس نے انسان اور دیوتاؤں کی تخلیق کی ہے جو انسان کی روح پر اس کے مرنے کی حالت کے بعد بھی اختیار رکھتی ہے اور جو انسان کے اعمال کو پرکھ کر سزا و جزا بخشنے کی مالک ہے۔ جن کتابوں میں ان باتوں کی وضاحت ہے، ان کو اپنیشد کہا گیا اور یہ نثر میں لکھی گئیں۔

تہذیبی ارتقاء کے مختلف ادوار میں پرستش کے لئے دیوی دیوتاؤں کی تجسیم کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہندوستان میں آریائی قبیلوں نے ہندو مت کی جو بنیاد ڈالی اس میں بھی یہ دیومالائی پہلو نمایاں رہا۔ شروع شروع میں تو دیوتاؤں کو خوش رکھنے، قربانیاں دینے اور دیوتاؤں کی پوجا کا اہتمام کرنے کی ذمہ داریاں ایک مخصوص گروہ کے سپرد ہو گئیں جو بعد میں برہمن کہلائے۔

اگرچہ ویدک مذہب (ویدک دھرم) میں دیوتاؤں کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ وہ انسانی شکل و صورت کے ہیں اور ان کی بیشتر ضروریات انسانی ضروریات سے ملتی جلتی ہیں، لیکن یہ دیوتا چونکہ عناصر قدرت پر حاوی سمجھے جاتے تھے اس لئے انسانوں نے ان کو اپنے آپ سے بہت اعلیٰ اور ارفع تصور کیا۔ وہ انسانوں کو فائدہ بھی پہنچا سکتے تھے اور نقصان بھی۔ اس لئے انھیں خوش رکھنا بھی ضروری تھا تاکہ فائدے نصیب ہوں اور نقصان سے محفوظ رہیں۔ ان انسانوں کے پیش نظر اس دور میں صرف دنیا کے فائدے تھے۔ موت کے بعد کی زندگی کا تصور اس ابتدائی دور میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ تناسخ الارواح کا عقیدہ جو بعد میں ہندو مت کے فلسفے میں شامل ہوا، اس وقت تک وجود میں نہیں آیا تھا۔

ویدک ادب سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ہندو مت کی ابتدا از دیوتاؤں پر عقیدہ رکھنے سے ہوئی، لیکن اس کی بتدریج ترقی کے ساتھ ساتھ کائنات کی تخلیق، خالق کا تصور

اور زندگی کے مقاصد کی بھی وضاحت ہو تی گئی۔ تاہم ان کے مذہبی فلسفے پر برہمنوں کی اجارہ داری قائم رہی۔ انھوں نے اس اجارہ داری کو اپنی برتری اور اپنے گروہی مفادات کے لئے استعمال کیا۔ اس طرزِ عمل سے ہندو معاشرے میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں، لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ مختصراً ان کے اجتماعی عقائد کی نوعیت یہ تھی کہ اس زمانے میں عناصرِ قدرت کو دیوتاؤں کی قدرت سمجھ کر ان کی مختلف صورتیں بنا کر پوجا جاتا تھا۔ ان کو خوش کرنے کے لئے گھی، دودھ، مکھن، اناج اور گوشت کی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ عبادت اور قربانیوں کی ذمہ داری خاندان یا قبیلے کے سربراہ کے سر تھی جسے بعد میں برہمنوں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ پیشوں کے اعتبار سے ذاتوں کی تقسیم ہونے لگی۔ لیکن شروع شروع میں یہ تقسیم معاشرتی ناہمواری اور سماجی اونچ نیچ کا سبب نہ بنی تھی بلکہ آریائی قبیلوں کی اجتماعی پیش رفت کا ذریعہ تھی۔

سامری تہذیب

دجلہ وفرات کی وادی میں جس قوم نے سب سے پہلے بستیاں آباد کیں، وہ سامری قوم تھی۔ جو نہ سامی النسل تھی اور نہ آریائی نسل سے اس کا تعلق تھا بلکہ اس کی ایک الگ تھلگ نسل تھی۔ وہ لوگ شمال مشرق کے پہاڑوں سے اُتر کر دریائے فرات کے کناروں پر آباد ہو گئے تھے۔ زمانۂ حال میں سامری تہذیب کے جو آثار ملے ہیں، ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سامری تہذیب مصر اور وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیبوں سے بہت ملتی جلتی تھی۔ ان کے درمیان تجارتی اور ثقافتی تعلقات بھی قائم تھے۔ سامری چوں کہ دریائے فرات کے کنارے آباد ہوئے تھے اس لئے ابتداء میں انہوں نے کاشت کاری اور ماہی گیری کو ذریعۂ معاش بنایا۔ لیکن جب ان کے گاؤں شہروں میں تبدیل ہو گئے تو باقاعدہ شہری ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ابتداء میں جو شہر بسائے گئے وہ اس وادی کے نچلے حصے میں تھے جہاں دجلہ وفرات ایک دوسرے کے متوازی بہتے ہیں اور پھر مل کر خلیج فارس میں گر جاتے ہیں۔

دجلہ وفرات کے اوپری حصے میں شہروں کا قیام بعد میں ہوا اور اس طرح یہ علاقہ زیریں اور بالائی حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ جس طرح وادیٔ نیل میں مصر کے دو حصے ہو گئے تھے۔ دونوں حصوں میں الگ الگ شہر آباد ہوئے اور ہمہ جہتی ترقی ہونے لگی۔ جو شہر وادی کے نچلے حصے میں آباد ہوئے تھے ان کے چاروں طرف حفاظتی فصیلیں تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ مختلف شہری ریاستیں آپس میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں۔ سامری لوگ بڑے جنگجو تھے اور جنگ کرنا ایک عام سی بات تھی۔ انہوں نے فنونِ جنگ اور جنگی آلات پر خصوصی توجہ دی۔ جنگ کا ایک بڑا مقصد

زیادہ سے زیادہ قابل کاشت زمینوں پر قبضہ کرنا تھا۔ اس طرح شہری ریاستوں میں مستقلاً خانہ جنگی رہی۔ یہ سلسلہ ۲۹۲۰ ق م سے ۲۲۸ ق م یعنی تقریباً ساڑھے چھ سو برس تک چلتا رہا۔ پھر اس خانہ جنگی کا سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب ایک طاقتور حکمران سارا گون اوّل (Saragon I) نے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اور پوری نازیں ریاستوں کا وہ مطلق العنان حکمران بن بیٹھا۔ پھر اس نے بیرونی علاقوں پر فوج کشی کی اور ایلیم وشام کے ملکوں پر بھی فتح حاصل کر کے مضبوط سامری سلطنت قائم کی۔ سامری بادشاہت جیسی اس کے زمانے میں عروج کو پہنچی، بعد میں وہ بات اس کا کوئی جانشین پیدا ہی نہ کر سکا۔

سارا گون اوّل نے بڑے بڑے شہنشاہوں کی طرح حکومت کی۔ مفتوحہ علاقوں میں گورنر مقرر کئے جو اس کی ہدایت کے مطابق حکومت کرتے تھے۔ لیکن جب سارگون اوّل کی آنکھیں بند ہوئیں تو اس کے جانشینوں کے دور میں ہر طرف بغاوتیں سر اٹھانے لگیں۔ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ پھر بیرونی حملہ آور سوا سو سال تک حکمران رہے۔ انہوں نے سامری تہذیب کو اپنا لیا۔ مگر آخر کار ایک سامری گورنر نے بیرونی حملہ آوروں کا زور ختم کر کے دوبارہ سامری برتری کو زندہ کر دیا۔

وادیٔ دجلہ و فرات میں سامری تہذیب کا عروج و زوال ایک وسیع موضوع ہے۔ جس کی ابتدائی جھلکیاں شروع میں پیش کی جا چکی ہیں۔ ۲۲۸۰ ق م میں اُر کے حکمران نے سابقہ حکمران کے خلاف بغاوت کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ وہ پچاس برس تک حکومت کرتا رہا اور فتوحات کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ اس کے زمانے میں زراعت کو فروغ ہوا۔ آب پاشی کے لئے نہروں کی کھدائی ہوئی۔ ہر جگہ مندر تعمیر ہوئے۔ گویا ملک میں خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ لیکن اس کے بعد وہی روایتی بغاوتیں شروع ہو گئیں اور آخر کار سامری حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

سامری حکومت کی بنیادیں مذہب پر قائم تھیں۔ اصل حکمرانی دیوتاؤں کی مانی جاتی تھی اور بادشاہ ان دیوتاؤں کے اوتار تھے۔ ابتداء میں شہری ریاستوں کا حکمران مندر کا پروہت ہوتا تھا۔ بعد میں بادشاہوں نے بھی خود کو دیوتاؤں کی طرح منوایا۔ وہ ایسے محلوں میں رہتے تھے جہاں زبردست پہرہ لگایا جاتا تھا۔ بادشاہ بہت کم باہر نکلتا تھا۔ حکومت کا کام گورنر چلاتے تھے یا وہ قبائلی سردار جو شاہی فوج کے لئے سپاہی مہیا کرتے تھے۔ بادشاہ اپنے گورنروں اور ٹیکس وصول کرنے والے افسروں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ اس کے جاسوس ساری خبریں دیتے تھے۔ ٹیکس، اشیاء اور غلّے کی صورت میں وصول کیا جاتا اور شاہی گوداموں میں رکھا جاتا۔ ٹیکس کا ریکارڈ مٹی کی تختیوں پر ہوتا تھا۔

مجموعی طور پر سامری حکومت کے بھی وہی خدوخال تھے جو مصری حکومت کے۔ لیکن دجلہ و فرات کی سامری حکومت میں مصری حکومت جیسا استحکام ناپید رہا۔ جس کا خاص سبب خانہ جنگی تھا۔ پھر بھی طاقتور سامری بادشاہوں نے جو مذہبی پیشوا بھی تھے، اپنے دورِ حکومت میں سامری تہذیب کو عروج بخشا۔ ویسے جنگ وجدل کا شوق سامریوں کی گھُٹی میں پڑا تھا جس کے لئے انہوں نے جنگی سازو سامان اور فوجی طاقت پر خصوصی توجہ مرکوز رکھی۔ جنگ میں کلہاڑی، خنجر، نیزے بھالے اور کئی دوسرے ہتھیار استعمال ہوتے تھے۔

جنگ وجدل کے ساتھ ساتھ کاشت کاری، تجارت اور صنعت پر بھی دھیان دیا گیا۔ تجارت میں پہلے اشیاء کے بدلے اشیاء کا لین دین ہوتا تھا۔ بعد کو زرِ مبادلہ کے طور پر چاندی دی جانے لگی۔ مٹّی کی تختیوں پر حساب کتاب بھی رکھا جاتا تھا۔ بابل کے مشہور حکمران حمورابی نے حکومت اور سامری سماج کے قوانین بھی بڑی عمدگی سے بنائے تھے جو آج تک "قوانینِ حمورابی" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

سامری تہذیب میں لکھنے پڑھنے اور باقاعدہ تعلیم کا رواج بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ سامری طرزِ تحریر میں تقریباً ساڑھے تین سو نشانیاں تھیں۔

تعلیم کا انتظام مندروں میں کیا جاتا تھا اور مندروں کے پروہت استاد تسلیم کئے جاتے تھے۔ گرامر، حساب اور اوزان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد کی تعلیم کو خصوصی اہمیت دی جاتی تھی۔

آشوری تہذیب

دریائے نیل اور دریائے سندھ کی وادیوں میں جو قدیم تہذیبیں جلوہ آرا ہوئی تھیں کچھ ویسا ہی رنگ و آہنگ دجلہ و فرات کی وادی میں پروان چڑھنے والی تہذیبوں کا بھی تھا۔ لیکن ایک نمایاں فرق یہ رہا کہ دجلہ و فرات کی وادی جو سب سے پہلے ساری تہذیب کا گہوارہ بنی تھی۔ اس کے بعد بابلی تہذیب کا مسکن رہی اور پھر بابلی تہذیب کے زوال نے آشوری تہذیب کے لئے راہ ہموار کی۔ ہوا یہ کہ بابلی سلطنت کے زوال اور آشوری سلطنت کے عروج یعنی ۵۷۷ ق م تک ایک ہزار سال کے درمیانی زمانے میں وادیٔ دجلہ و فرات مختلف چھوٹی قوموں کے عروج و زوال کے تماشے دیکھتی رہی۔ عتی، نتیقی، قیسی، آرمینی اور یہودی قومیں ابھرتی رہیں۔ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار بھی ہوئیں اور مسلسل و متواتر پوری وادی میں سیاسی انتشار، ابتری اور خانہ جنگی کا سماں رہا۔

یہ وہ پرآشوب دور تھا جب بابل کی عظمت بالکل ختم ہو گئی تھی اور ادھر وادیٔ نیل میں مصر کا دورِ شہنشاہیت آگے قدم بڑھا رہا تھا۔ مصری شہنشاہوں کی فوجیں آس پاس کے ملکوں میں بھی معرکے سر کر رہی تھیں۔ دجلہ و فرات کی وادی بھی ان کی معرکہ آرائیوں سے محفوظ نہ تھی۔ اس دورِ انحطاط میں بابل سے دو سو میل دور شمال کی جانب دریائے دجلہ کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کا نام آشور دیوتا کے نام پر تھا جو جنگ و جدل کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ اس شہر کے باشندے آشوری کہلاتے تھے جو خالص سامی النسل نہ تھے بلکہ ان کا نسلی تعلق ساری قبائل سے بھی تھا اور انہوں نے ساری تہذیب کو اپنا لیا تھا۔

آشوری بنیادی طور پر جنگجو فطرت رکھتے تھے۔ انہوں نے مجبوراً بابل کی بالادستی

قبول تو کرلی تھی مگر وہ ہر طرح آزاد رہنا چاہتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی طاقت کو بڑھاکر آشور شہر کی ریاست کو بڑھایا اور آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ پھر ۹۱۰ ق م میں آشوریوں کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے بابل پر قبضہ جمالیا۔ مگر یہ قبضہ دیرپا ثابت نہ ہوا کیونکہ آرمینیوں نے اسے روک کر خود اپنا اقتدار قائم کیا۔

آشوریوں نے ہمت نہ ہاری اور ان کے حکمراں برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ ان کو پوری طرح وادئ دجلہ وفرات میں حکمرانی حاصل ہو جائے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال تک آرمینیوں اور فنیقیوں سے ان کی خونریز جنگیں ہوتی رہیں اور آخرکار انہوں نے دجلہ وفرات کی وادی اور مشرقی ایشیاء کے علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرکے ایک نئی تہذیب کو فروغ دیا جو ساری تہذیبوں سے مستعار لینے کے باوجود کافی مختلف تھی۔ آشوریہ کے جس حکمراں نے آشوری سلطنت کی بنیادیں مستحکم کیں اس کا نام تغلت پلیزر سوم (Tighlath Pilesar III) تھا جس نے ۷۵۰ ق م میں بابل فتح کیا۔

آشوری تہذیب کو بابلی تہذیب جیسا شاندار بنانے کا کام جس حکمراں نے کیا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس نے جب ۷۵۰ ق م میں بابل کو فتح کرلیا تو اپنی فتوحات کے لئے وہاں ایک عالیشان کتبہ لگوادیا جس پر یہ عبارت کندہ کرائی "میں طاقتور حکمراں اور مغلوب نہ ہونے والی فوجوں کا بادشاہ ہوں۔ دنیا کے چاروں کونوں کا مالک، بادشاہوں کا بادشاہ، خداوندوں کا خداوند۔ میں وہ ہوں جس نے سیلاب کی طرح دشمنوں کے ملکوں کو فتح کیا اور "خداوند آشور" کی مدد سے اپنا کوئی دشمن باقی نہ چھوڑا۔ میں نے آشور کے تمام دشمنوں کو اپنا مطیع بنالیا" اس کتبے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس شان کا حکمراں ہوگا جس نے بابل کی فتح کے بعد شام اور فلسطین کے علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس کی موت کے بعد بیٹا حکمراں ہوا لیکن وہ ایک جنگ میں مارا گیا۔ پھر آشوری سپہ سالار نے حکومت پر قبضہ کیا اور سابقہ حکمراں سارگون کے نام پر اپنا نام سارگون دوم رکھ کر فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہودیوں کے شہروں پر تسلط قائم کرکے

یہودی قبیلوں کو غلام بنایا اور ان کی طاقت کو بالکل ختم کر دیا۔ فوجی طاقت کو انتہائی عروج پر پہنچایا۔ سلطنت کی حدیں ایک طرف مصر اور دوسری طرف ایران کی سرحدوں کو چھونے لگیں۔ پھر سارگون دوم نے نینوا کے قریب اپنے نام کا ایک شہر سارگون آباد کیا۔ سب سے اونچی سطح پر بہت بڑا محل بنوایا جس میں دو سو سے زیادہ آراستہ و پیراستہ کمرے تھے اور ان کمروں کی دیواروں پر اس نے اپنی جنگوں کی تصویریں بنوائی تھیں۔ محل کے تمام دروازوں پر بہت بڑے بڑے مجسمے نصب کرائے تھے جو فنِ تعمیر کا شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔ سارگون دوم کو ۷۰۵ ق م میں قتل کیا گیا۔ اس کے بعد سارگن کے بیٹے نے اپنے باپ سے بھی زیادہ بہادری دکھائی اس کا نام سینا چرب تھا۔ فتوحات کا دائرہ بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں تک وسیع ہو گیا۔ وہ مصر پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن فوج میں خوفناک بیماری پھیل گئی۔ اس عرصے میں بابل نے بغاوت کر دی۔ اس نے بغاوت پر قابو پالیا۔ شہر کو آگ لگا دی۔ نہروں میں شگاف ڈلوا کر پانی کھلوا دیا تاکہ پوری آبادی غرقاب ہو جائے۔

سینا چرب کا شاندار کارنامہ شہر نینوا کی تعمیرِ نو سے عبارت ہے جسے اس نے اپنا دارالحکومت بنایا۔ خوبصورت محلوں، ہرے بھرے باغات اور انتہائی شاندار تعمیرات کی موجودگی سے نینوا کا شمار خوبصورت ترین شہروں میں ہونے لگا اور وہ ایک منفرد تہذیبی مرکز بن گیا۔

سینا چرب آشوری سلطنت کا سب سے بڑا اور باصلاحیت حکمراں ثابت ہوا۔ اس نے ۲۴ سال حکومت کی اور اپنے دورِ حکومت میں آشوری سلطنت کو ایشیا کی سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ منظم سلطنت بنایا۔ اسی لحاظ سے آشوری تہذیب نے بھی وہ خدوخال نمایاں کئے جو مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔

بابلی تہذیب

جب وادیٔ دجلہ وفرات میں اب سے قریب قریب چار ہزار برس پہلے سامری حکمرانوں کی خانہ جنگی کے نتیجے میں سامری حکومت نے دم توڑ دیا تو سامی النسل قبیلوں نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی جسے بابلی تہذیب کہا جاتا ہے۔

سامی النسل عامری قبیلے نے جو شام سے دریائے فرات کے کنارے آکر آباد ہو گیا تھا۔ ۲۰۵۰ ق م میں ایک چھوٹے سے شہر بابل پر قبضہ کر لیا۔ عامری قبیلے نے سامری قبیلوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا اور رفتہ رفتہ اپنی طاقت بڑھاتے رہے۔ ان کے مقابلے میں ایلمی قبیلے بھی تھے جن سے ان کی جھڑپیں اور جنگیں ایک صدی تک ہوتی رہیں۔ رہی سہی سامری سلطنت مشرق کی جانب سے ایلمی حملہ آوروں اور مغرب کی جانب سے عامری حملہ آوروں کے نرغے میں آگئی تھی اس میں طاقت نہ رہی اور ختم ہو گئی۔

عامری قبیلوں میں حمورابی جیسا مدبر اور فاتح پیدا ہوا۔ اس کے برسرِ اقتدار ہوتے ہی ایلمیوں پر شدید حملے شروع کر دیے اور ۲۰ سال برسرِ پیکار رہنے کے بعد ان کو پہاڑوں کی جانب بھگا دیا۔ پھر اس نے شہر بابل کو اپنی حکومت کا دارالحکومت بنایا اور ایک منظم و مستحکم سلطنت قائم کی۔ اس طرح بابل ایک نئی تہذیب کا مرکز بن گیا۔

حمورابی نے ۴۲ سال تک بڑے شاندار طریقے پر حکومت کی۔ اس کے دورِ حکومت کے جو آثارِ قدیمہ پائے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطنت کے تمام اہم کاموں کی خود نگرانی کرتا تھا۔ اپنے اہلکاروں سے مقامی گورنروں کے نام خطوط

لکھواتا جن میں انتظامی احکامات ہوتے۔ گورنروں سے جو اطلاعات موصول ہوتیں وہ اس کا سکریٹری پڑھ کر سناتا۔ حمورابی کے وہ احکامات تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت پورے نظام حکومت پر حاوی تھی پچاس سے زیادہ خطوط جو ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو ملے ہیں۔ ان میں رشوت کی روک تھام، ٹیکسوں کی وصولیابی، مندروں کے انتظامات اور طغیانی کے بعد دریاؤں اور نہروں کی صفائی کے احکامات درج ہیں۔

حمورابی کا ایک بڑا کارنامہ یہ رہا کہ اس نے امورِ سلطنت کا ایک تاریخ ساز قانون نامہ ترتیب دیا تھا۔ جسے موجودہ صدی کے شروع میں فرانسیسی ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے دریافت کیا۔ یہ قانون نامہ ایک بہت بڑے پتھر کی سِل پر کندہ ہے۔ اوپر حمورابی کی تصویر ہے۔ وہ سورج دیوتا سے قوانین حاصل کر رہا ہے۔ اس پر یہ بھی تحریر ہے کہ "وہ احکاماتِ انصاف جنھیں شہنشاہ حمورابی نے جاری کیا۔

حمورابی قانون نامہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں مندروں اور شہروں اور نہروں کا ذکر ہے، دوسرے میں عدل و انصاف اور نظم و ضبط کے قوانین اور تیسرے حصے میں سزا و جزا کا تذکرہ ہے۔ مجموعی طور پر حمورابی نے اپنی اور اپنے کارناموں کی تعریف کے پہلو نمایاں رکھے ہیں۔

قانونِ قدرت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پردۂ غیب سے ایسی ہستیوں کو نمودار کرتا ہے کہ جو نوعِ انسانی اور حیات و کائنات کے لئے ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیتے ہیں۔ اور تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے مرقوم ہو جاتا ہے۔ بابلی تہذیب کو اُجاگر کرنے میں ایسے ہی عظیم کارنامے حمورابی نے یادگار چھوڑے ہیں۔ خصوصاً عدل و انصاف کے سلسلے میں وہ بہت سخت گیر تھا۔ اس نے انصاف کے لئے "آنکھ کے بدلے آنکھ" اور "دانت کے بدلے دانت" کا اصول رکھا تھا۔ مندروں اور محلوں میں چوری کرنا، مندر کی داسیوں کو بہکانا، جھوٹی گواہی دینا، کسی کی اولاد کو اغوا کرنا اور بھاگے ہوئے غلام کو

پناہ دینا سزائے موت دیئے جانے والے جرائم سمجھے جاتے تھے۔ زندہ جلا دینے کی سزا اس کو دی جاتی جو کسی جلتے ہوئے مکان میں لوٹ مار کرتا۔ زنا کاری کی سزا یہ تھی کہ دونوں کو پانی میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ آپریشن کے بعد اگر مریض مرجاتا تو جرّاح کے ہاتھ کاٹنے کی سزا ملتی۔ اگر ڈاکو نہ پکڑے جاتے تو گورنر کو سارا خسارہ پورا کرنا ہوتا۔

"حمورابی قانون" میں مرد اور عورت کے حقوق برابر تھے۔ عورتوں کو آزادانہ طور پر اپنی روزی کمانے کا اختیار حاصل تھا۔ علاوہ ازیں تمام سماجی امور کے بارے میں عدل و انصاف کے تقاضے پورے کئے گئے تھے۔ اسی لئے یہ قانون تاریخِ انسانی کی اہم ترین دستاویز تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ پہلا ضابطۂ قانون تھا جس کے ذریعے حکومت اور معاشرے کی تنظیم کی گئی۔

حمورابی کی سلطنت میں سرحدوں کی حفاظت کے لئے مستقل فوج تھی۔ رعایا کی فلاح و بہبود کا بڑا خیال رکھا جاتا۔ صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کے امکانات روشن تھے۔ دوسرے ملکوں سے بھی تجارت کا دائرہ وسیع تھا۔ تجارتی لین دین کے لئے مخصوص مہریں استعمال ہوتی تھیں۔

حمورابی کے زمانے میں معاشرہ تین طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ اعلیٰ طبقے میں بادشاہ، گورنر، بڑے بڑے افسران، جاگیردار، پروہت، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماہرینِ صنعت شامل تھے۔ متوسط طبقے میں کسان، دستکار اور تاجر تھے۔ تیسرا طبقہ غلاموں اور معمولی ملازموں کا تھا۔ معاشرے کی خاص خوبی یہ تھی کہ ہر طبقے کے لوگ سادہ غذا، سادہ لباس اور سادہ رہن سہن کے پابند تھے۔ عورتیں عام طور پر نقاب رکھتی تھیں۔ بابلی تہذیب جس کی شاندار بنیادیں حمورابی نے رکھی تھیں، زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ حمورابی کی موت کے بعد بابل کا زوال شروع ہوگیا۔ حالانکہ حمورابی کے جانشینوں میں پانچ بادشاہ ہوئے۔ مگر نہ توان میں انتظامی صلاحیت تھی نہ وہ سلطنت کی حفاظت کرسکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشرق کے پہاڑوں سے قیسی قبیلے کے لوگ وادیٔ دجلہ و فرات میں داخل ہونا شروع ہوگئے۔ ادھر شمال سے حتّی قبیلوں نے زور پکڑا۔ لیکن بالادستی قیسی قبائل کو حاصل ہوئی۔ وہ پورے ملک پر چھا گئے اور بابلی تہذیب کا عروج بڑی تیزی سے زوال کا شکار ہوتا گیا۔

آشوری تہذیب کا عروج و زوال

بابل و نینوا کا نام وادئ دجلہ و فرات کی قدیم تہذیبی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آشوری تہذیب بنیادی طور پر بابلی تہذیب ہی کی ارتقائی صورت تھی۔ تاہم اس کے کچھ جداگانہ خدوخال بھی تھے جن کا اندازہ نینوا کے آثارِ قدیمہ سے ہوتا ہے۔

آشوری شہنشاہ سیناچرب نے بابلی شہنشاہ حمورابی کے قوانین سے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ زبردست صلاحیتوں کا منتظم حکمراں تھا۔ اس کا بیٹا اسارہادون (Essarha don) بھی اپنے باپ کی طرح جنگجو اور فتوحات کا شائق رہا۔ اس نے مصریوں پر حملہ کیا کیوں کہ انہوں نے شامیوں کو بغاوت پر اکسایا تھا۔ تین مرتبہ مصر پر فوج کشی کرنے کے بعد اسے بھی آشوری سلطنت کا ایک صوبہ بنا لیا گیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد مصر آشوریوں کے قبضے سے نکل گیا۔ اسارہادون کے جانشینوں نے کافی حد تک آشوری سلطنت کا بھرم قائم رکھا۔

آشوری بنی پال آخری بڑا حکمراں تھا جو نہ صرف فنونِ جنگ کا ماہر تھا بلکہ فنِ تحریر اور کئی علوم پر بھی دسترس رکھتا تھا۔ اس کی ایک شاندار لائبریری تھی جس میں دو لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود تھیں جو مٹی کی تختیوں پر لکھی ہوئی تھیں۔ یہ کتابیں آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے برآمد ہوئیں اور برطانوی عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔ ان کتابوں کی عبارتیں آشوری تہذیب کے علمی، مذہبی اور تہذیبی و تمدنی موضوعات پر روشنی ڈالتی ہیں۔

آشوری شہنشاہیت جنگ و جدل، اور خوں ریزی کی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ مجال نہیں جو کہیں بغاوت سر اٹھائے۔ اگر کسی علاقے میں ایسا ہوتا تو اسے تباہ و برباد کر دیا جاتا۔ سلطنت میں عوامی فلاح و بہبود اور تعمیرات کے ساتھ ساتھ جاسوسی کا بھی

جال بچھا رہتا تھا۔

آشوری بادشاہ دوسرے علاقوں پر بڑی بے رحمی سے حملہ آور ہوتے تھے۔ دشمنوں کو قتل کر کے فتح کی خوشی میں سروں کے منارے کھڑے کرتے تھے۔ ایک شاہی کتبے پر لکھا تھا "میں نے تین ہزار قیدیوں کو زندہ جلا دیا۔ بہت سوں کے ہاتھ، پاؤں ناک اور کان کاٹ ڈالے۔ بہت سے سپاہیوں کی آنکھیں نکال دیں اور شہر کے جوان مردوں اور عورتوں کو ایک ساتھ آگ میں ڈال دیا۔"

دشمنوں کے مقابلے میں آشوریوں کی کامیابی کے تین اسباب تھے۔ پہلا یہ کہ ان کی فوج منظم اور تربیت یافتہ تھی۔ دوسرا یہ کہ فتوحات کے بعد وہ دشمنوں پر کڑی نظر رکھتے اور بغاوت کی سخت ترین سزا دیتے۔ اس لئے مفتوحین بہت ہی خوف زدہ رہتے۔ تیسرا سبب آشوریوں کی کامیابی کا یہ تھا کہ ان کا قائم کردہ نظام صوبائی نظام تھا جس کے گورنروں پر بادشاہ کا حکم چلتا تھا جو مطلق العنان حکمراں ہوتا تھا، جو تمام وسائل پر قابض تھا۔ اس کی بہت بڑی فوج ہوتی تھی اور پوری فوج اسی کے اشارے پر عمل کرتی تھی۔

آشوری حکمرانوں کا نظام حکومت سخت گیری کے اعتبار سے اتنا ظالمانہ تھا کہ ذرا سی بھی مخالفت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کسی عہد کو توڑنے کی سزا عہد توڑنے والے کو زہر پلا کر ہلاک کرنے کی صورت میں دی جاتی اور اس کی بڑی اولاد کو دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے زندہ جلا دیا جاتا۔ سزا کے طور پر جسم کے مختلف حصوں کو کاٹ دینا عام تھا۔ اکثر مجرموں کو زنجیروں سے باندھ کر دریا میں پھینک دیا جاتا تھا۔

آشوری بادشاہوں کی ظالمانہ سخت گیری کے ساتھ ان میں تنظیمی قوت بھی بہت تھی۔ نینوا جیسے خوبصورت دارالحکومت کا قیام، علوم و فنون کی ترقی، لائبریریاں قائم کرنے کا شوق اور تعمیری صلاحیتیں اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ انہوں نے تاریخ نویسی کے فن پر بھی خصوصی توجہ دی۔

آشوری مذہب کی بنیاد خوف پر رکھی گئی تھی۔ دیوتاؤں کے عذاب سے بچنے کے لئے ان کی پرستش کی جاتی، منتر پڑھے جاتے اور قربانی دی جاتی۔ دیوتاؤں میں جنگ کے دیوتا 'آشور' کو سب پر فضیلت تھی۔ مفتوحہ علاقوں میں آشور دیوتا کی پوجا زبردستی کرائی جاتی۔ مندروں کے پروہتوں کے اختیارات صرف پوجا پاٹ تک محدود تھے۔ بادشاہ کو آشور دیوتا کے اوتار کی حیثیت حاصل تھی اور وہ مذہبی سربراہ بھی تھا۔

کارسازِ حقیقی کی قدرت ہے کہ آخر آشوریوں میں وراثت کا جھگڑا کھڑا ہوا اور بھیانک خانہ جنگی ہونے لگی۔ بابلی اور کلدانی قبائل نے متحد ہو کر آشوری سلطنت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مشترکہ فوجوں نے نینوا کی طرف کوچ کیا۔ بڑی تباہی مچی اور ۶۱۲ ق م میں نینوا جیسے خوبصورت شہر کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ نینوا کی تباہی آشوری سلطنت اور آشوری تہذیب و تمدن کی تباہی تھی جس کے بعد صرف کھنڈرات رہ گئے۔

تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ آشوری آندھی کی طرح اٹھے اور وادیٔ دجلہ و فرات پر چھا گئے۔ لیکن بگولے کی طرح بیٹھ بھی گئے۔ آشوری سلطنت کی تباہی اتنی تیزی سے ہوئی کہ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جو سلطنت صرف فوجی طاقت کے سہارے قائم ہوئی تھی، وہ فوجی طاقت کے کمزور ہونے کے بعد ختم بھی مخالف فوجی قوتوں سے ہوئی۔ جس تہذیب کی بنیادیں ظلم و تشدد، قتل و غارت گری اور مفتوحہ ملکوں کی تباہی و بربادی پر رکھی گئیں، وہ تہذیب دوسروں کے ظلم کی تاب نہ لا سکی اور ذرا سی دیر میں موت کی نیند سو گئی۔ لیکن اس مٹی ہوئی تہذیب کے اچھے برے آثار و شواہد آج تک جیتے جاگتے انسانوں اور مہذب انسانوں کے لئے درسِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔

کلدانی تہذیب

وادیٔ دجلہ و فرات میں بابلی تہذیب کے بعد آشوری تہذیب ابھری تھی جس کا مرکز نینوا شہر تھا۔ نینوا کے جنوب مشرق میں ایک نئی قوم ابھر رہی تھی جسے تاریخ میں کلدانی (Chaldean) کہا گیا۔ یہ سامی نسل کے لوگ تھے۔ جنہوں نے "اُر" شہر کے نزدیک اپنی بستیاں بسائی تھیں۔ آشوری دورِ عروج میں یہ آشوریوں کے تابع رہے۔ لیکن آشوریوں کے ظلم و ستم سے تنگ آنے کے بعد بغاوت پر کمر باندھی اور آشوری سلطنت کے دشمن ہو گئے۔ آشوری بادشاہ 'بنی پال' کی موت کے بعد جب آشوری سردار اور حکومت کے دعویدار خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے تو کلدیہ کے فوجی سردار و سالار نابو پلاسر (Nabo Polassar) نے بغاوت کی اور آشوریوں کے باغی گروپ سے فوجی امداد حاصل کر کے نینوا پر حملہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس غارت گری کو آشوریوں نے رائج کیا تھا اب اس کا تلخ مزہ خود ان کو بھی چکھنا پڑا اور نینوا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ نینوا کی تباہی آشوری سلطنت کی تباہی ثابت ہوئی اور اس کی جگہ کلدانی حکومت قائم ہو گئی۔ نابو پلاسر نے بابل کو پھر سے آباد کیا اور دوسری بابلی حکومت کی بنیادیں ڈالیں۔ اس کی موت کے بعد بخت نصر (Nebuchad Nezzar) ۶۰۵ ق م میں تخت پر بیٹھا جو دوسری بابلی حکومت کا سب سے مشہور حکمراں ثابت ہوا۔ اس نے تقریباً ۴۲ برس حکومت کی۔ اور بابل کی شان و شوکت کو از سرِ نو ساری ساری دنیا میں بحال کیا۔ وہ جنگی حکمتِ عملی میں بھی کامیاب رہا۔ شام اور فلسطین پر قبضہ کر کے اس نے یہودیوں کو اپنا باجگزار بنایا۔ دراصل اس نے یہودیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے ۵۸۶ ق م میں یروشلم پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

اور ہزاروں یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے آیا تھا۔ فنیقی شہروں پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا اور مصر کے بادشاہ کو بھی اس نے شکست دے کر اپنا باجگزار بنا لیا۔

ایک طرف وہ اپنی سلطنت کی سرحدوں کو وسعت دے رہا تھا تو دوسری جانب بابل کی شاندار تعمیرِ نو پر بھی پوری توجہ تھی۔ بڑی تیزی سے تباہ شدہ محلوں کی خوب صورت تعمیر جاری تھی۔ مندروں کو دوبارہ بنایا جا رہا تھا جن میں مردوک دیوتا کا مندر سب سے عظیم تھا اور جس کا منارہ چھ سو پچاس فٹ بلند تھا۔ بادشاہ کی کوشش یہ تھی کہ جو محل اور مندر بنیں وہ آشوری عمارتوں سے زیادہ شاندار ہوں۔ اس نے اپنی ملکہ کو خوش کرنے کے لئے محلوں کے درمیان آویزاں یا معلّق باغات (Hanging Gardens) بنوائے جو عجائباتِ عالم میں شمار ہوتے تھے۔ ان باغات میں دریائے فرات سے پانی لایا جاتا تھا۔

بابل کی حفاظت کے لئے شہر کے چاروں طرف اونچی فصیل بنائی گئی جس کے ساتھ ساتھ گہری خندق تھی۔ فصیل پر فوج کا مستقل پہرہ رہتا تھا تاکہ کوئی حملہ نہ کر سکے۔ بابل کو جو عروج اس دور میں ہوا وہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد بابل کی عظمت پھر ماند پڑ گئی اور رفتہ رفتہ ہمیشہ کے لئے تاریخِ پارینہ بن گئی۔

بابل کی عظمت کو کلدانی تہذیب نے جو چار چاند لگائے تھے ۵۳۸ ق م میں وہ سارے چاند گہنا گئے۔ دوسرے حکمراں خاندانوں کی طرح کلدانی بھی خانہ جنگی میں مبتلا ہوئے۔ کسی بادشاہ کو زیادہ دنوں تک تخت پر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ایک کے بعد دوسرا قتل کیے جانے لگا۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ شام اور فلسطین کے علاقوں میں بغاوت ہو گئی۔ بابلی طاقت دم توڑنے لگی۔ وادئ دجلہ و فرات کی سرحدوں پر ایران میں ایک نئی قوم ابھر رہی تھی جو آریائی نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ کلدانیوں نے آشوریوں کے خلاف اس آریائی قوم سے مدد لی تھی۔ اس نئی طاقت کا نام ایرانی مدائنی طاقت تھا جو بابل کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں تھی۔ ۵۳۸ ق م میں ایران کے شہنشاہ

سائرس (Cyrus) نے بابل کی حکومت پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور اس طرح بابل ایرانی سلطنت کا مفتوحہ علاقہ بن گیا۔ پھر وہاں سامی نسل کے لوگوں کی جگہ آریائی نسل کی برتری قائم ہو گئی۔

یہ بے ثباتی تو ازل سے ابد تک رہے گی مگر حقیقت یہ ہے کہ کلدانیوں کے دورِ حکومت میں بابل کی عظمت رفتہ لوٹ آئی تھی جسے آشوریوں نے تباہ و برباد کیا تھا۔ نئے بابل کی تعمیر و ترقی میں پہلے کلدانی حکمران نے واقعی بڑے خوشگوار اضافے کئے۔ علاوہ ازیں بابلی علوم و فنون کی پیش رفت ہوئی خصوصاً علوم ہیئت و نجوم کی جانب کلدانیوں نے خصوصی توجہ دی۔ کلدانیوں میں نجوم پرستی عام تھی۔ ستاروں کے نام پر انہوں نے اپنے دیوتاؤں کے نام رکھے تھے۔ ان کے عقیدوں میں یہ تھا کہ ستاروں کی گردش سے دیوتاؤں کے ارادوں کا علم ہوتا ہے۔ کلدانیوں نے سال کو بارہ مہینوں میں تقسیم کیا اور دن کو چوبیس گھنٹوں میں بانٹا۔ اوزان کے لئے بھی مستند پیمانے مقرر کئے۔

کلدانیوں کے نزدیک کائنات کا خالق مردوک دیوتا تھا۔ باقی تمام دیوتاؤں کو وہ اس کا ماتحت تصور کرتے تھے۔ لیکن سارے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری تھی۔ بت پرستی، ستارہ پرستی اور ارواح پرستی کلدانیوں کے مذہبی عقائد میں نمایاں تھی۔ مندروں کے ناظم و نگران پروہت ہوتے تھے۔ جنہیں خوش کرنے کے لئے کلدانیوں نے بہت سے مندر تعمیر کرائے تھے۔ اور ان مندروں پر چڑھاوے بھی خوب چڑھائے جاتے تھے۔ کلدانیوں نے اپنی رعایا کی خوشحالی کے لئے رفاہِ عامہ کے کام بھی کئے۔ وہ آشوریوں کی طرح سخت گیر نہ تھے۔ مفتوحہ علاقوں پر بھی انہوں نے وہ ظلم نہ ڈھائے جو ان سے پہلے حکمرانوں نے روا رکھے تھے۔

کلدانی تہذیب کا زوال کلدانی سلطنت کے ختم ہو جانے سے ہوا۔ اس کے بعد دجلہ و فرات کی وادی مسلسل انتشار اور بے یقینی کی کیفیت سے دوچار رہی۔ پہلے ایرانی تہذیب نے غلبہ پایا۔ اس کے اثرات قائم ہو ہی رہے تھے کہ یونانی تہذیب نے اپنا اثر دکھایا۔ مگر کوئی تہذیبی دور دیرپا ثابت نہ ہوا۔ تہذیب و تمدن کے قافلے آتے جاتے رہے۔ ان کے سفر طویل تھے اور قیام مختصر۔

ایرانی تہذیب

قدیم دنیا کے لوگ دو بڑی نسلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک نسل سامی قبیلوں کی تھی جو دجلہ و فرات کی وادی میں بس گئے تھے۔ دوسری نسل آریائی قبیلوں کی تھی جو پہلے وسط ایشیا میں آباد تھے لیکن بعد میں ایشیا اور یورپ کے کئی علاقوں میں پھیل گئے۔ آریائی نسل کے لوگ تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جہاں کہیں ان کو زندگی کی بنیادی چیزیں حاصل ہوتیں، کچھ عرصے وہیں قیام کرتے۔ وسط ایشیا ان کا پہلا مسکن تھا۔ پھر آبادی بڑھی تو وہ تلاش معاش میں ادھر ادھر نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ قبیلے بحیرۂ کیسپین کے آس پاس بس گئے جو دو ہزار ق م میں دو قبیلوں کے طور پر وہاں سے ہجرت کر گئے۔ ایک قبیلہ جنوب مشرق کی جانب گیا اور ان ملکوں میں آباد ہوا جو بعد میں ایران اور ہندوستان کہلائے۔ دوسرا قبیلہ مغرب کی طرف کوچ کر گیا جو یونان اور اٹلی میں آباد ہوا۔

آریاؤں کا جو قبیلہ وسط ایشیا سے کوچ کر کے جنوب مشرق کی طرف آیا، اس نے اپنے نام کی رعایت سے جو خطہ پہلے آباد کیا اس کا نام ایران رکھا بعد کو وہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے جو خلیج فارس کے شمال مغرب میں بسے وہ میڈی (Medes) کہلائے اور جو شمال مشرق میں آباد ہوئے وہ فارسی (Persian) کہے گئے۔ آگے چل کر انھوں نے اپنی سلطنتوں کی بنیادیں ڈالیں اور تہذیب کے ایک نئے سفر کا آغاز کیا۔

ابتدا میں ان کا طرز حکومت بہت سادہ رہا اور قبائلی سردار حکومت کرتے رہے۔ لیکن ایک ہزار سال قبل مسیح کے بعد میڈیوں نے بادشاہت قائم کی جو آریائی نسل کے لوگوں کی پہلی بادشاہت تھی جو مشرق میں قائم ہوئی اور اس بادشاہت کی سرحدیں آشوری سلطنت سے ملنے لگیں۔ اس لئے آشوری

فوجیں حملہ آور ہوتی رہیں اور آخر کار اپنی حکومت کو بچانے کے لئے میڈیوں نے وادیٔ دجلہ وفرات کے آشوریوں کا باجگزار ہونا قبول کر دیا اور تقریباً سو سال تک وہ آشوری سلطنت سے دبے رہے لیکن فارس پر میڈیوں کی برتری قائم ہو گئی تھی اور ساتویں صدی قبل مسیح میں انھوں نے فارس پر قبضہ کر کے اپنی ایک بڑی ریاست بنائی تھی۔ اسی زمانے میں آشوری سلطنت پر زوال آ گیا اور میڈیوں کو آشوریوں کے اثرات سے آزادی مل گئی۔ پھر آشوریوں سے ان کی طویل جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھوں نے آشوریوں کے خلاف کلدانیوں کی مدد کی اور قدیم تاریخ میں پہلی مرتبہ آریائی فوجیں دجلہ وفرات کی وادی میں داخل ہوئیں۔ اس طرح ان کو شاندار بابلی تہذیب سے شناسائی حاصل ہوئی اور ان کے حکمراں سائکرس (Cyaxares) نے آس پاس کے علاقوں پر فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں فارس کی ایک چھوٹی سی ریاست انشان (Anshan) زور پکڑنے لگی اور تین سال میں میڈی سلطنت پر بھی قابض ہو گئی۔ اس کے حکمراں کا نام سائرس تھا جسے کیخسرو بھی کہتے ہیں۔

سائرس ۵۲۹ ق م میں فارس اور میڈیا اقتدار حاصل کر کے ایک بڑی سلطنت کا حکمراں بنا جو دراصل ایرانی شہنشاہیت کی بنیاد ثابت ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی سرحدیں ایشیا، یورپ اور افریقہ کے علاقوں تک پھیل گئیں اور دوسری سلطنتوں کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ بھی مغلوب نہ ہو جائیں۔ اس لئے ان کے حکمرانوں نے متحدہ محاذ بنا کر سائرس کے حملوں کو روکا مگر کامیابی نہ ہوئی اور سائرس کا فتوحات کا دائرہ وادیٔ دجلہ وفرات تک پھیل گیا۔ بابل کی فتح کے بعد اس نے یروشلم کے یہودیوں کو بھی کلدانیوں کی غلامی سے آزاد کر کے انھیں یروشلم بھجوا دیا۔ اس طرح فلسطین سے اس کے تعلقات مستحکم ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے سورۂ کہف کی تفسیر میں سائرس کو ذوالقرنین ثابت کیا ہے اور اس میں وہ خوبیاں بتائی ہیں جو قرآن مجید اور توراۃ میں ذوالقرنین سے متعلق ہیں۔

بابل کی فتح کے ۹۰۰ سال بعد ۵۲۹ ق م میں سائرس شمالی ایران کے قبائیلیوں سے جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ لیکن اس کی موت ایرانی شہنشاہیت کے خاتمے کا باعث نہیں ہوئی۔ اس کا بیٹا کیقباد ایران کے تخت پر بیٹھا اور اس نے ایرانی سلطنت کی حدود کو مزید بڑھایا۔ وادیٔ دجلہ وفرات پر ایرانیوں کا قبضہ ہونے کے بعد مصر کی سرحدیں ایرانی سلطنت کی سرحد سے ملنے لگیں۔ اگر جنوب میں کوئی ملک تھا تو وہ مصر تھا جسے فتح کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا کیقباد نے مصر پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔

اس طرح ایرانی سلطنت کی سرحدیں بحیرۂ کیسپئین سے لے کر دریائے نیل کی وادی تک پھیل گئی تھیں۔ لیکن کیقباد کو مصر کی فتح کے بعد اتنا غرور ہوگیا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا جس کے نتیجے میں درباریوں اور عزیزوں نے سازش کر کے اسے بھی قتل کر دیا۔

کیقباد کے بعد خانہ جنگی کا سخت خطرہ تھا اور کچھ عرصے تک ایران بغیر کسی حکمراں کے رہا لیکن ۵۲۱ ق م میں ایرانی امرا نے متفقہ طور پر دارا کو ایران کا حکمراں تسلیم کرلیا جو بعد میں جلیل القدر بادشاہ ثابت ہوا۔ اس نے پہلے تو مفتوحہ علاقوں کی بغاوتوں کو ختم کیا۔ اپنی فتوحات کا حال ایک تین سو فیٹ اونچی چٹان پر فارسی، بابلی اور ایلمی زبان میں کندہ کرایا تاکہ لوگ اس کے کارناموں سے واقف ہوسکیں۔ پچھلی صدی میں اس چٹان کی عبارتوں کو پڑھ کر یورپ کے تاریخ دانوں نے بابلی اور ایلمی زبانوں کا علم حاصل کیا۔

دارا کے سامنے دو اہم مقاصد رہے پہلا یہ کہ ان ملکوں اور علاقوں کو فتح کرے جہاں سے سلطنت پر حملے کا امکان ہوسکتا تھا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ انتظام سلطنت کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ ان مقاصد میں وہ کافی حد تک کامیاب رہا اور اس نے ایرانی شہنشاہیت کو وہ عروج بخشا کہ تاریخ میں اس کا ذکر دنیا کے عظیم حکمرانوں کی صف میں شامل کیا جاتا ہے۔

ایرانی شہنشاہیت

ایرانی شہنشاہیت کی بنیاد سائرس یا کیخسرو نے رکھی پھر اس کے بعد کیقباد نے اسے مزید تقویت دی۔ اور پھر دارا جیسا شہنشاہ پیدا ہوا جس نے ایرانی سلطنت کی حدیں جو پہلے ہی بحیرۂ کیسپین سے لے کر دریائے نیل کی وادی تک پھیل گئی تھیں۔ افغانستان اور ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں تک بڑھا دیں۔ یہی نہیں بلکہ ۵۱۶ ق م میں اس نے درۂ دانیال پہ قبضہ کر کے یورپ میں اپنی فوجیں اتار دیں اور یونانی سلطنت کے کچھ شہروں پر قبضہ کر لیا لیکن جن شہروں پر ایرانیوں نے قبضہ کیا تھا انہیں یونانی خود ہی تباہ کر گئے تھے۔ تمام فصیلوں کو اجاڑ دیا تھا اس لئے سامانِ رسد کی کمیابی نے دارا کو مجبور کیا وہ یونان کے شمالی شہروں سے فوجیں واپس بلا لے۔ لیکن شمالی ساحل کی یونانی نوآبادیوں پر ایرانیوں کا قبضہ رہا اور ان ایرانی فتوحات نے ایران اور یونان کے درمیان مستقل جنگ کا آغاز کر دیا۔

یونانی شہروں نے ایرانی اقتدار کے خلاف بغاوت کی اور ایتھنز کے لوگوں نے باغی شہروں کی مدد کی۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے دارا نے ایک بڑا بحری بیڑا تیار کیا جسے مراتھون کے مقام پر شکست ہوئی۔ اس شکست کا بدلہ دارا کے جانشین زرایکسز (اُردشیر) نے ایتھنز کو فتح کر کے لے لیا اور اس شہری ریاست کو بالکل تباہ کر دیا۔ لیکن یونانی بیڑے نے ایرانی بحری بیڑے کو سلامیز (Salamis) کی جنگ میں بری طرح شکست دی اور یونانی شہروں سے ایرانی اثرات ختم ہو گئے۔

دارا کے بعد اس کا بیٹا اُردشیر تخت پر بیٹھا لیکن وہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور اس میں دارا جیسی خوبیاں نہیں تھیں۔ سلامیز کی ناکامی کے بعد ایران کی رہی سہی فوجی صلاحیتیں بھی ختم ہونے لگیں۔ بادشاہ عیش و عشرت میں غرق تھا کہ ۴۶۵ ق م میں کسی فوجی افسر نے اسے قتل کر دیا۔ اس طرح ایرانی عظمت کے دن ختم ہوئے اور سلطنت پر زوال آ گیا۔ تخت سے ہٹانے کے لئے بادشاہوں کا

قتل ایک عام سی بات ہوگئی۔ فوجی افسران اور درباری امراء کی مرضی سے بادشاہ تخت پر بٹھائے جانے لگے اور یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ قتل ہوئے۔ ان حالات سے یونانیوں نے فائدہ اٹھایا۔ تخت کے ایک دعویدار کی مدد کے بہانے یونانی ایران کے دارالحکومت تک آسانی سے پہنچ گئے لیکن ایرانیوں پر ان کا باقاعدہ تسلط ۳۳۱ ق م میں ہوا جب سکندرِ اعظم کی فوجوں نے ایران پر حملہ کیا اور اسے شکست دی۔ بہرکیف فتح و شکست سے قطع نظر ۱۹۷ سال تک ایرانی شہنشاہیت کا دور دورہ رہا اور اس دور میں ایسے کارنامے بھی ظہور میں آئے جو تاریخ کا ایک اہم باب کہلانے کے حقدار ہیں۔

ایران کی جس مضبوط سلطنت کی بنیادیں سائرس نے رکھی تھیں ان بنیادوں پر عالیشان عمارت شہنشاہ دارا نے کھڑی کی۔ ایران کا شہنشاہ مفتوحہ علاقوں کا حکمراں ہوا مگر فراعینِ مصر اور آشوری بادشاہوں جیسا مطلق العنان نہیں بلکہ اس کو مشورہ دینے کے لئے وزیر، گورنر اور کئی دوسرے عملدار بھی موجود تھے۔

پوری ایرانی سلطنت کو بیس صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا جن کو اندرونی معاملات میں کافی حد تک آزادی میسر تھی لیکن شرط یہ تھی کہ ٹیکسوں کی ادائیگی برابر ہوتی رہے۔ گورنروں کی نگرانی کے لئے خفیہ افسران تھے جو شہنشاہ کے چشم و گوش یعنی آنکھ کان کہے جاتے تھے۔ دارا نے آشوری نظام مواصلات اپنایا تھا سلطنت میں سڑکوں کا جال سا بچھا دیا گیا تھا۔ خبریں اور احکامات لانے لے جانے کے لئے ڈاک کا عمدہ انتظام تھا۔ صوبائی افسروں کی تنخواہیں صوبائی خزانے سے اور مرکزی افسران کی تنخواہیں مرکزی خزانے سے ادا ہوتیں۔ شاہی افواج جس صوبے سے گزرتیں ان کے اخراجات بھی متعلقہ صوبے کے ذمّے ہوتے تھے۔ حالانکہ ٹیکس زیادہ نہ تھے پھر دارا نے رفاہِ عامّہ پر دل کھول کر رقومات صرف کیں۔

شروع میں ایران کا دارالحکومت پرسی پولس (Persepolis) تھا، لیکن بعد میں سُوسا (Susa) ہوگیا جسے بہت ہی خوبصورت شہر بنایا گیا۔

ایرانی سلطنت کی ایک بڑی خوبی یہ رہی کہ اس میں دوسری سلطنتوں کی طرح بغاوتیں بالکل نہیں ہوئیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ انتظام بہت اچھا تھا۔ فوج کا اثر پورے ملک پر چھایا ہوا تھا۔ ایرانیوں نے مفتوحہ علاقوں میں بھی ذمہ داری اور رواداری کی پالیسی کو اپنایا۔ ایرانی اور غیر ایرانی کا فرق

اور امتیاز نہ تھا بلکہ وسیع سلطنت کی رعایا کو ایک ملت تصور کیا گیا۔

ایرانیوں کی عسکری قوت بھی زبردست تھی۔ ایرانی تیر اندازوں کا مقابلہ دشمن کی فوج نہ کر پاتی تھی۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ پیدل فوج کے ساتھ سوار فوج بھی ہوتی تھی جو زیادہ تر ایرانی سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ بڑے بڑے افسر بھی ایرانی ہوتے تھے۔

دارا نے ۳۶ برس حکومت کی۔ اس کا دورِ حکومت، ایران کی قدیم تاریخ میں فتوحات کے لحاظ سے بہت شان دار اور سب سے بہتر تھا۔ اسی لئے تاریخ میں جہاں ایک طرف یونان کے سکندرِ اعظم کا ذکر نمایاں طور پر کیا گیا ہے وہاں دارا کا نام بھی ایک عظیم فاتح اور اعلیٰ حکمراں کی حیثیت میں کیا جاتا ہے۔ اس نے بلند و بالا چٹان پر یہ یادگار عبارت کندہ کرائی تھی " اھورا موزدہ (خدائے خیر) نے میری مدد کی۔ نہ میں خراب آدمی ہوں نہ دروغ گو، نہ میں ظالم ہوں نہ میرے خاندان کا کوئی فرد ظالم ہے۔ میں نے فلاح و بہبود کی خاطر حکومت کی ہے۔" دارا زرتشتی مذہب کا زبردست پیروکار تھا۔

زرتشتی مذہب

قدیم زمانے میں قدرت کے مظاہر کی پرستش عام تھی۔ انسانوں نے اپنی عقل وفہم کے مطابق مظاہرِ قدرت کو دیوتاؤں کی شکل دی۔ بت پرستی اور مندروں میں قربانی کا رواج لوگوں کا معمول بن گیا۔

قدیم آریائی قبیلے جو مذہبی عقائد اپنے ساتھ لے کر اِدھر اُدھر گئے ان میں نیکی اور بدی کے دیوتاؤں کا تصور تھا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ایک ہزار سال پہلے آریائی عقائد میں تبدیلی آئی۔ اس تبدیلی کا اہم کردار زرتشت جیسے انسانوں نے ادا کیا۔

زرتشت کے بارے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا۔ کچھ تاریخ دان اس کا وطن میڈیا بتاتے ہیں اور کچھ آذربائیجان۔ کچھ کہتے ہیں کہ ایک ہزار قبل مسیح میں اس نے اپنے عقیدوں کی تبلیغ کی اور کچھ کا کہنا ہے کہ ۶۰۰ ق م میں اس نے زرتشتی مذہب کی بنیاد رکھی۔ بہرحال تاریخ سے یہ تو ثابت ہے کہ ۵۰۰ ق م میں زرتشتی عقیدے پورے ایران میں پھیل گئے تھے۔ اور ایرانی بادشاہوں نے بھی انھیں قبول کر لیا تھا۔ پھر ایرانی فوجوں کے ساتھ دوسرے ملکوں میں اثرات قائم ہوئے۔

زرتشت کی تعلیمات اس کے انتقال کے کافی عرصے بعد کتابی صورت میں آئی۔ اس کتاب کو زنداوستا (Zend Avasta) کہتے ہیں۔

زرتشت کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں اچھائی برائی کی دو طاقتیں ہیں جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ خیر کی طاقت کا نام اہورامزدا (Ahura Mazda) ہے اور شر کی طاقت کا نام اہرمن (Ahriman) ہے۔

اہورامزدا عقل و دانش کا بھی حاکم ہے اور وہ زرتشت کے نزدیک دنیا کا خالق اور بہت مہربان خدا ہے۔ وہ فرشتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ ان فرشتوں میں سب سے اہم فرشتہ روشنی کا ہے۔ اس کا نام میتھرس (Mithras) ہے۔

زرتشت کی تعلیمات کے مطابق اہورامزدہ کی سب سے بہتر نشانی آگ ہے، جسے ہمیشہ روشن رہنا چاہیئے۔ اسی زرتشت کے پیروکار آتش پرست کہلاتے ہیں اور زرتشتی عبادت خانوں میں صدیوں سے آگ روشن ہے جسے بجھنے نہیں دیا جاتا۔

اہورامزدہ کے مقابلے میں خدائے شر اہرمن ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ دنیا سے خیر اور نیکی کو ختم کرے۔ ہر طرح کی برائیوں کو فروغ دے اور لوگوں کو اچھے اچھے کاموں سے روکے۔

زرتشت کا کہنا تھا کہ جب سے دنیا بنی ہے خیر و شر کی کشمکش جاری ہے اور یہ کشمکش اسی طرح بارہ ہزار سال تک جاری رہے گی۔ آخر میں اچھائی کو برائی پر فتح حاصل ہوگی جو اچھائی کے ساتھ ہوں گے ان کو بہشت میں جگہ ملے گی اور جو برائی کے ساتھی ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے۔

زرتشتی عقائد و نظریات نے قدیم آریائی عقیدوں پر کاری ضرب لگائی۔ مزاحمت بھی کی گئی، مگر ایرانی حکمرانوں کی تائید اور سرپرستی نے زرتشت کو ایران کا پیغمبر تسلیم کر لیا تھا۔ خصوصاً دارا جیسے شہنشاہ نے تو اس سلسلے میں بڑا کام کیا۔

زرتشت کے نزدیک ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھائی اور برائی کی معرکہ آرائی میں کسی ایک کا ساتھ ضرور دے، مگر بہتر یہی ہے کہ انسان اچھائی قبول کرے اور اپنے آپ کو تمام برائیوں سے بچائے۔ وہ اچھائی کے ماننے والوں کے سامنے تین باتیں پیش کرتا ہے: "اچھا خیال، اچھی بات، اچھے کام"۔ وہ برکات خداوندی کے لئے اہورامزدہ کی عبادت کی تلقین کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اہرمن انسان کو گناہوں اور اندھیروں کی طرف بلاتا ہے تاکہ وہ اچھائی کو شکست دے سکے، لیکن انسان کو چاہیئے کہ وہ خود کو گناہوں اور برائیوں سے بچائے تاکہ آخرت میں اس کا انجام بخیر ہو۔

کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں تو زرتشت کو قدیم آریائی مذہب کے پیروکاروں نے بہت پریشان کیا۔ اسے میڈیا میں کوئی کامیابی نہ ہوئی تو وہ مشرقی فارس چلا گیا۔ وہاں لوگوں نے

اس سے عقیدت مندی کا اظہار کیا۔ پھر کسی نہ کسی طرح اس کی رسائی بادشاہ تک ہو گئی۔ شاہی دربار اور محل میں معجزاتی طور پر زرتشت نے کچھ ایسا اثر قائم کیا کہ بادشاہ، ملکہ اور درباری اس کے گرویدہ ہو گئے۔ آگے چل کر فارس کے حکمراں جب ایران کے شہنشاہ ہو گئے تو زرتشتی مذہب بھی پورے ملک نے قبول کر لیا۔ اس طرح خدا کے تصوّر کے ساتھ ساتھ آتش پرستی بھی ایران میں عام ہو گئی اور اس کے اثرات مفتوحہ ممالک میں بھی پھیلے، لیکن ایرانی سلطنت کا زوال ہوا تو زرتشتی عقیدوں کی مقبولیت بھی کم ہونے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ وہی پرانے عقیدے اور بت پرستی کے طور طریقے از سرِ نو زندہ ہونے لگے۔ زرتشتی مذہب پر چلنے والوں کی تعداد میں کمی ہوئی اور یونانیوں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد تو دیوی دیوتاؤں کی پرستش عروج پر پہنچنے لگی۔ پھر جب یونانیوں کے اقتدار نے دم توڑا تو ایرانیوں کے مذہبی عقائد میں توہمات اور جادو ٹونے کے اثرات ہمہ گیر صورت اختیار کر گئے۔ جو لوگ زرتشتی مذہب پر سختی سے کاربند تھے ان کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ البتہ ایران میں اچھی خاصی تعداد آتش پرستوں کی رہی اور جادو ٹونے کا رواج بھی بڑھتا گیا جو آخر کار اس وقت ختم ہوا جب طلوعِ اسلام کے بعد ایران اسلامی مملکت کا حصہ بنا۔

زرتشتی مسلک کے لوگ اب پارسی کہلاتے ہیں۔ کراچی، ممبئی اور دنیا کے کئی دوسرے شہروں میں ان کے آتش کدے اور تہذیبی ادارے موجود ہیں۔

ایرانی تہذیب کا ورثہ

ایران قدیم زمانے میں آریائی قبیلوں کی آماجگاہ بنا اور بہت عرصے تک اس ملک پر آریائی نسلوں کا ہی غلبہ رہا۔ خصوصاً ایرانی شہنشاہیت کے دور میں تو ایرانی تہذیب کا عہدِ زرّیں نمایاں ہوا۔ سائرس، کیقباد اور سب سے بڑھ کر دارا نے ایران کو جس عروج سے ہمکنار کیا تھا وہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور اس کی اہمیت وافادیت میں زرتشتی عقائد و نظریات کا خمیر بھی عہد آفریں کردار کا حامل رہا۔ زرتشتی مذہب میں دو خداؤں کا تصوّر کلیدی حیثیت رکھتا ہے جسے مذاہبِ عالم کی تاریخ میں 'ثنویت' کا نام دیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دیوی، دیوتاؤں کے بتوں کی پُوجا سے نجات دلاکر ایسے خدا کا تصوّر پیدا کرنا جو خیر کی قوتوں کا مظہر ہو، ایک انقلابی تبدیلی تھی۔ زرتشت کی تعلیمات کافی حد تک یہودیت، عیسائیت اور اسلام سے ملتی جلتی ہیں۔ اچھائی کو قبول کرنے اور برائیوں سے بچنے کی تلقین اور اس فیصلہ کن دن کا ذکر جب اچھائیاں، برائیوں پر غالب آجائیں گی۔ علاوہ ازیں جزا و سزا کا آخروی تصور گویا آخرت پر ایمان رکھنے کے مصداق تھا۔

زرتشت کی تعلیمات اور سامی مذاہب کی تعلیمات میں جو بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ سامی مذاہب میں اچھائی اور برائی کی طاقتوں کو مانا تو گیا ہے مگر نوعیت قدرے مختلف ہے یعنی سامی مذاہب میں کائنات کا خالق خیر کے ساتھ شر یعنی شیطان کا بھی خالق ہے۔ خالقِ کُل نے شیطان کو یہ آزادی دی ہے کہ وہ انسان کو نیکی کی راہ سے ہٹانے کے جتن کرسکتا ہے تو بے شک کرے۔ ادھر انسان کو بھی یہ اختیار دیا گیا کہ وہ چاہے تو شیطان کی پیروی کرے یا ان پیغمبروں کی سیدھی سچی باتوں اور نیکی کے کام کو قبول کرے جو وہ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے دنیا میں لائے۔ اس فرق کی بنا پر یہ کہنا درست ہوگا کہ زرتشت کے خدا کا تصوّر اتنا مکمل نہیں تھا جتنا کہ سامی مذاہب میں موجود ہے تاہم یہ بھی بڑی بات تھی کہ زرتشت

نے قدیم ایران کے فرسودہ مذہبی عقائد میں انقلابی ہلچل پیدا کی اور زبردست مذہبی اصلاح کے لئے عوام و خواص کو ایسے عقائد و نظریات پر مائل کیا جو مختلف بتوں کی عبادت اور مندروں کی انسانیت سوز رسومات سے نجات دلا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے قدیم حکمرانوں نے اپنے دورِ اقتدار میں کافی حد تک شرافتِ انسانی کا ثبوت دیا۔ رفاہِ عامّہ کے کاموں میں دلچسپی لی اور وہ ظلم نہ ڈھائے جو مصر فرعونوں اور بابل و نینوا کے حکمرانوں نے ڈھائے تھے۔

دارا کے زمانے میں مصری کلینڈر رائج کیا گیا اور تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ علم جراحی اور دیگر علوم مفیدہ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ عمارت سازی، سنگتراشی، مصوری اور جہاز سازی وغیرہ کی ضروریوں پر توجہ دی گئی۔ محلات اونچی سطح پر بنائے گئے، خوبصورت سیڑھیاں تعمیر ہوئیں اور مختلف رنگوں کی اینٹوں سے آرائش و زیبائش کا کام لیا گیا۔ شاہی محلات کے نزدیک ہی شاہی مقبرے

زرتشتی عقائد نے ایرانیوں کے فکر و عمل میں جو انقلاب برپا کیا تھا اس کے چند نمایاں تہذیبی پہلو ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایرانی شہنشاہوں نے مفتوحہ علاقوں پر مصریوں، آشوریوں اور کلدانیوں وغیرہ کی طرح ظلم و ستم نہیں ڈھائے۔ شہروں اور فصلوں کو برباد نہیں کیا، لوگوں کا بے دریغ خون نہیں بہایا بلکہ عدل و انصاف کی پاس داری برقرار رکھی اور رواداری کا سلوک کیا۔

یہ درست ہے کہ ایرانی شہنشاہیت کے مختصر زمانے میں ایرانی حکمرانوں کو اتنا وقت نہیں مل سکا کہ وہ مختلف علوم و فنون پر خاطر خواہ توجہ دے سکتے۔ البتہ انہوں نے فتوحات کے ساتھ انتظامِ سلطنت اور رعایا کی مشکلات کو دور کرنے کی پر خلوص کوشش کی۔

مفتوحہ علاقوں کے تہذیبی ورثے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایرانیوں نے بابلی زبان کے حروف کو اختیار کیا۔ سرکاری اور تجارتی کاموں میں برتا۔ ہاں یہ تبدیلی کی کہ صرف ۳۹ حروف سے کام چلایا۔ جبکہ بابلی زبان میں تین سو سے زائد علامات تھیں۔

ایرانی حروف سے واقفیت کے بعد ہی قدیم بابلی اور سامری تحریریں موجودہ زمانے میں پڑھی جا سکی ہیں۔ علم و فن کے سلسلے میں ایرانیوں کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بابلی اور سامری علوم کو ختم نہیں ہونے دیا اور بابلی اور سامری تاریخ کو بھی محفوظ رکھا۔

بنائے گئے۔ سائرس کا مقبرہ جو قیمتی پتھروں سے بنایا گیا تھا شکستہ حالت میں اب تک موجود ہے۔ شہنشاہ دارا اور اس کے جانشینوں کے مقبرے پرسی پولس کی پہاڑیوں کو کاٹ کر بنائے گئے تھے۔

ایران کے شہنشاہ اپنے ملک کو زبردست بحری طاقت بنانا چاہتے تھے۔ ان کے بحری بیڑے میں ایک ہزار سے زائد چھوٹے، بڑے جہاز شامل تھے۔ دارا کے زمانے میں جہاز رانی کے لئے اس نہر کو صاف کرایا گیا جو فراعینِ مصر نے دریائے نیل سے بحرِ قلزم تک بنوائی تھی۔ اسی قدیم نہر کو تعمیرِ نو کے بعد اب نہرِ سویز کہا جاتا ہے۔

ایرانیوں نے ڈاک کی ترسیل کا عمدہ انتظام کیا۔ یونانی تاریخ داں ہیروڈوٹس (Hero Dotus) نے لکھا ہے "ڈاک کے ہرکارے کے لئے مقرر کردہ راستوں کو طے کرنے میں نہ برف باری، نہ بارش، نہ گرمی اور نہ راتوں کی تاریکی کوئی بھی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی تھی"

قدیم یونان

قدیم تہذیبی خطوں میں یونان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یونان بحیرۂ روم کے مختلف جزیروں پر مشتمل ہے اور کوئی بڑا ملک نہیں ہے۔ لیکن یونان کی تاریخ و تہذیب کے اثرات ایشیا اور یورپ کی تاریخ و تہذیب پر صدیوں سے قائم رہے ہیں۔

جب آریائی قبیلوں نے وسطِ ایشیا کے علاقوں سے دوسرے ملکوں کا رُخ کیا تو کچھ قبیلے یونان میں بھی آباد ہو گئے۔ آگے چل کر انسان کی تمدنی ترقی میں یونان نے تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے خصوصاً مصر اور ایران کی عظیم سلطنتوں کی تباہی کے بعد یونانی دنیا کی سب سے طاقتور قوم بن کر ابھرے اور ہر طرف چھا گئے۔ یہاں تک کہ سکندرِ اعظم نے پوری دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔

جمہوری نظامِ حکومت کو پہلی مرتبہ یونان ہی میں عملی شکل دی گئی۔ سیاست، فلسفہ، طبعی علوم، فنونِ لطیفہ اور طب میں یونانیوں نے کمال حاصل کیا اور ان علوم و فنون کو ساری دنیا میں پھیلایا۔ یونانی اپنے آپ کو ہیلن (Hellen) کی اولاد بتاتے ہیں اور خود کو ہیلنس کہتے تھے۔ وسیع معنی میں ان کا ملک تھسلی، یونان، ایجیئن جزیروں اور ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقے اور اٹلی و سسلی کی نو آبادیات پر مشتمل تھا۔ لیکن محدود معنی میں صرف جنوبی اور وسطی یونان اور ایجیئن جزیرے اس میں شامل تھے۔

نسلاً یونانی لوگ آریائی تھے جو اب سے چار ہزار برس پہلے یونان میں آنا شروع ہوئے اور انہوں نے یہاں کے قدیم باشندوں یعنی پیلاسیون (Palasgians) پر فتوحات حاصل کیں۔ یہ نئے آنے والے حملہ آور لوہے کے ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ جبکہ یونان کے

قدیم باشندے صرف پیتل کے ہتھیاروں سے کام چلاتے تھے۔ اپنے ہتھیاروں کی برتری اور جنگی صلاحیتوں کے سبب آریائی قبیلے یونان پر قابض ہو گئے اور انھوں نے اپنی حکومتیں قائم کرلیں۔ ایجیئن جزیروں پر قابض ہونے کے بعد انھوں نے رفتہ رفتہ پرانی تہذیب کے آثار مٹا دیئے تاہم اس کام میں ان کو تقریباً ۵۰۰ سال کا عرصہ لگ گیا۔ اس عرصے میں انہوں نے ایجیئن تہذیب اور قدیم باشندوں سے بہت کچھ سیکھا۔

آریائی قبیلے آپس میں بھی جنگ کرتے تھے تاکہ ایک دوسرے پر فتوحات پائیں۔ اس طرح یونان میں کوئی ایک ریاست اور ایک حکومت قائم نہ ہو سکی بلکہ مختلف شہری ریاستیں وجود میں آئیں جو آزاد تھیں مگر جنگ آزما بھی رہتی تھیں۔ اس طرح یونان میں شہری عصبیت کو فروغ ہوا اور عرصۂ دراز تک یونانی قومیت کا احساس پیدا نہ ہو سکا بلکہ وہ مختلف شہروں، قبیلوں اور گروہوں میں بٹے رہے۔

قدیم یونان میں جو شہری ریاستیں وجود میں آئی تھیں ان میں ایتھنز، اسپارٹا، کارنتھ اور تھیبس کی ریاستیں ایسی تھیں جو تاریخ پر اثر انداز ہوئیں۔

ہندوستان کی طرح یونان کی تاریخ بھی مبہم اور غیر واضح رہی۔ تاریخی واقعات کے متعلق مستند شہادتوں کی کمیابی کے سبب تاریخ کا کچھ تسلسل قائم کرنے کے لئے یونانی روایات اور قصوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ خود یونانی اپنی ان مذہبی اور نیم مذہبی کہانیوں کو تاریخ کا حصہ سمجھتے ہیں۔

ٹرائے کی جنگ، جو یونانی بہادروں کے قصّوں کا موضوع بنی کچھ نہ کچھ تاریخی حیثیت ضرور رکھتی ہے۔ لیکن اس جنگ کی وجوہات اور نتائج کو بالکل افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

یونان کے نابینا شاعر، ہومر نے اپنی رزمیہ نظم ایلیڈ (ILIAD) اور اوڈیسی (Odyssey) میں ٹرائے کی جنگوں کو شاعری کا موضوع بنا کر یونان کی تاریخ سے نہ سہی، یونان کی معاشرتی، مذہبی اور رزمیہ زندگی سے دنیا کو روشناس کرایا اور ہومر کی یہ نظمیں دنیا کے ادب پر اثر انداز ہوئیں۔ اسی لئے ان رزمیہ نظموں کو یونانی تاریخ و

ادب میں وہی اہمیت دی جاتی ہے جو ہندوستان کی آریائی تاریخ میں مہابھارت اور رامائن کو حاصل ہے ۔

ایلیڈ کے قصے کی رو سے اسپارٹا کی ملکہ ہیلن کو ٹرائے یعنی ایشیائے کوچک کے شہزادے پارس نے اغوا کر لیا تھا ۔ اس بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے یونانی فوج ٹرائے پر حملہ آور ہوئی اور دس سال تک ٹرائے کا محاصرہ کئے رہی ۔

کہانی کے مطابق دیوتاؤں نے بھی اس جنگ میں شرکت کی ۔ آخر کار ایک شہزادے اوڈیسس کے مشورے سے لکڑی کے بڑے سے گھوڑے میں چھپا کر سپاہیوں کو ٹرائے کے اندر بھیجا گیا ۔ رات کی تاریکی میں یونانی سپاہیوں نے گھوڑے سے نکل کر ٹرائے کی فصیل کا دروازہ یونانی فوج کے لئے کھول دیا ۔ پھر تو یونانیوں نے وہ تباہی مچائی کہ سب کچھ تباہ و برباد کر کے ملکہ ہیلن کی بے عزتی کا انتقام لے لیا ۔

ایلیڈ کا موضوع ٹرائے کے محاصرے اور جنگ کے دسویں سال کے واقعات ہیں جن میں ہومر نے یونانی شجاعت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔

"اوڈیسی" میں ٹرائے کی جنگ کے بعد شہزادہ اوڈیسس کی دس سالہ آوارہ گردی ، پھر اس کی واپسی اور اپنی بیوی کے چاہنے والوں سے انتقام لینے کے واقعات کو ہومر نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے ۔ یقیناً شاعری میں ہر شاعر جوشِ بیاں سے مجبور ہو کر مبالغہ آرائی بھی کرتا ہے ۔ لیکن یونانی ادب کے یہ شاہکار ایک قابلِ ذکر تاریخی ماخذ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں ۔

قدیم یونانی معاشرہ

یونانی تاریخ کا سب سے قدیم ماخذ مشہور و معروف نابینا شاعر ہومر ہے جس کی طویل رزمیہ نظموں سے نہ صرف ہیلن آف ٹرائے کی کہانی ملتی ہے بلکہ یونانی مزاج اور وہاں کی قدیم معاشرت کا سراغ بھی ملتا ہے۔ ہومر نے اپنی نظموں میں یونانیوں کی شجاعت اور جنگی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ سماجی، سیاسی اور مذہبی زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

قدیم زمانۂ شجاعت میں یونانی مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور باہمی جنگوں میں مصروف رہتے تھے۔ کاشتکاری اور گلہ بانی خاص پیشے تھے۔ اس دور میں یونانی معاشرہ چار طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ پہلا طبقہ حکمرانوں اور امرا کا تھا۔ دوسرے طبقے میں کاشتکاری کرنے والے لوگ تھے۔ تیسرا طبقہ آزاد مزدوروں اور محنت کشوں کا تھا مگر چوتھے طبقے میں صرف غلام تھے جو زیادہ تر غیر آریائی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے۔

یونانی معاشرے کی نمایاں خوبی وہ سادگی تھی جس کے تحت بادشاہ اور شہزادیاں تک اپنے گھروں میں خود کام کرتے تھے۔ ان میں اور عام شہریوں میں سماجی اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ قبیلے یا علاقے کا حکمراں مذہبی اور فوجی سردار ہونے کے علاوہ جج بھی ہوتا تھا جس کے فیصلے سب کو تسلیم کرتے ہوتے تھے۔

اس دورِ شجاعت کو جس کی تاریخ زیادہ واضح نہیں ہے، بادشاہوں کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ابتدائی طور پر یونان میں مختلف گاؤں بسائے گئے تھے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں گاؤں شہروں میں تبدیل ہو گئے اور شہری ریاستوں کی بنیادیں پڑ گئیں۔ مگر ریاستوں کے حکمراں بالکل خود مختار اور مطلق العنان نہیں ہو گئے تھے بلکہ ریاست کے انتظام کے لئے

امراء کی کونسل کے لئے علاوہ اہمیت اختیار کرتے گئے۔

امراء کی کونسل کے علاوہ گاؤں اور شہروں کے عام آدمیوں پر مشتمل اسمبلیاں بھی قائم ہوئیں۔ لیکن کونسل کے اختیارات مشورہ دینے کے علاوہ اور کچھ نہ تھے۔ اس لئے عام شہریوں نے حکومت کے معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا۔

سیاسی لحاظ سے قدیم یونان بہت سی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور بڑی ریاستیں چھوٹی ریاستوں کو ختم کرنے کی فکر میں لگی رہتی تھیں، لیکن مذہبی اور سماجی طور پر یونان کی مختلف ریاستوں کے باشندے، اتحادی رشتے رکھتے تھے۔ اپولو (سورج دیوتا) کے مندر میں جو ڈلفی کے مقام پر تھا۔ انتظامی امور اور مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے تمام ریاستوں کے نمائندے شامل ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اولیمپک کھیلوں میں بھی سب شرکت کرتے تھے۔

قدیم یونانی معاشرہ، طبقاتی معاشرہ تھا مگر طبقاتی امتیازات میں شدت نہ تھی۔ ریاستیں ایک دوسرے سے جنگی زور آزمائی کرتیں۔ مگر شہری ریاستوں کے عام شہری مذہبی رسوم کی ادائیگی اور اولیمپک کھیلوں میں برابری سے شریک ہوتے تھے۔

اولیمپک کھیل دیوتا زیوس (Zeus) کے اعزاز میں ہر چار سال کے بعد منعقد ہوتے تھے، جن میں دوڑ لگانے، کشتی، مکے بازی، رتھوں کی دوڑ، ڈسکس تھرو اور جیولین تھرو شامل تھے۔ ان کھیلوں میں جیتنے والوں کو انعامات ملتے تھے۔ ان کھیلوں کو قومی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے ذریعے قومی یگانگت کا احساس بھی پختہ ہوتا تھا۔ اس یگانگت کا احساس ہومر کی نظموں میں بھی یونانی شہزادوں کے حوالے سے ملتا ہے جو ٹرائے کے محاصرے میں قومی محاذ بنا کر متحد ہو گئے تھے۔

زمانۂ شجاعت میں یونانی دیوتا مختلف مظاہرِ قدرت کے نمائندے سمجھے جاتے تھے جو انسانی صورت اور انسانی احساس رکھتے تھے اور ان میں انسانی کمزوریاں بھی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ دیوتا عام انسانوں کی طرح فانی نہ تھے بلکہ غیر فانی سمجھے جاتے تھے اور دوسروں کو غیر فانی بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

دیوتا زیوس تمام دیوتاؤں کا جدِ امجد تھا جو آسمان کا دیوتا مانا جاتا تھا اور ہیرا اس

کی بیوی تھی۔ اپولو سورج اور تیر اندازی کا دیوتا تھا۔ آرس (Ares) جنگ کا دیوتا مانا جاتا۔ افروڈائٹ (Aphro Dite) محبت کی دیوی اور ایتھینا (Athena) آرٹ کی دیوی تھی۔ ان کے اعلاوہ اور بہت سے دیوتا تھے جنہیں خوش رکھنے کے لئے قربانیاں دی جاتی تھیں۔ زبانی کشف وکرامات کا رواج بھی عام ہوگیا تھا۔ دیوتاؤں کے مندروں میں پروہت اور داسیاں، دیوتاؤں کی زبان میں کسی بھی معاملے پر رائے یا مشورہ دیا کرتی تھیں، جسے مذہبی حیثیت حاصل ہوتی تھی اور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں ڈلفی کے مندر کے فرمودات یورپی ادب کے ذریعے کافی مشہور ہوئے ہیں۔

بادشاہوں کے دور میں بہت سی شہری ریاستیں مثلاً اسپارٹا، ایتھنز، تھیبس اور کارنتھ وغیرہ قائم ہوئی تھیں۔ پھر آگے چل کر سماجی اور مذہبی لحاظ سے یونانیوں میں قومیت کا تصور پیدا ہوگیا تھا اور مشترک دشمن سے جنگ کرنے کے لئے اتحاد کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ رفتہ رفتہ یونانیوں کی زندگی کا مقصد دیوتاؤں کی طرح غیر فانی ہو جانا قرار پایا جس کے لئے دیوتاؤں کی خوشنودی اور ان کو قربانیوں وغیرہ سے خوش کرنا لازمی ہوگیا۔

قدیم یونانی دورِ شجاعت ۷۵۰ سال تک رہا۔ اس عرصے میں انھوں نے دیہی معاشرت سے ترقی کر کے شہری تمدن تک ترقی کر لی تھی۔ لیکن ان کا طریقِ زندگی، ان کے مذہبی عقائد اور سیاسی معاملات سادہ ہی رہے۔ اس دور میں انھوں نے علوم وفنون کی ترقی اور تجارتی وصنعتی کامیابیوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ نہ سیاسی تبدیلیوں کا کوئی خاص خیال آیا۔ بس ان کو اپنی شجاعت اور دیوتاؤں کی خوشنودی عزیز رہی۔

یونان کا جمہوری اور جابری نظام

ساڑھے چھ سو سال قبل مسیح یونان کی ریاستیں دور دور تک کے ساحلی علاقوں میں پھیل گئی تھیں جن میں جمہوری روایات کا ایک نیا رُخ سامنے آیا۔ قدیم شہری ریاستوں میں تو طبقۂ امراء کو کلیدی حیثیت حاصل تھی لیکن بعد میں ان کے مقابل صنعت کاروں اور تاجروں کا طبقہ آ گیا۔ امراء اور صنعتکاروں نے آپس میں سازباز کر لیا۔ محنت کشوں، مزدوروں اور کسانوں کا حال ابتر ہو گیا۔ انہوں نے سیاسی و معاشی اصلاحات کا مطالبہ کیا تو اصلاحات کے نام پر ایسی جبریت سامنے آئی کہ حالات اور زیادہ بگڑ گئے۔

جمہوریت کے نام پر ایسے لوگ برسرِ اقتدار آئے جنھیں یونانیوں نے جابر کہا لیکن یونانیوں نے جابر کا لفظ ظالم کے معنی میں نہیں استعمال کیا بلکہ ہر وہ شخص جس نے عوام کے نام پر سیاسی اختیارات کو اپنے قبضے میں کر لیا اور ریاست کا حکمراں بن بیٹھا، اسے جابر کہا گیا۔

ایتھنز میں ان جابر حکمرانوں کا دورِ حکومت بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس زمانے میں وہاں کی فوجی قوت بڑھی اور عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اصلاحات نافذ ہوئیں۔ جابر حکومتوں کے قیام کا طریقۂ کار یہ تھا کہ کوئی آرکن عوام کے مطالبات کی حمایت کرتا۔ عوام میں سے اپنی فوج بناتا اور حکومت پر قابض ہو جاتا۔ اس طرح جابر حکومتوں کے متعلق عام تصور یہی تھا کہ وہ عوام کی حمایت سے قائم ہوتی ہیں لیکن جابر حکمراں ذاتی اقتدار کی خاطر امراء کی کونسل اور عوام کی اسمبلی کو نظرانداز کر کے شخصی حکومت قائم کر لیتا ہے۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ جمہوری مطالبات کے نتیجے میں شخصی حکومتیں قائم ہو گئیں اور جابر حکومت کو ختم کرنا بہادری کی علامت سمجھا جانے لگا۔ جابر حکمرانوں کا قتل آئے دن کا معمول بن گیا۔ چنانچہ جابر حکمراں خاندانی

حکومتوں کی بنیاد نہ ڈال سکے۔

صورتِ حال یہ تھی کہ یونانی ریاستوں میں کبھی جابر حکمراں برسرِ اقتدار آجاتے تھے اور جب ان کو مار کر نجات حاصل کرتے تو عوام کی اسمبلیاں حکومت کا انتظام سنبھال لیتیں۔ اس طرح جمہوری اور شخصی طرز کا ملا جلا سا دورِ حکومت رہا اور کوشش یہی رہی کہ عوام کی فلاح و بہبود سے چشم پوشی نہ کی جائے۔

ایتھنز میں عوام کے مطالبات کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے ڈراکو (Draco) کو ۶۲۱ ق م میں آرکن منتخب کیا گیا اور اصلاحات نافذ کرنے کے اختیارات دیئے گئے لیکن اس نے اصلاحات تو کوئی بھی نافذ نہ کیں البتہ قوانین کو تحریری شکل دے دی اور قوانین کو توڑنے کی سخت سزائیں تجویز کیں۔ گویا ڈراکو کو عوام کی فلاح و بہبود سے زیادہ اپنے اقتدار کی فکر رہی اور اس کا آرکن منتخب ہونا ایک ایسا تجربہ ثابت ہوا جس کے پیشِ نظر آئندہ کسی آرکن کو منتخب کرنے میں انتخابی اداروں نے ہوشیاری سے کام لیا۔

یونان کی تہذیبی تاریخ میں سولن (Solon) کا نام امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ۵۹۴ قبل مسیح میں آرکن منتخب کیا گیا اور وسیع اختیارات سونپے گئے مگر اس نے ان اختیارات کو اندھا دھند اپنے اقتدار کے لئے نہیں بلکہ عوامی فلاح و بہبود کے لئے برتنا اور مفید اصلاحات نافذ کیں۔ اسی لئے اسے یونان کا پہلا بڑا سیاست داں مانا جاتا ہے۔

اس نے سب سے پہلے غریب کاشتکاروں کے قرضے معاف کئے اور ان کو امراء کی غلامی سے آزاد کیا۔ کاشت کے لئے زمین کا تعین کیا جس پر ایک آدمی آسانی سے کاشت کر سکتا ہو۔ اس طرح مقروض ہونے پر امراء کا غلام بننے کی لعنت کا خاتمہ کیا۔ اس نے جہاں غریبوں کو فائدہ پہنچایا وہاں ریاست کے بڑے بڑے عہدے امراء کے لئے وقف کر دیے۔ کونسل کے لئے چار سو نمائندوں کا انتخاب کرایا جو ایتھنز کے چار مختلف قبیلوں سے منتخب ہوئے۔ اسی کے زمانے میں سلامیز کے جزیرے پر یونانیوں کا قبضہ ہوا مگر اس کو فتوحات سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی جمہوری نظام اور عوامی فلاح و بہبود سے تھی۔ لیکن سولن ہی کے دورِ اقتدار میں ایتھنز کے فوجی سپہ سالار پیسس ترالتس

(Pisis Tratsus) نے ۵۶۰ ق م میں جابر حکومت قائم کی اور ۵۲۷ ق م تک حکمراں رہا۔ اس نے کاشت کاروں میں امراء اور جاگیرداروں کی زمینیں تقسیم کیں۔ انھیں زراعتی ترقی کے لئے سرکاری قرضے دیئے۔ رعایا پر ہلکے ٹیکس لگائے۔ مندر تعمیر کئے اور سالانہ تقریبات کو شاندار طریقے پر منانے کے احکامات جاری کئے۔ اس نے یونان کے قومی شاعر ہومر کی نظموں کو مستند انداز میں لکھوایا اور ایک عمدہ کتب خانہ بھی تعمیر کرایا۔ اس کی موت کے بعد دو بیٹے یکے بعد دیگرے حکمراں بنے مگر ایک کو قتل کرادیا گیا اور دوسرا حکومت چھوڑکر روپوش ہوگیا۔

ان واقعات کے بعد ایتھنز میں پھر جمہوری نظام قائم ہوگیا اور حکومت کے معاملات پر کلیستھنز (Claisthenes) حاوی ہوگیا۔ اسے ۵۰۸ ق م میں آرکن منتخب کیا گیا اور اصلاحات کے لئے وسیع اختیارات دیے گئے۔ اس نے دستور میں یہ تبدیلی کی کہ ایتھنز کی شہریت کو ہر طبقے کے لئے عام کردیا اور کونسل کے منتخب نمائندوں کی تعداد چار سو سے بڑھا کر پانچ سو کردی۔ یہ کونسل ریاست کے انتظامی، فوجی اور مالی امور میں بااختیار تھی اور آرکن حضرات کی نگرانی بھی کرتی تھی۔ اس نے جابر حکمرانوں کو اقتدار میں آنے سے روکنے کے لئے یہ قانون بنایا کہ ایسے شخص کو شہر بدر کردیا جائے گا جس کے خطرناک ہونے کے بارے میں چھ ہزار یا اس سے زیادہ شہری رائے دیں۔ اس طرح عوام کی رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی اور جمہور کی طاقت بڑھ گئی۔

اصلاحات کا آغاز تو سولن نے کیا تھا مگر کلیستھنز کی اصلاحات نے اس کام کی تکمیل کی۔ بڑی حد تک عوام کے نمائندوں کی حکومت قائم ہوئی اور ایتھنز کے عوام اتنے محبِ وطن ہوگئے کہ جب ایرانی شہنشاہوں نے حملہ کیا تو کسی عنوان ان کا قبضہ نہ ہونے دیا۔

یونانی تہذیب اور امراء کا اقتدار

مختلف زمانوں میں مختلف افراد، طبقے اور قومیں اپنے اپنے طور پر معاشرتی، سیاسی، مذہبی، معاشی اور ثقافتی لحاظ سے جو اندازِ فکر اختیار کرتی رہیں، واقعاتِ عالم دراصل اسی کا ردِ عمل بن کر رونما ہوئے۔ انسان کی ذہنی اختراعات اور احتیاجات ہی کے نتیجے میں نت نئے انداز سے تاریخ و تہذیب کا سلسلہ قائم رہا ہے اور رہے گا۔

قدیم یونان میں اوّل اوّل شہری ریاستیں قائم ہوئیں اور بادشاہوں کا اقتدار قائم رہا۔ تاہم بادشاہوں کے دورِ اختتام تک امراء کی کونسل کے اختیارات اس حد تک بڑھ گئے کہ سیاسی حکمرانی کے اعتبار سے بادشاہ کی حیثیت ختم ہو گئی اور وہ صرف مذہبی رہنما بن کر رہ گیا۔ شہر کے امراء باہمی مشاورت سے حکمراں کو منتخب کرنے لگے جو شہر کے اندرونی معاملات کا نگراں ہوتا تھا اور جسے آرکن (Archon) کہتے تھے۔

جنگی معاملات کے لئے جداگانہ اشخاص کا انتخاب ہوتا تھا۔ اس طرح امراء کی کونسل کے اختیارات بڑھنے کے ساتھ ساتھ عوام کی اسمبلیوں کے اختیارات میں کمی ہوتی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ اور عوام، دونوں کی سیاسی اہمیت برائے نام رہ گئی۔ ایتھنز میں تو بادشاہ کا عہدہ ہی ختم کر دیا گیا۔ اسپارٹا میں ایک کی بجائے دو بادشاہوں اور پانچ مشیروں کے انتخاب کا اختیار امراء کی کونسل کو مل گیا۔ یہ پانچ مشیر ایک سال کے لئے چُنے جاتے، لیکن امراء لئے با اختیار ہوتے کہ بادشاہوں کو گرفتار بھی کر سکتے تھے۔ ان پر مقدمہ چلا سکتے تھے اور انہیں سزائیں دے سکتے تھے۔ گویا اسپارٹا میں امراء کی کونسل ایک زبردست فوجی کونسل تھی۔ اسی وجہ سے یونان کی تاریخ میں اسپارٹا کی فوجی طاقت طویل عرصے تک برقرار رہی۔

جس زمانے میں یونانی ریاستوں کے امرا طاقت پکڑ رہے تھے یونان کی تہذیب میں زبردست تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ قدیم ادوار میں یونانیوں کو سمندر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ سمندر سے ڈرے ہارے تھے۔ لیکن بتدریج ان کا خوف کم ہوا اور پھر وہ دور بھی آیا کہ جب سمندروں میں ان کے جہازی بیڑے تجارتی ساز و سامان کے ساتھ آنے جانے لگے۔ انھیں بحری راستوں سے واقفیت ہو گئی اور آس پاس کے ملکوں سے رابطہ ضبط بڑھنے لگا۔ اس طرح یونان کو دھاتوں کی بنی ہوئی چیزیں، بہترین کپڑا اور دستکاری کے اعلیٰ نمونے ملنے لگے۔ فنِ تحریر بھی انہوں نے مصریوں سے سیکھا اور یونان میں پڑھنے لکھنے کا رواج عام ہو گیا۔ علاوہ ازیں فنونِ لطیفہ میں پہلے وہ بہت پیچھے تھے صرف شاعری پر زیادہ توجّہ تھی۔ آہستہ آہستہ مصوری، سنگ تراشی، عمارت سازی اور کئی دوسری ہنرمندیوں کو انھوں نے آس پاس کے ملکوں سے حاصل کر لیا۔ ان تمام تبدیلیوں کا اثر ان کے علم و ادب اور تہذیبی و ثقافتی ارتقاء پر بھی پڑا۔ پہلے وہ دیوتاؤں کی شان میں یا پھر جنگی نظمیں لکھتے تھے۔ آگے چل کر ان کی شاعری حسن و جمال کی آئینہ دار بھی بن گئی۔

جب یونان کی شہری ریاستوں میں طبقۂ امرا یا اشرافیہ کو بالادستی حاصل ہو گئی تو اپنے شہروں سے یونانیوں کی محبت دن بہ دن بڑھنے لگی۔ وہ ان کی آزادی، ترقی اور تجارتی برتری کے لئے ہمہ تن مستعد ہو گئے۔ البتہ الگ الگ شہروں کے شہریوں کا اندازِ فکر مختلف رہا۔ مثلاً اسپارٹا میں دو بادشاہوں کی عملداری رہی۔ ایک فوجوں کی کمان سنبھالتا اور دوسرا مذہبی تہوار دل پر قربانی کی رسومات ادا کرتا۔ مجموعی طور پر دونوں بادشاہوں کے اختیارات امرا کی کونسل نے بہت کم کر دیے تھے۔ اس طریقۂ حکومت کے لئے اسپارٹا کے لوگوں نے ایک دستور بنا لیا تھا جس میں ریاست کی بنیادیں فوجی طاقت کی برتری کے اصولوں پر رکھی گئی تھیں۔ اس لئے اسپارٹا میں فوجی تربیت اور جسمانی طاقت کی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ پیدائش کے بعد ہر بچّہ ریاست کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت ریاست کی ذمّہ داری تھی۔ بچّوں کو ابتدائی عمر ہی سے مضبوط اور توانا بنانے کے لئے سخت محنت لی جاتی، بلکہ اکثر جسمانی تکلیفیں بھی دی جاتیں تاکہ وہ سخت کوشش

اور جنگجو بن سکیں۔ ان میں یہ احساس بطورِ خاص پیدا کیا جاتا کہ انہیں اپنی زندگیاں اسپارٹا کے لئے وقف کرنی ہیں اور جان تک کی قربانی دینی ہے۔

اس ابتدائی تربیت کا نفسیاتی اثر یہ ہوتا تھا کہ جوان ہو کر وہ بہت بہادر سپاہی ثابت ہوتے تھے۔ ایرانی فوجوں کے مقابلے میں اسپارٹا کے سپاہیوں نے اپنی اور تمام دوسری یونانی ریاستوں کی حفاظت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ اسپارٹا کی یہ فوجی برتری ضرب المثل بن گئی۔ اس فوجی برتری کے بل بوتے پر اسپارٹا کے لوگوں نے دوسری ریاستوں پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ پہلے ہی سے یونان کی تمام شہری ریاستوں پر ان کا رُعب و دبدبہ قائم تھا۔ اس لئے جب وہ دوسری ریاستوں پر حملہ آور ہوئے تو ان کا مقابلہ کرنا ناممکن ہو گیا۔

اسپارٹا کی فوجی طاقت نے فتوحات کے دائرے کو بڑھایا اور انجام کار بیشتر ریاستوں پر ان کا غلبہ ہو گیا۔ خوف و دہشت کے سبب یونانی ریاستوں کے باشندے اور طبقۂ امراء کے بہت سے افراد اپنی ریاستیں چھوڑ کر یونان کے آس پاس کی بستیوں میں چلے گئے اور اس طرح یونانی سیاست میں نو آبادیات قائم کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ یہ رجحان صرف اسپارٹا کی فتوحات ہی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ دوسری ریاستوں میں امراء اور صاحبِ اقتدار لوگوں نے غریب کاشت کاروں اور مزدوروں پر جو ظلم روا رکھے تھے وہ بھی نو آبادیات کے قیام کا محرک بنے۔ علاوہ ازیں تجارتی رابطے اور تجارتی مہمات نے بھی نو آبادیاں قائم کرنے میں مدد دی۔ اس پیش رفت سے یونانی تہذیب کے ارتقائی عمل کو بڑی تقویت ملی جو تہذیبی توسیع کا ذریعہ بنی۔

یونانی نو آبادیات

یونان کی شہری ریاستوں کا ارتقائی سفر تاریخی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ یونانی مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus) ہی تھا جسے تاریخ عالم، بابائے تاریخ کا درجہ دیتا ہے۔ اسی نے انسان کی ان سرگرمیوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی جو اس نے گزشتہ ادوار میں انجام دی تھیں۔ ہیروڈوٹس نے تاریخ کو تلاشِ حق کہا۔ یونان کی دانشوری اور تاریخی بصیرت کا اثر عہد بہ عہد ساری مہذب دنیا پر پڑا۔ خصوصاً یونان کی تاریخ کا وہ دور جب سکندرِ اعظم جیسی تاریخ ساز شخصیت نے ایک بڑی سلطنت قائم کی۔

جب یونان کی شہری ریاستوں کی آبادیاں بڑھیں اور وہاں کے لوگ آس پاس کے علاقوں میں ہجرت کر کے وہاں اپنی تہذیبی شمعیں روشن کرنے لگے تو ان کی نو آبادیات کو بھی وہی حیثیت حاصل ہو گئی جو یونان کو حاصل تھی۔

سب سے پہلے بحیرۂ اسود (Black Sea) کے ساحلوں پر یونانی نو آبادیات قائم ہوئیں۔ یہاں تانبہ، چاندی اور سونے کی فراوانی نے کثیر تعداد میں یونانیوں کو ترکِ وطن پر اکسایا اور اس طرح مقدونیہ (Macedonia) کے علاقے میں یونانی اثرات اتنی تیزی سے بڑھے کہ سسلی اور اٹلی کے علاقوں پر بھی یونانی قابض ہو گئے اور انھوں نے اٹلی کو عظیم یونان کا نام دیا۔ پھر ان کی نو آبادیات اسپین میں بھی قائم ہوئیں اور اس طرح بحیرۂ روم کے تمام ساحلی علاقوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ بحیرۂ اسود سے جبل الطارق تک یونان کی تجارتی اور سیاسی برتری قائم ہوئی جس سے یونانی تہذیب کے پھیلاؤ میں بھی بڑی مدد ملی۔ یونانیوں کے پاس دولت کے انبار لگ گئے اور یونان کی ریاستیں اپنی نو آبادیات سے

ضروریات کی تمام چیزیں حاصل کرنے لگیں۔ کارنتھ اور ایتھنز کی ریاستوں نے خصوصاً بڑا فائدہ اٹھایا۔

اسی دور میں یونانیوں نے جہاز سازی کی طرف توجّہ دی اور بحری بیڑے بنائے۔ تجارتی اور صنعتی ترقی کی بدولت یونان میں ایک انقلاب آگیا۔ امراء کے اثرات کم ہونے لگے جو زمینوں کے مالک تھے اور جنھوں نے کاشت کاروں کو مزدور بنا رکھا تھا۔ تاجروں اور صنعتکاروں نے مزدوروں کو اپنی جانب راغب کیا۔ اس رغبت نے امراء کے اقتدار کو نقصان پہنچایا، ریاستوں کے سیاسی معاملات اور کونسلوں میں نمائندگی کا حق صرف جاگیرداروں کو نہ رہا بلکہ دوسرے شہری بھی ان کے برابر آنے لگے۔ اس طرح یونان میں جمہوری روایات کا نیا دور شروع ہوا۔ جمہوری ادارے اور جمہوری تصوّرات نشو و نما پانے لگے۔ پھر کچھ عرصے بعد تمام شہری ریاستوں میں جمہوری طرزِ حکومت صحیح معنوں میں رواج پا گیا۔

جب ایتھنز میں اور اس کے آس پاس کی شہری ریاستوں میں جمہوریت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی، اس وقت اسپارٹا اور اس کے قرب و جوار کی ریاستوں میں شاہی طرزِ حکومت رائج تھا۔ اسپارٹا میں دو بادشاہوں کی حکومت قائم تھی۔ وہاں کے لوگ قدیم دورِ شجاعت کی روایات اور یادگاروں پر نازاں تھے۔ وہ اپنی قدامت پسندی کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ اگرچہ دو بادشاہوں کی موجودگی سے بادشاہت کے اختیارات محدود تھے۔ لیکن پھر بھی چوں کہ بادشاہتیں موروثی تھیں اور اسپارٹا کے لوگ نہ صرف اپنی ریاست بلکہ بادشاہوں کی بقا کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتے تھے۔

بادشاہوں کی مدد کے لئے اسپارٹا میں مجلسِ بزرگان (Council of the Leaders) بھی قائم تھی جو تیس ارکان پر مشتمل ہوتی تھی۔ فوجی طاقت کے اعتبار سے بھی اسپارٹا کا مقابلہ کوئی دوسری ریاست نہ کر سکتی تھی۔ ۶۲۱ ق م میں اسپارٹا نے میسنیہ (Messenia) کی ریاست پر قبضہ کر لیا تھا اور جزیرہ پیلوپونیس (Pelo Ponisus) کی دیگر ریاستوں نے اسپارٹا کو اپنا لیڈر مان لیا تھا۔ اس طرح متحدہ دفاع کے لئے اسپارٹا لیگ قائم ہوئی جس کے ممبر ریاستوں کے لئے

لازمی تھا کہ وہ سپاہی مہیا کریں اور اگر کوئی دشمن، لیگ کی کسی ممبر ریاست پر حملہ کرے تو لیگ کی تمام ریاستیں اس کا مقابلہ کریں۔

اسپارٹا کے علاوہ یونان کی دیگر شہری ریاستوں اور نو آبادیات میں یونانیوں کا معاشرہ تین طبقوں پر مشتمل تھا۔ طبقۂ امرا، تاجروں اور صنعت کاروں کا متوسط طبقہ اور عام محنت کشوں کا طبقہ۔ متوسط طبقے کے بڑھتے ہوئے اثرات طبقۂ امرا کے لئے باعث تشویش تھے۔ ادہر کسانوں اور مزدوروں کی حالت خراب ہوتی جارہی تھی۔ قرضے کے سخت قوانین نے کاشت کاروں کو امرا کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ انھیں قرض لینے کے لئے اپنی زمینوں کو رہن رکھنا پڑتا تھا۔ پھر ان کو اپنی ہی زمینوں پر غلاموں کی طرح کام کرنا پڑتا تھا۔

متوسط طبقے نے طبقۂ امرا سے سازباز کر لیا تھا۔ اس طرح تاجروں اور صنعت کاروں کے اثرات بڑھنے لگے مگر عوام دو چکیوں کے بھاری پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے۔ پھر انھوں نے تنگ آکر سیاسی اور معاشی اصلاحات کے لئے آواز اٹھائی جو بااثر ثابت ہوئی، لیکن عوام اور جمہوریت کے نام پر ایسے لوگ برسرِ اقتدار آگئے جنھیں یونانیوں نے جابر (Tyrants) کہا اور جنھوں نے مطلق العنان بادشاہوں کی طرح حکومت کی۔ مزدوروں اور کسانوں کی حالت بدستور خراب ہی رہی۔ ان کو نام نہاد سیاسی اور معاشی اصلاحات سے کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ فائدہ طبقۂ امرا اور متوسط طبقے ہی نے اٹھایا۔ معاشرہ انتشار کا شکار رہا اور جو استحکام جمہوری حکومت کو ہونا چاہیئے تھا، وہ نہ پیدا ہو سکا۔

یونان اور ایران کی جنگیں (اوّل)

اقتدار کی جنگ زمانۂ قدیم سے جاری رہی ہے۔ اسی جنگی روایت نے یونان اور ایران کی جنگوں کا سماں دکھایا۔ جس زمانے میں ایتھنز جمہوری راہ پر گامزن تھا اور عوام کے تاثرات حکومت پر بڑھ رہے تھے اسی زمانے میں اسپارٹا کی حکومت کے اختیارات بادشاہوں اور "مجلس بزرگاں" کے ہاتھوں میں تھے۔
ادھر ایران کی سلطنت کا دائرہ تیزی سے بڑھ رہا تھا اور ایرانی شہنشاہ دور و نزدیک کی ریاستوں پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ خصوصاً ایرانی شہنشاہ دارا کے زمانے میں ایرانی ایشیائے کوچک کے تین صوبوں اور تھریس پر قابض ہو گئے تھے اس طرح انھوں نے یونانی ریاستوں سے جنگ کا آغاز کیا اور کچھ ہی عرصے میں ایتھنز اور اسپارٹا کی ریاستوں کو اندازہ ہو گیا کہ انھیں جلد ہی سخت اور طاقتور دشمن سے مقابلہ کرنا ہے جس کے لیے پوری فوجی تیاری ہونی چاہیئے۔
۵۰۰ قبل مسیح تک ایشیائے کوچک کے یونانی شہروں پر دارا کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا لیکن یونانی اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان یونانی شہروں میں دارا کے خلاف پانچ سال تک بغاوتیں ہوئیں اور باغی شہروں نے ایتھنز سے مدد مانگی۔ وہاں کے لوگوں نے بیس جہاز مدد کے لیے بھیجے۔ شروع میں تو یونانیوں کو کامیابی ہوئی لیکن جب ایران سے مزید فوجیں آئیں اور یونانی شہروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تو ایتھنز کی فوجیں اور بحری بیڑا ایشیائے کوچک کے یونانی شہروں کو ایرانیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر واپس آ گیا۔
اُدھر دارا نے یہ فیصلہ کیا کہ ایتھنز سے اس مدد کا بدلہ لیا جائے۔ دارا کو اتنا غصہ تھا کہ اس نے اپنے ایک غلام کو یہ کام سونپا تھا کہ وہ روزانہ اس کے سامنے یہ فقرہ دہرائے " عالی جاہ! ایتھنز کے لوگوں کو یاد رکھیئے!"

۴۹۲ ق م میں ایرانی فوجوں نے دوبارہ تھریس اور مقدونیہ کے شہروں پر قبضہ کر لیا اور پھر ایتھنز

اور اسپارٹا پر حملہ کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں، لیکن اچانک ایرانی بیڑا سمندری طوفان میں پھنس گیا۔ بہت نقصان ہوا اور تین سو جہاز تباہ ہو گئے۔ اس لیے ایرانی فوجیں پیش قدمی نہ کر سکیں۔ ایرانی جنرل اپنی فوج کو لے کر واپس ایران چلا گیا۔

۴۹۰ ق م میں دارا نے زبردست فوجی تیاری کا حکم دیا۔ بحری اور بری فوجیں بہت زیادہ مستحکم کی گئیں اور چھ سو جہازوں کا جنگی بیڑہ یونان کے قریب لنگر انداز ہو گیا۔ یونانی ریاستوں میں ایرانی ایلچی بھیجے گئے کہ یونانی ریاستیں شہنشاہ دارا اور ایران کی اطاعت قبول کریں۔ اکثر ریاستوں نے خراج پیش کر کے اطاعت قبول کر لی، لیکن ایتھنز اور اسپارٹا کی ریاستوں نے انکار کر دیا۔ تب ایرانی فوجیں ایتھنز کی طرف روانہ ہوئیں۔ ایتھنز کے لوگوں نے اسپارٹا سے مدد مانگی۔ جواب ملا کہ وہ مدد تو کریں گے لیکن جب تک چاند پورا نہ ہو جائے ان کی فوجیں سفر نہیں کر سکتیں۔ اس طرح ایتھنز کے لوگوں کو خود ہی ایرانی فوجوں سے لڑنا پڑا۔ ایرانی بیڑہ صرف چھبیس میل دور رہ گیا تو یونانیوں نے سوچا کہ مقابلہ ایتھنز کے دروازوں پر کیا جائے یا مراتھون کے مقام پر جہاں ایرانی فوجیں لنگر انداز تھیں۔ فیصلہ ہوا کہ ایرانی فوجوں کو مراتھون کے مقام پر روکا جائے۔ وہ اپنے وطن کی آزادی کو بچانے کے لیے فیصلہ کن جنگ پر کمر بستہ ہو گئے۔

تاریخ عالم میں یہ جنگ دنیا کی بڑی اور فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتی ہے۔ جنگ کے آغاز پر ایرانی فوج میں تقریباً بیس ہزار سپاہی تھے اور یونانی فوج میں دس ہزار، لیکن یونانی فوج کی بہادری اور حب الوطنی کے سامنے ایرانی فوج نہ ٹھیر سکی۔ میدان جنگ میں چھ ہزار سے زیادہ ایرانی فوجی مارے گئے جبکہ یونانی فوج کے صرف ۱۹۲ سپاہی ہلاک ہوئے۔ باقی ایرانی فوج نے ساحل کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ مراتھون کی فتح کے بعد اسپارٹا کے فوجی مدد کو پہنچے۔ انھوں نے وعدہ تو پورا کیا لیکن جنگ میں شرکت کی نوبت نہ آئی اور وہ ایتھنز کے لوگوں کی بہادری کو خراجِ تحسین پیش کر کے اسپارٹا واپس چلے گئے۔ اگر اس جنگ میں ایرانی فوجوں کو کامیابی ہو جاتی تو یونان پر ایشیا والوں کا قبضہ ہو جاتا اور دنیا کی تاریخ وہ نہ ہوتی جو بعد میں ہوئی۔

دارا کے لیے یہ عبرت ناک شکست بہت ہی تکلیف کا باعث ہوئی اور اس نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے پھر زبردست تیاریاں شروع کر دیں، لیکن ابھی فوجی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں کہ ۴۸۵ ق م میں دارا کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا ایرانی سلطنت کا مالک بنا۔ اس نے جنگی تیاریوں

کو جاری رکھا اور بدلہ لینے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ ادھر ایتھنز کے لوگ بھی خاموش نہ بیٹھے۔ انھیں ایران کی طرف سے مستقل خطرہ تھا اس لئے فوج میں اضافہ اور فوجی سازوسامان کی تیاریاں ہوتی رہیں۔

۴۸۳ ق م میں تھیمس ٹوکلس (Themistocles) ایتھنز کا آرکن منتخب ہوا تو اس نے جوش و خروش سے اعلان کیا کہ ایران کا مقابلہ کرنے کے لیے یونان کے پاس بھی طاقت ور جہازی بیڑہ ہونا چاہیئے۔

۴۸۰ ق م میں ایرانی فوجوں نے جو تین لاکھ سپاہیوں اور ۸۰۰ جنگی جہازوں پر مشتمل تھیں، دوبارہ یونانیوں پر حملہ کیا۔ ایتھنز اور اسپارٹا کی ریاستوں نے ۳۱ یونانی ریاستوں کا اجلاس بلا کر پہلے ہی مقابلے کی تیاری کر لی تھی۔ اس مرتبہ یونانیوں نے وسطی یونان میں ایرانی فوجوں کا مقابلہ کرنے کی جنگی حکمت عملی سے کام لیا۔ پہاڑی راستوں اور درّوں میں اپنی فوجیں جمع کر دیں جنھوں نے بھرپور مزاحمت کر کے ایرانی فوجوں کی پیش قدمی کو روک دیا، لیکن جو خطرہ ایران کی طرف سے تھا وہ بدستور قائم رہا۔

یہودیت

جیسا کہ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ سامی نسلوں کے قبیلے دجلہ و فرات کی وادی، ملک شام، فلسطین اور عرب کے علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔ ان قبائل میں تین مذاہب نے فروغ پایا ان میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہودیت ایک قدیم مذہب ہے جس کی اشاعت مختلف پیغمبروں کے ذریعے بنی اسرائیل کے قبیلے میں ہوئی۔ اس قبیلے کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جنھوں نے دنیا کے بتکدوں میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے مبارک و مسعود نام پر خانۂ خدا یعنی خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام عرب میں رہتے تھے اور گلہ بانی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ جب وہ اپنے گلے کو لے کر اس علاقے سے گزر رہے تھے جس کا نام کنعان تھا اور جسے بعد میں فلسطین کہا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ انھیں اور ان کے قبیلے کو کنعان کے زرخیز علاقے کا حاکم اور مختار بنا دے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت تک بے اولاد تھے اس لئے انھوں نے خالقِ حقیقی سے دعا مانگی کہ وہ انھیں صاحبِ اولاد کرے۔ اس طرح حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی ولادت سے بنی اسرائیل کے قبیلے کی داغ بیل پڑی۔ خاندان کے افراد کی تعداد بڑھنے لگی اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں کی اولادیں بارہ قبائل میں تقسیم ہو گئیں۔ چونکہ حضرت یعقوبؑ اسرائیل کے نام سے مشہور تھے اس لئے ان کی اولادوں کے خاندان کے افراد بنی اسرائیل کہلائے۔

بنی اسرائیل کے کچھ قبیلے کنعان یعنی فلسطین میں آباد ہوئے۔ کچھ اٹھارویں صدی ق م میں مصر ہجرت کر گئے اور انھوں نے وادیٔ نیل کو اپنا مسکن بنا لیا۔ بنی اسرائیل میں کسی نہ کسی عنوان ایک خدا کا تصور تو موجود رہا مگر حضرت موسیٰؑ نے انھیں باقاعدہ مذہبی نظامِ حیات عطا کیا۔

حضرت موسیٰؑ مصر میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی ولادت سے پہلے بنی اسرائیل کے جو قبیلے مصر میں آباد تھے انھوں نے ابتدا میں تو آزادانہ زندگی بسر کی۔ اپنی زبان اور اپنے آبائی پیشوں کو بھی محفوظ رکھا اور ان کی جداگانہ اجتماعیت بھی برقرار رہی، لیکن فراعینِ مصر زیادہ عرصے تک بنی اسرائیل کو آزاد نہ دیکھ سکے اور انھوں نے طرح طرح کے ظلم وستم ڈھانا شروع کر دیئے۔ آخر کار ان سے غلاموں جیسا برتاؤ کیا جانے لگا اور جبراً مزدوری کرائی گئی۔ اس طرح بنی اسرائیل اپنی خراب و خستہ حالت سے عاجز آگئے اور نجات کی دعائیں مانگتے رہے۔

جس زمانے میں فرعونِ مصر نے بہت زیادہ ظلم ڈھائے وہ غالباً رعمیس دوم نام کا فرعون تھا جس کا دورِ حکومت ۱۲۹۷ ق م سے ۱۲۲۵ ق م تک شمار کیا جاتا ہے۔ اسی زمانے میں نجومیوں کے ایک خاص گروہ نے پیش گوئی کی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو فرعون کی تباہی کا باعث ہوگا۔ چنانچہ فرعون نے پوری سلطنت میں سخت اعلان کر دیا کہ اس سال بنی اسرائیل کے گھروں میں جتنے بچے پیدا ہوں ان میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ اسے کیا خبر تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے زندگی اور موت دونوں پر قادرِ مطلق کا رتبہ رکھتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے مطابق جب بنی اسرائیل کے ایک گھرانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو ان کی والدہ چونکہ فرعونِ مصر کا جان لیوا اعلان سن چکی تھیں اس لئے انھوں نے کلیجے پر پتھر رکھ کر اپنے نوزائیدہ بیٹے کو بڑی حفاظت سے لکڑی کے ایک صندوق میں رکھ کر اللہ کے نام پر دریائے نیل کے حوالے کر دیا۔ جب وہ صندوق تیرتا ہوا فرعون کے محل کی حدود سے گزرا تو اس کی ملکہ نے اس صندوق کو فوراً دریا سے نکلوا لیا۔ پھر جیسے ہی اس میں رکھے ہوئے ایک خوبصورت بچے پر نظر پڑی تو ملکہ کو حیرت انگیز خوشی ہوئی اور اس بچے پر اسے بے حد رحم بھی آیا۔ ملکہ نے فرعون سے چھپا کر اس کی پرورش اپنے ذمے لے لی۔ اُدھر حضرت موسیٰؑ کی والدہ محترمہ بھی خوبیٔ قسمت اور مشیّتِ خداوندی سے وہاں پہنچ گئیں۔ ملکہ نے ان کو دایہ کی حیثیت سے بچے کو پالنے پوسنے کے فرائض سونپے اور اس طرح حضرت موسیٰؑ کی پرورش فرعون کے محل میں ہونے لگی۔

روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جوانی کے دور میں تھے تو انھوں نے دو آدمیوں کو

جھگڑتے دیکھا جن میں ایک آدمی بنی اسرائیل کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے بدرجۂ مجبوری حضرت موسیٰؑ سے مدد مانگی۔ آپ نے مظلوم کو چھڑانے کے لئے اس کے حریف کو ایسا مکا مارا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ تب آپ کو خوف ہوا کہ کہیں قتل کے جرم میں پکڑے نہ جائیں۔ آپ فوراً وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور مدین کے میدان میں پہنچے۔ وہاں آپ نے دو لڑکیوں کو دیکھا جو پانی لینے کے لئے ایک کنویں پر کھڑی تھیں لیکن مردوں کی موجودگی میں پانی لینے سے محروم تھیں۔ آپ نے ان کی مدد کی اور پانی سے ان کے برتن بھر دیئے۔ وہ لڑکیاں حضرت موسیٰؑ کو اپنے گھر لے گئیں۔ لڑکیوں کے والد حضرت شعیب علیہ السلام نے انھیں اپنے گھر میں ایک معزز مہمان کے طور پر رکھا اور ان کی نیک سیرتی سے متاثر ہو کر اپنی بیٹی کی شادی اس شرط پر ان سے کر دی کہ آٹھ سال تک وہ وہیں رہیں گے اور متعلقہ خدمات انجام دیتے رہیں گے۔

آٹھ برس خدمت کرنے کے بعد حضرت موسیٰؑ اپنی بیوی اور مویشیوں کے گلے کو لے کر وہاں سے رخصت ہوئے۔ رات کے وقت سردی کے موسم میں آگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہاں جنگل میں طورِ سینا پر آگ روشن دیکھی تو اس پہاڑ پر چڑھ گئے جہاں اس نورِ خداوندی کے وسیلے سے کلیم اللہ بنے۔

خدا کی دین کا موسیٰؑ سے پوچھیئے احوال   کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو نبوّت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ "عصا" اور "یدِ بیضا" سے نوازا۔ آپ کو فرعونِ مصر اور اس کی رعایا کو نیک راہ پر لانے کا فرض سونپا گیا۔ تب حضرت موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو نبوت میں شریک کرنا چاہا اور اللہ تعالیٰ نے یہ درخواست منظور فرمائی۔ حضرت ہارون علیہ السلام فصیح البیان تھے۔ فرعون کے دربار میں جب اس سے مکالمہ ہوا تو اس پر اللہ کی اطاعت اور نیکیوں کی پیروی کرنے کی تلقین کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا اور بنی اسرائیل کا سخت دشمن ہو گیا۔

بنی اسرائیل

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق فرعون مصر کو راہ حق پر چلنے کی دعوت دی اور معبودِ حقیقی کی عبادت کرنے کا درس دیا تو فرعون پر آپ کی تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور نشۂ اقتدار میں بدمست رہا اور نہ صرف حضرت موسیٰؑ بلکہ بنی اسرائیل کا سخت دشمن ہو گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو فرعون کے ظلم وستم سے بچانے کے لئے مصر چھوڑنا چاہتے تھے۔ جب وہ تمام بنی اسرائیل کو اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوئے تو فرعون نے آپ کا تعاقب کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی امّت نے تو سمندر پار کر لیا مگر فرعون مع اپنی فوج کے غرقاب ہو گیا۔ اس طرح بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات ملی۔ وہ مصر سے ہجرت کر کے جنوبی شام کے علاقے میں آ گئے۔ اسی زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الہامی کتاب توراۃ کا نزول ہوا جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کے لئے نیک ہدایات تھیں جن پر ان کو عمل کرنا تھا، لیکن بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی تعلیمات اور احکاماتِ ربانی کی خلاف ورزی کی جس کے نتیجے میں وہ چالیس برس تک خانہ بدوشی اور عذابِ الٰہی میں مبتلا رہے۔ اسی عرصے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال ہو گیا۔ چالیس برس کی دربدری کے بعد یہودی یوشع (Joshua) کی رہبری میں فلسطین کی سرزمین پر آئے اور فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔

انھوں نے یہ فتوحات ایسے دور میں حاصل کیں جب شام اور فلسطین پر سے مصری حکمرانی کے اثرات ختم ہو چکے تھے۔

بنی اسرائیل نے مفتوحہ علاقے کو بارہ قبائل میں تقسیم کردیا جو اپنا نسبی تعلق حضرت یعقوب علیہ السلام سے رکھتے تھے۔ ان علاقوں میں بادشاہتیں قائم نہیں ہوئیں بلکہ قبیلے کے بزرگوں نے انتظامی اختیارات سنبھالے اور حکمرانی کرنے لگے، لیکن یہ صورت حال زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اور ایک مضبوط ریاست کی ضرورت محسوس ہونے لگی کیونکہ فلسطین کا وہ علاقہ جس پر بنی اسرائیل نے قبضہ کیا تھا وہ چاروں طرف دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ ریاست کا پہلا بادشاہ ساؤل (Saul) کو نامزد کیا گیا اور اس طرح بنی اسرائیل کی بادشاہت قائم ہو گئی۔

ساؤل کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے بادشاہ بنے جو پہلے تو یہودہ قبیلے کے سردار تھے لیکن بعد میں شمالی قبیلوں نے بھی ان کی اطاعت قبول کر لی تھی اور پورے فلسطین پر ان کی بادشاہت قائم ہو گئی۔ ان کے دورِ حکومت میں فلسطینیوں کو شکست دی گئی، قرب و جوار کے قبیلوں پر قبضہ کیا گیا اور یروشلم کو فتح کر کے اسے سلطنت کا دارالحکومت بنایا گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے یروشلم میں بیت المقدس کی تعمیر شروع کی جس کی تکمیل حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ہوئی۔ سلطنت تو پہلے ہی مشرق بعید میں سب سے بڑی ہو چکی تھی اور جس کی فوجی طاقت بھی زبردست تھی۔ تاہم حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد ان کے فرزند ارجمند حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مزید کامیابیاں حاصل کیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام شان و شوکت اور عقل و دانش میں یکتائے روزگار تھے۔ انہوں نے تیس برس کے دورِ حکومت میں یہودی سلطنت کو ساری دنیا میں مشہور کر دیا۔ اس زمانے میں یروشلم بہت ہی خوبصورت اور ہر لحاظ سے خوش حال شہر بنا۔ فتوحات میں اضافہ ہوا۔ صنعت و تجارت میں خوب ترقی ہوئی اور بنی اسرائیل کو مہذب دنیا کی بہت ہی طاقتور قوم سمجھا جانے لگا جس کے پاس مال و دولت کی بھی فراوانی تھی۔ قرب و جوار کی ریاستوں سے سیاسی اور تجارتی تعلقات مضبوط تھے۔ اس زمانے میں بنی اسرائیل دنیا کے جاہ و جلال اور شان و شوکت میں اپنی مثال آپ تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ شمال میں جو حکومت قائم ہوئی اس کا نام اسرائیل پڑا اور جنوب میں جو حکومت بنی وہ یہودی کہلائی جس کا دارالحکومت یروشلم تھا۔ آگے چل کر دونوں حکومتوں میں جنگ وجدال کا سلسلہ شروع ہو گیا اور دونوں حکومتیں اتنی کمزور ہو گئیں کہ بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کر سکیں اور ۷۲۲ ق م میں آشوریوں نے شمالی حکومت کو فتح کر لیا پھر ۵۸۶ ق م میں وادیٔ دجلہ و فرات کی کلدانی حکومت نے یروشلم کو فتح کر کے یہودی سلطنت کا بھی خاتمہ کر دیا اور یہودیوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ ہزاروں یہودی غلام بنا کر بابل لے جائے گئے اور کلدانی سلطنت کے زوال تک غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے۔

جب بابل پر ایران کے بادشاہ سائرس نے قبضہ کیا تو یہودیوں کو غلامی سے نجات دلائی اور انھیں یروشلم واپس بھجوا دیا۔ اس کے بعد یروشلم میں یہودی حکومت تو قائم نہ ہو سکی، البتہ مذہبی رہنما یروشلم پر غالب رہے۔

ایرانی سلطنت کا زوال ہوا تو پہلے فلسطینیوں پر یونانیوں کا تسلط رہا اور ان کے بعد عرصۂ دراز تک رومیوں نے فلسطین کو رومن امپائر کا ایک صوبہ بنا کر رکھا۔ پھر پہلی صدی عیسوی میں وہ زمانہ بھی آیا جب فلسطینیوں نے رومن سلطنت کے خلاف بغاوت کی جسے بری طرح کچل دیا گیا۔ یروشلم تباہ و برباد ہوا۔ یہودیوں کا قتل عام جاری رہا۔ جو باقی بچے انھیں غلام بنا کر رکھا گیا۔ یہودی گھر سے بے گھر ہوئے۔ یروشلم کو ان کے مرکز و مسکن کی حیثیت حاصل رہی مگر وہ بڑی مظلومانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے۔ پھر رفتہ رفتہ انھوں نے رومن سلطنت اور کئی دوسرے ملکوں سود پر روپے کے لین دین کا کام شروع کیا اور مال دار ہونے کے بعد ہمیشہ یروشلم پر قبضہ کرنے اور فلسطین پر اپنی حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھتے رہے۔

یہودی مذہب

بنی اسرائیل میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید الٰہی کا تصور پیش کیا۔ ان کے زمانے تک عرب اور دجلہ و فرات تک وادی میں مختلف عناصرِ قدرت کی پرستش ہوتی تھی اور ان کو بتوں کی شکل دے دی گئی تھی۔ اُر کے حکمراں ارنمو جسے مذہبی کتابوں میں نمرود کہا گیا ہے۔ اس کے دورِ حکمرانی میں حضرت ابراہیمؑ نے عناصرِ قدرت کی بجائے ایک خالق و مالک کی عبادت پر زور دیا۔ یہ تصور اس دور کے بت پرستوں کے لئے بالکل نیا تھا اس لئے انھوں نے اسے جلد قبول نہ کیا۔ ان میں سے اکثر بتوں کی عبادت بھی کرتے رہے تھے اور بہت سے خدا کی عبادت بھی کرنے لگے۔ اس عرصے میں حضرت ابراہیم کا قبیلہ بڑھنے لگا اور ان کے پوتے حضرت یعقوبؑ کے زمانے تک بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے ہو گئے۔ بعد میں بنی اسرائیل نے ہجرت کر کے مصر میں بھی اپنی آبادیاں قائم کریں مگر ان کی تہذیب میں اپنے آپ کو مدغم نہیں کیا۔ اپنے قبیلوں، اپنی زبان اور اپنے آبائی مذہب سے ان کی وابستگی برقرار رہی۔ مصر میں حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کا رہبر بنا دیا گیا اور وہ اپنی امت کو فرعون کے ظلم و ستم سے بچا کر شام کے علاقے میں لے آئے۔

یہودیوں کے نزدیک حضرت موسیٰؑ کی تعلیمات اور ان کے بعد کے پیغمبروں کی تعلیمات جن کتابوں میں محفوظ ہیں انھیں توراۃ کہا جاتا ہے۔ اس کے ۳۹ حصے ہیں جو ۸۵۰ ق م سے ۱۵۰ ق م تک کے عرصے میں ترتیب دیئے گئے۔ ان حصوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ، مذہبی تعلیمات، مذہبی دعائیں اور تہذیبی قوانین شامل ہیں۔ علاوہ ازیں شاعری، فلسفہ، تاریخ اور قوانین کا اعلیٰ امتزاج موجود ہے، لیکن حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد والے پیغمبروں کی اصل تعلیم غائب ہے۔ انجیل میں عہدِ عتیق توراۃ ہی سے عبارت ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰؑ بھی بنی اسرائیل ہی میں پیدا ہوئے

تھے اور انھوں نے یہودیوں کو اپنے آبائی مذہب پر چلنے کی دعوت دی تھی، لیکن کچھ عرصے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو یہودیت سے الگ سمجھا جانے لگا۔

یہودی مذہب میں دو اصول بہت پہلے سے کارفرما رہے اور یہودیوں کا ان پر عقیدہ رہا۔ پہلا عقیدہ خدا کی وحدانیت کا اور دوسرا عقیدہ سزا و جزا کا۔ حضرت موسیٰؑ کو طور سینا پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبوت عطا ہونے کے بعد جو ہدایات ملی تھیں وہ احکام عشرہ کی صورت میں اول اول یہودی مذہب کی تعلیمات کا بنیادی حصہ رہیں۔ مثلاً خدا کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہ بنانا، کسی جاندار کی صورت نہ بنانا اور اسے سجدہ نہ کرنا، خدا کے نام کی تعظیم کرنا، خون نہ بہانا، ماں باپ کی عزت کو واجب سمجھنا، زناکاری اور چوری سے مکمل اجتناب برتنا، اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا، اپنے پڑوسی کے مکان، بیوی، خادم، خادمہ، مویشی اور ساز و سامان پر لالچ کی نگاہ نہ ڈالنا۔ "سبت" کے دن کی تکریم یعنی چھ دن کام اور ساتویں دن کوئی کام نہ کرنا۔ یہ اصول بہت سادہ تھے اور ان پر عمل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ خدا کی وحدانیت کو قائم کیا جاتا اور ایسے معاشرے کی تشکیل ہوتی جس میں انسان کی عزت اور پاس پڑوس والوں کے حقوق کی حفاظت ہوتی، لیکن رفتہ رفتہ اصل تعلیمات کو کچھ سے کچھ بنا دیا گیا۔ پھر بنی اسرائیل کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ وہ خدا کی پسندیدہ اور منتخب امت ہیں۔ خدا کی تمام نعمتیں ان کے لئے مخصوص ہیں۔ اسی لئے یہودی مذہب کی تبلیغ دیگر قوموں میں نہیں کی گئی۔ یہودیوں نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ دنیا کی رہبری ان کے لئے مخصوص ہے اور ایک نہ ایک دن انھیں یہ فرض پورا کرنا ہے۔

ابتدا میں قربانی دینے اور کئی دوسری رسومات کا تصور نہ تھا، لیکن بعد میں کئی رسومات یہودی مذہب میں داخل ہو گئیں۔ خصوصاً جب فلسطین پر ان کا قبضہ ہوا تو وہاں کے عقائد بھی یہودیت میں شامل ہو گئے بلکہ کچھ عرصے تک یہودیوں نے کنعانیوں کے دیوتا یعنی بچھڑے کی بھی عبادت کی لیکن یہودیوں کے پیغمبروں نے انھیں خدا کے قہر سے ڈرایا تو وہ اس شرک سے باز آئے۔ آگے چل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احکام عشرہ کی جگہ سات باتوں سے منع کرنے کی تعلیم رائج رہی۔ مثلاً بت پرستی، زنا، قتل، چوری، زندہ جانوروں کے اعضا کاٹ کر کھانے، جانوروں کو آختہ کرنے اور عجیب الخلقت جانوروں کی افزائش نسل سے روکا گیا۔

یہودی مذہب میں یہ سات قوانین بڑی اہمیت اختیار کر گئے اور ان کی نسبت سے سات کا عدد بھی بہت اہم سمجھا جانے لگا جس کے مطابق چھ دن کام کرنا اور ساتویں دن کوئی کام نہ کرنا مذہبی اصول بن گیا۔ یہاں تک کہ دشمنوں سے لڑنا بھی اس دن کے لئے ممنوع قرار دیا گیا۔ ہفتے کے آخری دن کی رسومات میں آقا اور غلام یکساں شریک ہوتے تھے۔ جانوروں کو بھی آرام دیا جاتا تھا۔ ہر چھ سال بعد ساتویں سال نہ تو زمین پر کاشت کی جاتی تھی نہ غلّہ اور انگوروں کو جمع کیا جاتا تھا۔ قرضوں کو معاف کر دیا جاتا تھا تاکہ غریبوں کو مصیبت سے نجات ملے۔ سات مرتبہ سات سال کے بعد ایک جوبلی سال منایا جاتا جس میں تمام غلام آزاد کر دیئے جاتے۔ زمینوں پر سے افراد کی ملکیت ختم کر دی جاتی۔ تصور یہ تھا کہ زمین خدا کی ملکیت ہے۔ انسان پیداوار تو بڑھا سکتا ہے، لیکن زمین کو فروخت نہیں کر سکتا۔ شروع شروع میں قرض دی گئی رقم پر کوئی سود لینا جائز نہیں تھا، لیکن جب یہودی تاجر بن گئے تو سود کا کاروبار شدت سے ہونے لگا۔

بعد میں انھوں نے اپنے طور پر مذہبی تعلیمات کو بالکل مسخ کر دیا اور ایسے قوانین بنا لئے جن کی رُو سے روپے کے لین دین میں معاہدے کر سکیں اور خوب منافع کما سکیں۔ اس طرح کچھ عرصے بعد یہودی ایک سُود خور قوم کی حیثیت اختیار کر گئے۔

یونانی تہذیب

شہری ریاستوں کے قیام سے سکندرِ اعظم کی عظیم الشان سلطنت کے وجود تک یونانیوں نے دنیا میں صرف سیاسی برتری حاصل نہیں کی بلکہ ادب، فلسفہ، سائنس، تاریخ، عمارت سازی، مجسمہ سازی اور کئی علوم و فنون ساری دنیا کی رہنمائی کا رتبہ بھی حاصل کیا۔

یونانی سلطنت اور قدیم یونانی قوم تباہ و برباد ہو گئی۔ مگر یونان کے علوم و فنون کی تاریخ زندہ رہی۔ سبب یہ تھا کہ یونان کی شہری ریاستیں جمالیاتی ذوق بھی رکھتی تھیں۔ اسی لئے انھوں نے شاعری، ڈرامہ، رقص و موسیقی، تاریخ نویسی، فلسفہ دانی اور خطابت جیسے شعبوں میں نام پیدا کیا۔ وہاں ہیروڈوٹس جیسا بابائے تاریخ پیدا ہوا۔ فلسفے میں سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسی شخصیات ابھریں۔ سائنس میں ارشمیدس کا نام نمایاں ہوا۔ غرض یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تین چار سو برس پہلے ہی یونان مہذب دنیا کا ایک اہم تہذیبی مرکز بنا۔ اس دور کی عالمی شہرت یافتہ شخصیات کا تفصیلی ذکر توفی الوقت ہم نہیں کرتے۔ صرف عمارت سازی اور مجسمہ سازی ہی کو موضوع بناتے ہوئے تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یونان میں عمارت سازی کی ابتدا مندروں کی تعمیر سے ہوئی۔ شروع شروع میں لکڑی اور پتھروں کی مدد سے عمارتیں کھڑی کی گئیں اور جب ایرانیوں نے یونان پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا تو وہ تمام عمارتوں کو راکھ کا ڈھیر بنا گئے۔

یونانیوں نے دوبارہ اپنی عمارتوں میں لکڑی کا استعمال بالکل نہیں کیا بلکہ مختلف پتھروں اور مصالحوں سے عالی شان عمارتیں بنائیں۔ عمارتوں میں کثرت سے مضبوط ستون

بنائے۔ اس طرح یونانیوں نے اپنا جداگانہ طرزِ تعمیر ایجاد کیا جس میں ایک مخصوص دلکشی اور جمالیاتی توازن تھا۔ وہ عالیشان مندروں کی تعمیر میں بھی بہت آگے رہے۔ مندروں کی پرشکوہ عمارتوں میں جو بُت رکھے گئے، وہ بھی بڑی رعنائی کا ثبوت دیتے تھے۔ زیادہ توجہ اس بات پر رکھی، شان دار مندروں اور شاندار عمارتوں میں مجسّمے بھی بہت خوبصورت ہوں۔ اسی وجہ سے اپنے دورِ عروج میں ایتھنز کو یونان کی ملکہ کہا گیا۔

یونانیوں کے پاس سونا بڑی بھاری مقدار میں تھا جسے انھوں نے فراغ دلی سے مجسّمہ سازی کے لئے بھی استعمال کیا۔ سونے کے ساتھ ساتھ ہاتھی دانت سے بھی بڑا کام لیا۔ انھوں نے مندروں کی دیواروں پر اپنی دیومالائی کہانیوں کے کرداروں کی تصویریں بھی بڑی عمدگی سے بنائیں۔ تاہم مجسّمہ سازی میں تو وہ یکتائے روزگار تھے۔ بقول پروفیسر میتھو آرنلڈ "حقیقت کا راستہ پانے کے لئے بائبل کے ساتھ ساتھ یونانی مجسّموں اور تصویروں سے بھی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے حقیقت کا راستہ پانے کے لئے عقیدۂ توحید و رسالت سے زیادہ بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ مگر اس تاریخی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یونانی تہذیب نے ساری دنیا پر اپنا اثر ڈالا۔

یونان کی تہذیبی عظمت تاریخِ ماضی کا ایک شاندار باب ہے۔ موجودہ زمانے میں مختلف علوم اور فنونِ لطیفہ میں ترقی ہوئی ہے، اس کی بنیادیں صدیوں پہلے یونان میں رکھ دی گئی تھیں۔ یہ عجیب بات تھی کہ مذہبی عقائد نے یونانیوں کو تنگ نظر نہیں ہونے دیا۔ بے شک وہ دیوی دیوتاؤں کے پرستار تھے۔ لیکن ہر کام کے لئے دیوتاؤں کی خوشنودی کے پابند نہیں تھے۔ وہ اپنے دیوتاؤں کو سجاتے بناتے تھے، ان سے خائف نہیں رہتے تھے۔ اسی حوصلہ مندی اور فراخ دلی نے انھیں حسن و جمال کی قدروں سے بہرہ ور کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے اندر جمالیاتی ذوق بہت زیادہ تھا۔ ہر چیز اور ہر شعبۂ حیات میں وہ خاص حسنِ ترتیب دیکھنے کے عادی تھے۔ جس کا ثبوت اب ان آثارِ قدیمہ سے بھی ملتا ہے جو عہدِ رفتہ کی یونانی تہذیب کے نوادرات ہیں۔

۷۵۰ قبل مسیح سے ۶۵۰ قبل مسیح کے عرصے میں یونانی زبان نے بھی اتنی ترقی کر لی تھی کہ فنِ تحریر میں اس کا بھرپور عکس ملتا ہے۔ ان کی نظمیں، گیت اور ڈرامے جو دورِ شجاعت سے تعلق رکھتے ہیں، آنے والے ادوار کے لئے چراغِ راہ ثابت ہوئے۔ مثلاً ہومر کی رزمیہ نظمیں جو آج تک ادبِ عالیہ میں شمار ہوتی ہیں۔ ہومر کے بعد یونانی شاعر ہیسی اوڈ (Hesiod) نے رزمیہ نظموں کے بجائے انسان کی روزمرہ کی زندگی اور انسانی فرائض کے بارے میں زوردار نظمیں لکھیں۔ اس سلسلے میں اس کی سب سے مشہور نظم "کام اور ایام (Work & days)" ہے جس میں کاشتکاروں کے عملی مسائل، مزدوروں کی ہدایات اور موسموں کی تبدیلی کا نہایت خوبصورت انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان نظموں سے درس و تدریس کا کام لیا گیا ہے اور یہ یونانیوں کی عام زندگی پر اثر انداز ہوئیں۔ سیفو (Sappho) کا نام یونانی شاعری میں غنائیت اور رومانیت کے حوالے سے بہت نمایاں ہے۔ ہومر کے بعد اسے بڑا درجہ دیا جاتا ہے۔ ایک اور بڑا نام پینڈر (Pendar) کا ہے جس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان کے قومی جذبات کی ترجمانی کی۔

یونان میں حزنیہ اور طربیہ ڈراموں کا آغاز رقص و سرور کی محفلوں سے ہوا۔ یونانی ڈراموں میں مذہبی عناصر کو اہمیت حاصل رہی ہے اور ان میں کورس کے ساتھ ساتھ زوردار مکالمے بھی شامل رہے ہیں۔ ڈرامے کے لئے باقاعدہ اسٹیج بنائے جاتے تھے۔ اسکائی لیس یونان کا وہ مشہور ڈرامہ نگار تھا جسے بہترین حزنیہ ڈرامہ نویسی کے سلسلے میں بارہ مرتبہ انعام سے نوازا گیا۔

حزنیہ اور رزمیہ ڈرامہ نگاروں میں اور بھی کئی نام آتے ہیں مثلاً سفوکولس اور ارسطو فینیز وغیرہ۔ جغرافیہ، ریاضیات اور جیومیٹری جیسے علوم کے علاوہ علم فلکیات پر بھی یونانیوں نے خصوصی توجہ دی۔

سکندرِ اعظم کے بعد اسکندریہ یونانی علوم کا مرکز بن گیا تھا جسے بطلیموس حکمرانوں نے علوم و فنون کا شاندار گہوارہ اور عظیم تہذیبی مرکز بنایا۔

رومن امپائر

جب روم کے لوگوں نے اپنی چھوٹی سی ریاست میں عوامی جمہوریت کی جڑیں مستحکم کر لیں تو بعض اوقات ان کو باہر کے حملہ آوروں کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے اطالوی شہروں کا ایک اتحاد ۴۹۳ ق م میں اس غرض سے ہوا کہ بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ مل جل کر کیا جائے۔ چونکہ روم کی اہمیت زیادہ ہو گئی تھی اس لئے فوجی اتحاد میں اسی کو لیڈر تسلیم کیا گیا۔

یہ اتحاد اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں اتحادیوں کی طاقت سب سے زیادہ سمجھی جانے لگی اور اس اتحادی طاقت کو ۳۹۰ ق م میں ایک ایسی بربری قوم سے مقابلہ کرنا پڑا جو اپنے ساتھ آگ اور خون کا سیلِ بلا لائی تھی۔ اٹلی کے شمال سے گال قبیلوں (Gauls) نے روم پر حملہ کر دیا اور شہر کے بڑے علاقے کو آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ وہ پہاڑی کے بڑے قلعے کا محاصرہ کافی عرصے تک کئے رہے اور بھاری تاوان لینے کے بعد ٹلے۔ پھر جو رومن خوفزدہ ہو کر اپنا وطن چھوڑ گئے تھے، واپس آ گئے۔ نئے سرے سے روم کی تعمیر کی گئی اور اس مرتبہ حفاظتی دیوار کو بطورِ خاص تعمیر کیا گیا تاکہ حملہ آوروں کو روم میں داخل ہونے سے روکا جائے۔

روم کی تعمیرِ نو اس کی طاقت میں اضافے کا سبب بنی اور روم کے لوگوں نے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ صورتِ حال لاطینی اتحادیوں کے لئے تشویش کا سبب بنی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روم اور دیگر لاطینی ریاستوں میں جنگوں کا آغاز ہوا اور یہ جنگیں ۳۳۸ ق م تک جاری رہیں۔ آخر روم کی فتح ہوئی اور جنگوں کا خاتمہ ہو گیا۔

ہر لاطینی شہر یا قبیلے نے روم سے الگ الگ معاہدہ کیا اور سب نے روم کی برتری کو پوری اہمیت دی۔ یہی نہیں بلکہ بعض شہروں پر روم کی حکومت قائم ہوگئی۔ اندرونی معاملوں میں ان کو آزاد رکھا گیا۔ لیکن بیرونی امور میں ان کو روم کی اطاعت کرنی پڑی۔ جن شہروں پر روم کا قبضہ ہوگیا وہاں کے باشندوں کو رفتہ رفتہ روم کی شہریت کے حقوق مل گئے۔ اس طرح رومی شہریت صرف روم تک محدود نہ رہی بلکہ اس کا تصور وسیع ہوگیا اور پھر سے نئے شہروں کو سینیٹ اور اسمبلی میں بھی اپنے نمائندے بھیجنے کا حق حاصل ہوا۔ گویا لاطینی شہروں پر ۳۳۸ ق م میں روم کی برتری قائم ہو جانے سے رومی سلطنت کا آغاز ہوا۔ اور روم اٹلی کی سب سے اہم ریاست کے درجے پر پہنچ گیا۔

جس زمانے میں روم دیگر اطالوی ریاستوں پر قبضہ کر رہا تھا، اسے ایک ایسے قبیلے سے مقابلہ کرنا پڑا جس کے لوگ بہت جنگجو اور بہادر اور سخت جان تھے۔ یہ سامتی قبیلہ (Sammities) اطالوی نسل سے تھا اور وسطِ اٹلی کے پہاڑی علاقے اس قبیلے کے پاس تھے۔ روم کے بڑھتے ہوئے اثرات کو اس قبیلے کے لوگوں نے برداشت نہ کیا اور روم سے اس کی جھڑپیں شروع ہو گئیں جو ۳۴۳ ق م سے ۲۹۰ ق م تک جاری رہیں۔ ان جنگوں میں ایت رسکن اور گال قبیلے نے بھی روم کے دشمنوں کا ساتھ دیا۔

روم کی بڑھتی ہوئی حیثیت اور ہوسِ ملک گیری کے سبب سامتی قبیلے سے جو طویل جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں روم کے پرانے دشمن بھی سامتی قبیلے کے ساتھ ہو گئے اور سوائے جنوبی اٹلی کے سبھی چھوٹی بڑی ریاستیں اور قبیلے میدانِ کارزار میں آ گئے۔ شروع میں تو سامتی اور اس کے اتحادیوں کو روم کے مقابلے میں فتوحات حاصل ہوئیں لیکن پھر ۲۵۹ ق م میں ایسی شکستِ فاش کا منہ دیکھنا پڑا کہ سامتی قبیلے بھی روم کی برتری قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ تب پورے وسطِ اٹلی پر روم کا پرچم لہرانے لگا اور تقریباً دو ہزار سال تک روم نہ صرف اٹلی میں برسرِ اقتدار رہا بلکہ یورپ، ایشیا اور افریقہ میں اسے سب سے بڑی طاقت کا درجہ حاصل ہو گیا۔

۲۹۰ ق م میں تمام وسطی اٹلی اور شمال کے تھوڑے سے حصے پر روم نے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

شمال کے باقی حصے پر گال قبیلہ حکمراں تھا اور ایت رسکن قبیلے کا اقتدار بالکل ختم ہو چکا تھا۔ جنوبی اٹلی کا علاقہ اس وقت تک یونانی نوآبادیات میں شامل تھا۔ اس طرح روم کے مقابلے میں صرف دو طاقتیں تھیں۔ یونانی نوآبادیات اور کارتھیج کی نوآبادیات۔

سامنتی قبیلے کو شکست دینے کے بعد دس برس کے اندر روم نے یونانی نوآبادیات پر حملے شروع کر دیے۔ یونانی عیش و عشرت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ لہٰذا روم کی ابھرتی ہوئی طاقت کے سامنے ان کا ٹھہرنا مشکل تھا، مگر یونانیوں نے اپی رس (Epirus) کی ریاست سے مدد طلب کی جو اٹلی اور یونان کے درمیان واقع تھی۔ اس کے تیس ہزار فوجی اور جنگی ہاتھی روم کے مقابلے پر آئے اور رومن فوج پر کامیابی حاصل کی۔ لیکن یہ کامیابی مہنگی پڑی کیونکہ اس کے ہزاروں سپاہی مارے گئے۔ اپی رس نے اس فتح پر کہا، اگر ایسی ہی ایک اور فتح حاصل ہوئی تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ اسی لئے ایسی فتح کو جس میں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے "اپی رس وکٹری" کہا جاتا ہے۔ اپی رس جنوبی علاقوں سے ہوتا ہوا سسلی تک پہنچ گیا۔ سسلی کا کچھ حصہ یونانی نوآبادیات میں شامل تھا اور کچھ حصہ کارتھیج کی نوآبادیات میں۔

کارتھیج کے لوگ ان دنوں بحیرۂ روم کے علاقوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھے۔ وہ یہ کب برداشت کرتے کہ یونانی ان کی نوآبادیات پر حملہ آور ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپی رس کے بحری بیڑے کو شکست دی اور روم کی بری فوج نے اپی رس کی فوج کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ ان شکستوں کے بعد اپی رس یونانی نوآبادیات کو روم اور کارتھیج کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی سلطنت کو واپس چلا گیا۔ سسلی سے رخصت ہوتے وقت اس نے کہا تھا کہ وہ سسلی کو روم اور کارتھیج کے درمیان جنگ کا سبب بنا کر جا رہا ہے۔ لیکن روم کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ۲۷۰ ق م میں اٹلی کی تمام نوآبادیات پر قبضہ کر لیا اور کارتھیج سسلی کے پورے جزیرے پر قابض ہو گیا۔ اس لئے ایک طرف روم کا اقتدار بڑھا اور دوسری جانب کارتھیج کی ریاست بھی بہت طاقتور ہو گئی۔

رومن اور کارتھیج کی لڑائیاں

قدیم قوموں میں ایک نام فنیقی قوم کا تھا جو کنعان (فلسطین) کے علاقے میں ایشیائے کوچک کے مغربی ساحلوں پر آباد تھی۔ یہ لوگ ایک ہزار سال قبل مسیح تک دولت مند تاجر بن گئے تھے اور ان کے تجارتی جہازوں نے آس پاس کے سمندروں میں اپنی برتری قائم کر رکھی تھی۔ حالانکہ وہ کوئی بڑی قوم نہ تھی لیکن دولت اور طاقت سے اس نے اپنی کچھ نوآبادیات قائم کر لی تھیں اور چونکہ تہذیب و تمدن کے آداب سے کافی حد تک واقف تھی اس لئے اس نے یورپ اور افریقہ کی اکثر قوموں کو مہذب بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

فنیقیوں ہی نے وہ حروف ایجاد کئے تھے جنھیں پہلے یونان نے پھر روم نے اور بعد میں تمام یورپ نے اپنا لیا۔ فنیقی نوآبادیات میں اسپین کے جنوبی ساحل اور افریقہ کے شمالی ساحل کی نوآبادیات نے بڑی تیزی سے ترقی کی تھی۔ افریقی ساحل کی نوآبادیات میں کارتھیج ایک نئے شہر کے طور پر سب سے بڑی نوآبادی کا مرکز بن گیا تھا جسے ۸۰۷ ق م میں آباد کیا گیا اور فنیقی یہاں کثیر تعداد میں آباد ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد کارتھیج کی نوآبادی فنیقی سلطنت کے سیاسی اثرات سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور یہاں امیر تاجروں کے گروہ کی حکومت قائم ہو گئی۔ پہلے ان کا مقصد دنیا کی تجارت پر قابض ہونا تھا جس کے لیے اکثر طاقت بھی استعمال کرنی پڑتی تھی۔ اسی لیے انھوں نے عارضی فوج بنائی اور سپاہی بھرتی کئے۔ رفتہ رفتہ وہ ایک بڑی فوج بن گئی۔

روم کی بڑھتی ہوئی طاقت کارتھیج کے لوگوں کو خطرناک محسوس ہوئی مگر جنگ کرنا اس سے بھی زیادہ خوفناک مسئلہ تھا۔ کارتھیج کے لوگوں نے پہلے روم کی مدد بھی کی تھی لیکن تعلقات کی نوعیت بدل گئی اور آخرکار جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو ۱۱۸ سال تک جاری رہیں۔ یہ جنگیں تین

سلسلوں میں لڑی گئی اور ان کو پیونک جنگوں (Punic Wars) کا نام دیا جاتا ہے۔ کیونکہ کارتھیج کے لیے اطالوی لفظ پیونک استعمال کیا گیا تھا۔

پہلی پیونک جنگ ۲۶۴ سے ۲۴۱ ق م تک جاری رہی۔ ہوا یہ کہ سمندری ڈاکوؤں کے خلاف سسلی کی کارتھیج فوج کے کارروائی کی، ڈاکوؤں نے روم سے مدد مانگی جو انھیں مل گئی اور اس طرح جنگوں کا آغاز ہوگیا۔ اس وقت روم کی بحری طاقت برائے نام تھی اس لیے شکست ہوئی اور روم کے لوگوں کا بہت جانی و مالی نقصان ہوا لیکن روم نے جلد ہی دوبارہ بحری بیڑہ تیار کر لیا اور کارتھیج کی بحری فوج کو مکمل طور پر شکست دی۔ سسلی اور اس سے ملے ہوئے جزیرے روم کی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ سسلی اور دیگر جزیروں کے نقصان کی تلافی کارتھیج نے اس طرح کی کہ اسپین کے علاقوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ان فتوحات کو روم نے اپنے لیے خطرہ سمجھا اور کارتھیج سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ اپنی اسپینی فتوحات کو دریائے ایبرو (Ebro) کے کنارے تک محدود رکھے گا۔ کارتھیج نے مصلحتاً معاہدہ کر تو لیا لیکن وہ روم کی بیجا مداخلت سے خوش نہ تھے بلکہ روم کے خلاف ان کے دل میں سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نفرت کا انجام یہ ہوا کہ اسپین کے کارتھیجی گورنر نے روم سے بدلہ لینے کے لیے اپنے نوسالہ بیٹے ہنی بال سے یہ قسم لی کہ وہ ساری عمر رومن قوم سے نفرت کرے گا۔ آگے چل کر جب ہنی بال ۲۶ سال کی عمر میں اسپین کا گورنر بنا تو اس وقت تک اسپین کے اکثر شہر روم کے زیر اثر آچکے تھے۔ انھیں شہروں میں سے ایک شہر سگنٹم (Saguntum) پر ہنی بال نے ۲۰۸ ق م میں حملہ کر دیا اور قبضہ کر لیا۔ روم نے اسے روکنے کو ایک وفد بھیجا جو ناکام رہا اور جنگ کی صورت پیدا ہو گئی۔ ایک لاکھ سے زیادہ سپاہیوں اور ۳۷ جنگی ہاتھیوں کی فوج اٹلی کی سرحدوں پر پہنچ گئی۔ لیکن دشوار پہاڑی راستوں اور برف پوش پہاڑوں کے سبب ہزاروں سپاہی مر گئے۔ صرف ۲۶ ہزار سپاہی وادی میں داخل ہو سکے جبکہ ادھر سات لاکھ فوجی موجود تھے جن میں سے ستر ہزار جنگ میں شریک ہوئے۔ ہنی بال کے سامنے جنگ کی دو صورتیں تھیں۔ یا تو وہ روم کی طرف پیش قدمی کر کے حملہ آور ہو یا پھر ان ریاستوں پر حملہ کرے جو روم کی اتحادی تھیں۔ اس نے دوسری صورت پر عمل کیا لیکن اسے ہر محاذ پر روم کی فوجوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ پہلے مقابلے میں رومن فوج کو شکست ہوئی اور اٹلی کے جنوبی ساحلی شہروں پر ہنی بال کا قبضہ ہو گیا۔ اب اس کی فوج میں گال قبیلے کے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ روم کے لیے یہ بات باعث تشویش تھی۔ روم نے کھلم کھلا مقابلے کی بجائے گوریلا جنگ لڑنی

شروع کی اور اس عرصے میں مزید اسی ہزار سپاہیوں کی فوج تیار کرلی۔

رومن فوج ہنی بال کا مقابلہ کرنے کے لیے جنوبی ساحل کی طرف روانہ ہوئی۔ کنائے کے مقام پر بہت ہی خوں ریز جنگ ہوئی اور پوری رومن فوج موت کے گھاٹ اتر گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی کے اکثر شہروں نے روم کے خلاف بغاوت کردی اور ہنی بال کے لیے شہر کے دروازے کھول دیئے۔ اس وقت ہنی بال روم پر بھرپور حملہ کرنا چاہا لیکن وہاں کے مضبوط قلعے کو فتح کرنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی اس نے راستے کے شہروں کو فتح کرکے روم کا محاصرہ کرلیا، مگر افریقہ اور اسپین سے کمک نہ پہنچنے کے سبب اور فوج کی کمی کے باعث روم کا محاصرہ بے سود ثابت ہوا۔ رومیوں نے اپنے شہر کی حفاظت کے لیے جان ومال کی بازی لگادی۔ آخر محاصرہ اٹھانا پڑا اور ہنی بال جنوب کی طرف پلٹنے لگا۔ روم نے ان شہروں پر حملہ کر دیا جو باغی ہو کر ہنی بال کے زیرِ اثر آگئے تھے۔

علاوہ ازیں رومیوں نے ایک فوج اسپین کی طرف روانہ کی تاکہ ہنی بال کے بھائی کا راستہ روکے جو بھاری فوج کمک کے طور پر لا رہا تھا۔ کامیابی رومیوں کو ہوئی۔ ہنی بال کے بھائی کو شکست ہوئی۔ وہ جنگ میں مارا گیا اور اس کا سر تحفے کے طور پر ہنی بال کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس شکست کا ہنی بال کو بہت صدمہ ہوا۔ ویسے بھی اسے جنگ کرتے ہوئے دس برس ہو چکے تھے اور وہ روم کو فتح نہیں کر سکا تھا۔

روم کا دورِ شہنشاہیت

جب جولیس سیزر نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ، عظیم الشان فتوحات اور رومی سلطنت کے پُرانتشار حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو مطلق العنان ڈکٹیٹر بنا لیا تو روم کے بڑے عہدے اس کے قبضے میں آگئے اور وہ رومن مذہب کا بھی سب سے بڑا رہنما بن گیا۔ اس طرح سیاسی اور مذہبی تمام طاقتیں اس کی تاریخ ساز شخصیت میں مرکوز ہوگئیں۔ اس کے سامنے صرف اپنی برتری نہیں تھی بلکہ روم کی برتری بھی تھی۔ لیکن اس کی بے پناہ طاقت اور عوامی مقبولیت کے دشمن بھی پیدا ہوگئے۔ روم کے جن آٹھ افراد نے جولیس سیزر کے خلاف سازش کی ان میں پیش پیش کیش (Kassius) اور بروٹس (Brutus) تھے۔ جشنِ بہار کے دوران جب سیزر سینٹ کے وسیع ہال میں داخل ہوا تو دشمنوں نے اس پر حملہ کر دیا اور وہ ۴۴ ق.م میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔

جولیس سیزر کے قتل پر روم کے عوام سخت برہم ہوئے۔ انھوں نے اس کے حامیوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح سیزر کا خاص دوست اور مشیر اینٹونی (Antony) روم پر قابض ہوگیا۔ اس نے جمہوریت پسندوں کو چُن چُن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ بروٹس اور کیشس اپنی جانیں بچا کر مقدونیہ بھاگ گئے۔ سیزر نے اپنے تحریری وصیت نامے میں اکیتون (Octavian) کو جانشین نامزد کیا تھا جو اس کا بھتیجا اور گود لیا تھا۔ وہ اس وقت صرف ۱۸ سال کا تھا اس لئے اینٹونی نے اسے نظر انداز کر دیا لیکن وہ نوجوان بھی ہوشیار تھا۔ اس نے فوج کی مدد سے اقتدار حاصل کیا۔ اینٹونی سے جنگ کرنے کی بجائے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے روم کی سلطنت کے تین حصے ہوگئے۔ ایک پر اینٹونی برسرِ اقتدار ہوا، ایک حصّہ اکیتون کے دوست لیپی دس (Lepidus) کو ملا۔ کچھ عرصے بعد اس حصّے پر بھی اکیتون کا قبضہ ہوگیا۔

اُدھر مشرقی حصے میں اینٹونی قلوپطرہ کے حسن و جمال کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ اسکندریہ میں ایرانی

بادشاہوں کی طرح دادِ عیش دے رہا تھا۔ اسی قوم میں اکیتون اور اینٹونی کے مابین فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ جنگ کا بگڑتا ہوا نقشہ دیکھ کر قلوپطرہ اپنے جہازوں کو لے کر بھاگ گئی اور اینٹونی کو میدان چھوڑنا پڑا۔ اکیتون نے اینٹونی اور قلوپطرہ کا تعاقب کیا۔ قلوپطرہ اس بار بہت حکمران پر بھی اپنے حسن کا جادو جگانا چاہتی تھی مگر ناکام رہی آخر اینٹونی نے خنجر گھونپ کر اور قلوپطرہ نے خود کو سانپ سے ڈسوا کر خودکشی کر لی۔

اکیتون آگسٹس کی حیثیت روم کی وسیع اور طاقتور سلطنت میں شہنشاہ کی ہوگئی تھی لیکن اس نے پھر بھی جمہوری روایات اور سینٹ کو برقرار رکھا۔ مگر سینٹ اس کی مرضی کی پابند تھی۔ پھر بھی اس نے ڈکٹیٹر کی بجائے خود پر نسپس (Princeps) یعنی سب سے پہلا شہری کہلانا پسند کیا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے جمہوریت کی آڑ میں شخصی حکومت قائم کر لی تھی۔ سینٹ نے اسے آگسٹس (Augustus) کا خطاب دیا اور اسی نام سے تاریخ میں مشہور ہوگیا۔ اس نے سلطنت کو مزید وسعت دینے کی بجائے بہتر انتظامی امور پر توجہ دی۔ صوبائی حکومتوں کا انتظام تجربہ کار اور ایمان دار افسروں کے سپرد کیا۔ ٹیکسوں میں کمی کی۔ آمدنی اور اخراجات میں توازن پیدا کیا۔ سرحدوں کی حفاظت پر چاق و چوبند فوج رکھی۔ دارالحکومت کو بہت عالی شان بنانے کا اہتمام ملحوظِ خاطر رکھا۔

اگرچہ آگسٹس روم کی سلطنت کا پہلا مطلق العنان حکمران تھا لیکن اس نے اپنے تمام اختیارات کو تعمیری کاموں پر صرف کیا۔ عالی شان محلات، کشادہ سڑکیں، خوبصورت باغات، پرکشش مندر اور فلاحی اداروں کا قیام اس کی ترجیحات میں شامل رہے۔ مندروں میں اس نے جولیس سیزر کو دیوتاؤں کی جگہ دی اور اس کی عبادت کو عوام و خواص میں پھیلایا۔ اس کا کہنا تھا "روم اینٹوں سے بنی ہوئی بستی تھی جس کو میں نے سفید پتھروں کا شہر بنا دیا" اس کی سرپرستی میں لیوی (Livy) نے چالیس سال کی محنت سے روم کی تاریخ لکھی۔ اسی زمانے میں ورجل جیسا شاعر پیدا ہوا جو ہومر کی طرح مقبول ہوا۔

آگسٹس کے عہد کا سب سے اہم واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہے جو رومن سلطنت کے ایشیائی شہر بیت اللحم میں ہوئی۔ ۴۴ سال حکومت کرنے کے بعد آگسٹس کا انتقال ۱۴ء میں ہوا۔ اس کے بعد اسی خاندان کے چار حکمرانوں نے روم پر حکومت کی۔ یہ سارے حکمران چونکہ اپنا رشتہ جولیس سیزر سے ملاتے تھے، اس لئے ان کو جولین سیزر کہا گیا۔ ان میں سے دو حکمران تو اچھے انتظامی

لاحتیں رکھتے تھے لیکن کلی گولر (Cali Gulan) اور نیرو (Nero) اپنی عیاشیوں اور ظالمانہ و وحشیانہ حرکتوں کی وجہ سے تاریخ میں بہت بدنام ہوئے۔ نیرو نے اپنی ماں اور بیوی کو مروا دیا۔ عیسائیوں کا قتل عام کیا اور روم کو آگ لگادی۔ "روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا۔" ۶۸ء میں نیرو کی خودکشی کے بعد جولین سیزر شہنشاہوں کا دور ختم ہوا۔ ان کی جگہ فلاوی (Flavian) حکمرانوں نے لی جو فوجی طاقت کے زور پر آئے تھے۔ اسی عہد میں یہودیوں نے بغاوت کی اور یروشلم تباہ و برباد ہوا۔ پومیائی کے پہاڑ سے لاوا ابلا جس سے کئی شہر ویران ہو گئے۔

فلاوی حکمران تیس سال حکومت کرتے رہے پھر روم کی شہنشاہیت میں پانچ عمدہ بادشاہوں کا دور آیا جسے انتونی دور کہا جاتا ہے۔ ان کے نام نروا (Nirva)، تراجن (Trajan) ہیدرین (Hadrian) اور مارکس اریلی تھے۔ آخری بادشاہ مارکس اریلی فوجی جرنیل ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی تھا۔ جس نے اپنے فلسفے کی بنیاد انسانیت سے محبت پر رکھی لیکن عیسائیوں کو بڑے پیمانے پر قتل بھی کرایا حالاں کہ اس سے پہلے کے بادشاہوں نے عیسائیوں پر ظلم بند کر دیے تھے اور تمام رعایا کی خوشحالی اور عمومی ترقی کے کام زیادہ کئے تھے۔

۱۸۰ء میں مارکس اریلی کے بعد روم کی عظیم سلطنت بری طرح خانہ جنگی کا شکار ہوئی۔ یہ صورت حال دو سو سال تک رہی اور اس عرصے میں آس پاس کے حملہ آور قبائل اور بیرونی طاقتیں زور پکڑتی رہیں۔ ۲۸۲ء تک تقریباً پندرہ شہنشاہوں کی حکومت رہی مگر خانہ جنگی بدستور رہی۔ ۲۸۵ء میں ڈیوکلیشن بادشاہ بنا تو اس نے شہنشاہیت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ آگے چل کر اس کے چار حصے ہو گئے۔ پھر قسطنطین کی حکمرانی رہی جس نے عیسائی مذہب اختیار کیا۔ اس کے بعد بازنطینی دور آیا۔ مگر انجام یہی ہوا کہ رومن سلطنت ہمیشہ کے لئے دم توڑ گئی۔

یونان اور ایران کی جنگیں (دوم)

۵۰۰ ق م میں ایران اور یونان کی جنگوں کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ ایران کی زبردست فوجی طاقت بھی یونانیوں کو زیر نہ کر سکی۔ شہنشاہ دارا اسی حسرت میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ پھر اس کے جانشینوں نے مکمل طور پر یونان کو فتح کرنے کے خواب دیکھے لیکن ادھر یونانی بھی اپنے آپس کے اختلافات بھلا کر متحدہ فوجی قوت بن گئے۔ ۴۸۰ ق م میں شہنشاہ ایران نے جب یونان پر بھرپور حملہ کیا تو یونانیوں نے درّہ تھرموپلی (Thermopylae) پر ایران کی پیش قدمی کو روک دیا۔ ایرانی فوجوں نے چار دن تک تو انتظار کیا کہ یونانی فوجی مرعوب ہو کر مقابلے سے باز آجائیں، لیکن جب ایسا نہ ہوا تو پانچویں دن ایرانی سپہ سالار نے اپنی بھاری فوج کو پوری طاقت سے حملہ آور ہونے کی اجازت دے دی۔ اسپارٹا کے سپاہیوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن ایک یونانی سپاہی کی غداری نے ایرانیوں کو ایسے خفیہ راستے سے باخبر کر دیا جس کے ذریعے ایرانی فوج نے اسپارٹا کے سپاہیوں کو پیچھے سے بھی جا گھیرا۔ اس طرح یونانی درّہ تھرموپلی میں پھنس کر رہ گئے۔ پھر بھی انھوں نے جان پر کھیل کر مقابلہ جاری رکھا۔ ان کا فوجی جرنیل جنگ میں مارا گیا تو وہ اس کی لاش کے گرد جمع ہو گئے اور تین سو سپاہیوں نے اس پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ ان سپاہیوں کی بہادری کی داستانیں اہلِ یونان کو بے حد عزیز رہی ہیں اور اسپارٹا کی شجاعت کو وہ آج بھی خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

تھرموپلی کی فتح کے بعد ایرانیوں نے ایتھنز کا رخ کیا۔ یونانی اپنے شہر خالی کرتے گئے اور انھیں خود ہی تباہ و برباد کرتے گئے تا کہ دشمن کو سوائے کھنڈرات کے کچھ نہ ملے۔ ایتھنز بھی خالی کر دیا گیا۔ ایرانیوں نے اسے بے دردی سے لوٹا اور تمام عبادت گاہوں کو آگ لگا دی۔ ایتھنز پر ایرانیوں کا قبضہ تو ہو گیا مگر یونان کا بحری بیڑہ ایران کے بحری بیڑے کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ یونانیوں

نے وہ چال چلی کہ ایران کے بحری بیڑے کو سلامیز کے تنگ خلیج میں محصور کر دیا۔ ان کی زبردست بحری طاقت مصیبت کا باعث بن گئی کیوں کہ یونانیوں نے جو خلیج سے خوب آشنا تھے ایرانی جہازوں پر ایسے حملے کئے کہ تمام ایرانی بیڑہ تباہ ہو گیا۔

ایرانیوں کی بری فوج تمام یونان کو فتح کرنے کے لیے کافی تھی مگر بحری بیڑے کی تباہی نے انھیں واپسی پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنی کچھ فوج ایک جنرل کی کمان میں وہاں چھوڑ گئے لیکن بعد میں یونانیوں نے اسے بھی پسپا کر دیا اور ایرانی سپہ سالار لڑائی میں مارا گیا، باقی فوج بھاگ گئی۔ اس طرح ۴۷۸ ق م میں یونانی ریاستیں ایرانی اثرات سے آزاد ہو گئیں اور انھیں ایک بہت بڑے دشمن سے وقتی طور پر چھٹکارا مل گیا۔

روم کی جمہوریت سے شہنشاہیت تک

مشہور مقولہ ہے کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" اس فارسی مقولے کا مطلب یہی ہے کہ جب کسی معاشرے میں بگاڑ کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ غیب سے کسی ایسے شخص کو پیدا کر دیتا ہے جو معاشرے کے سدھار میں بڑا کام کر دکھاتا ہے۔ تبریس گریکس نے روم کے بگڑتے ہوئے معاشرے میں یہی کام کر دکھایا۔ اس نے اسمبلی میں یہ تجویز پیش کی کہ کوئی بھی شخص ۳۱۲ ایکڑ زمین سے زیادہ کا مالک نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر کسی کے پاس اس سے زائد زمین ہو تو اسے غریب کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا جائے۔

اس تجویز کی مخالفت روم کی سینیٹ نے پرزور الفاظ میں روا رکھی لیکن عوامی اسمبلی میں اسے منظور کیا گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ تجویز عمل میں آئے، تبریس گریکس کو اس کے مخالفوں نے قتل کر دیا اور اس کے تین سو حمایتی بھی مارے گئے۔ اس طرح روم میں قتل و خوں ریزی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن تبریس کے قتل نے عوام میں ایک نیا جوش و ولولہ پیدا کر دیا۔ انھوں نے ۱۲۲ ق م میں تبریس کے چھوٹے بھائی گائیس گریکس (Gaius Gracchus) کو ٹریبون منتخب کیا۔ اس نے اپنے بھائی کے مشن کو آگے بڑھایا اور عوام کی اسمبلی میں چند اہم بل پیش کئے۔ مثلاً بازار کے نرخ سے آدھی قیمت میں عوام کو غلے کی فراہمی، سرکاری زمینوں کو عوام میں تقسیم کیا جانا اور رومیوں کے نو آبادیاں قائم کرنا۔ لیکن روم کے امراء نے اس پر ڈکٹیٹر بننے کا الزام لگایا اور عوام کو اسی کے خلاف اتنا بھڑکایا کہ اسے اور اس کے ہمدردوں کو قتل کر کے روم میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا۔

روم کی عوامی اسمبلی بے بس ہو گئی اور امراء کی سینٹ کی دھاندلی بڑھتی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خانہ جنگی، بغاوتیں اور طرح طرح کی سازشیں سر اٹھانے لگیں۔ فوج کی طاقت نے حالات پر

قابو پانا چاہا تو وہ بھی ناکام رہی۔ قتل و غارت گری کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور شخصی حکومت کے لئے راستہ ہموار ہونے لگا۔ پومپی ایک فوجی کمانڈر تھا۔ اس نے بے دردی سے بغاوتوں کو کچلا۔ آس پاس کے علاقوں کو فتح بھی کیا اور اپنا اقتدار مکمل طور پر قائم کرنا چاہا۔ اس مقابلے میں روم کا ایک عوامی لیڈر جولیس سیزر اپنی جوشیلی تقریروں سے مقبول ہوتا گیا۔ پومپی اور جولیس سیزر کو ایک دولت مند حامی مل گیا جس کا نام کراسس تھا۔ ان تینوں نے مل کر سارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ جولیس سیزر کی عوامی مقبولیت، پومپی کے فوجی کارنامے اور کراسس کی دولت نے اپنا رنگ جمایا۔ جولیس سیزر کامیاب سیاست داں ثابت ہوا۔ وہ خود ہی فوج کا سپہ سالار بن گیا اور کامیاب بھی ہوا۔ اس کی کامیابی کا راز فوجوں کی تیز رفتاری اور سامانِ رسد کی مسلسل فراہمی سے وابستہ تھا۔ اس نے اتنی زبردست فتوحات حاصل کیں کہ فرانس، بیلجیم اور انگلستان تک پہنچ گیا۔ آگے چل کر جب پومپی اور اس کے درمیان اقتدار کی جنگ ہوئی تو پومپی شکست کھا کر مصر کی طرف بھاگا۔ جولیس سیزر نے اس کا تعاقب کیا۔ پومپی کو مصر میں قتل کر دیا گیا اور جولیس سیزر اس مشہور و معروف ڈرامے کا ہیرو بن گیا جس کی ہیروئن ملکہ قلوپطرہ تھی۔ مصر میں قیام کے دوران جولیس سیزر نے روم کی مشرقی سلطنت پر فتوحات حاصل کر کے یہ مشہور الفاظ لکھے :

" میں پہنچا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کر لیا "

ایتھنز اور اسپارٹا کی جنگیں

ایتھنز اور اسپارٹا دونوں یونان کی طاقتور ریاستیں تھیں۔ سابقہ ادوار میں جب ایرانی سلطنت کے شہنشاہوں نے یونان پر حملے کیے تو یہ دونوں ریاستیں مشترکہ دفاع میں بھی شامل رہیں لیکن جب ایرانیوں کا زور ٹوٹ گیا اور ایتھنز کی ریاست ہمہ گیر ترقی و خوش حالی میں شالی حیثیت اختیار کر گئی تو اسپارٹا میں رقابت کی آگ بھڑکنے لگی۔ چنانچہ اسپارٹا کی حکومت اور عوام جنگ کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ اُدھر ایتھنز نے جزیرہ پیلوپونیسس کی ریاست کارنتھ (Corinth) کے خلاف جارحانہ قدم اٹھایا اور ان بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا جو کارنتھ کی تجارت کے لئے ضروری تھیں۔ اس طرح ایتھنز اور کارنتھ کی ریاست کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ کارنتھ کی مدد کو نہ صرف اسپارٹا کی فوج میدان میں آ گئی بلکہ جزیرے کی دوسری ریاستیں بھی ایتھنز کی جارحیت کو کچلنے پر آمادہ ہو گئیں۔ دوسری جانب ایتھنز کے ساتھ وہ تمام ریاستیں ہو گئیں جو اس کی برتری کو تسلیم کرتی تھیں۔ اب دونوں طرف سے جنگی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ ایٹیکا اور تھریس کے میدانوں میں جنگوں کا آغاز ہوا۔ جنگ کے دوسرے سال ایتھنز میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی اور سیکڑوں افراد جن میں ایتھنز کا حکمراں پرکلیز بھی شامل تھا، موت کے گھاٹ اتر گئے۔

پرکلیز کی موت ایتھنز کے لئے تباہی کا پیغام لائی کیونکہ اس کے بعد ریاست کی قیادت ایسے افراد کے ہاتھوں میں پہنچ گئی جن کے غلط فیصلوں نے ایتھنز کی فوجی طاقت کو نقصان پہنچایا اور ایتھنز کو اسپارٹا کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ان جنگوں کے آغاز میں اسپارٹا اور اس کی اتحادی فوجوں نے ایتھنز کی طرف کوچ کر کے ایٹیکا پر حملہ کیا۔ وہاں کے لوگ ایتھنز میں پناہ گزیں ہوئے اور انھوں نے ایتھنز سے اپنے مکانات اور کھیتوں کو تباہ و برباد ہوتے دیکھا۔

اٹیکا کو تباہ کرنے کے بعد اسپارٹا کی فوجیں ایتھنز پر حملہ آور نہیں ہوئیں بلکہ واپس چلی گئیں۔ اگلے سال ۴۳۰ ق م میں اسپارٹا کی فوجوں نے پھر ایتھنز کا رخ کیا اور اس مرتبہ اٹیکا کو دوبارہ فتح کرنے کے بعد ایتھنز پر حملہ کیا۔ ایتھنز کی فصیلیں اونچی اور مضبوط تھیں اس لئے ایتھنز کے لوگ خود کو بالکل محفوظ سمجھتے تھے۔ اسپارٹا کی فوج واپس پلٹ گئی۔ ادھر ایتھنز کے بحری بیڑے نے خلیج کارنتھ میں کچھ فتوحات کیں۔ کچھ باغی ریاستیں اسپارٹا سے مل گئیں۔ چنانچہ جنگ کے پہلے دور میں اسپارٹا کا پلڑا بھاری رہا مگر ۴۲۱ ق م میں دونوں جانب سے پچاس سال کے لئے تجویز آئی مگر تھریس کے لوگ راضی نہ ہوئے اور صلح نامہ بے اثر رہا۔

جب ایتھنز اور اسپارٹا کی محاذ آرائی میں صلح کی کوشش کامیاب نہ ہوئی تو جنگ کا جاری رہنا یقینی سا ہو گیا۔ ایتھنز کی اسمبلی کا قائد اس زمانے میں السی بائڈس (Alcibiades) تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسپارٹا یا اس کی اتحادی ریاستوں کی بجائے اس کے نو آبادیاتی علاقوں کو فتح کیا جائے تاکہ بعد میں اسپارٹا کو شکست دی جا سکے۔ لہٰذا اس نے اسمبلی کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور ایسے بحری بیڑے کی تیاریاں شروع کر دیں جو فتوحات میں آسانیاں پیدا کر سکیں۔ اس طرح ۴۱۵ ق م میں ایتھنز نے اپنا زبردست جہازی بیڑا سسلی اور اٹلی کی جانب روانہ کیا۔ سسلی کارنتھ کی نو آبادی شمار کیا جاتا تھا، لیکن ابھی یہ بیڑہ السی بائڈس کی قیادت میں سسلی پہنچ نہ پایا تھا کہ ایتھنز کی اسمبلی نے السی بائڈس کو چند الزامات کی صفائی کے سلسلے میں ایتھنز واپس پہنچنے کے احکامات بھیجے۔ وہ ادھر جانے کی بجائے اسپارٹا چلا گیا تاکہ پناہ حاصل کر سکے۔ اس نے اسپارٹا والوں کو رائے دی کہ وہ فوراً سسلی کی مدد کے لئے اپنی فوجیں روانہ کر دیں۔ چناں چہ جس بیڑے کو السی بائڈس نے خود تیار کرایا تھا اس کو تباہ بھی خود ہی کرایا۔ نہ صرف جہازی بیڑے کی تباہی ہوئی بلکہ ایتھنز کے چالیس ہزار سپاہی بھی مارے گئے اور سات ہزار غلام بنا لئے گئے۔ ایتھنز کی بحری برتری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور ایتھنز کے اندرونی حالات مزید خراب ہو گئے۔ وہاں جمہوریت کی جگہ طبقۂ خواص کی حکومت قائم ہوئی لیکن وہ زیادہ عرصے نہ چل سکی تو ایتھنز کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ السی بائڈس کو اسپارٹا سے بلایا جائے اور قیادت سونپی جائے۔ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ السی بائڈس نے ایتھنز پہنچ کر بحری بیڑے کو از سر نو ترتیب دینے کا ارادہ کیا لیکن ۴۰۵ ق م میں اسپارٹا کے بحری بیڑے نے ایتھنز کے بحری بیڑے کو درۂ دانیال کے قریب زبردست شکست دی اور ایتھنز کا محاصرہ کر لیا۔ غلے کی

کمپانی نے وہاں کے لوگوں نے شکست تسلیم کرلی۔ ایتھنز کو اپنے تمام مقبوضات سے محروم ہونا پڑا۔ شہر کی حفاظت کے لئے بلند و بالا فصیل تھی جسے گرادیا گیا۔ صرف بارہ جہاز چھوڑے گئے۔ باقی سب اسپارٹا نے اپنی تحویل میں لے لیے۔ اس طرح ایتھنز پر اسپارٹا کی برتری قائم ہوگئی۔

۲۷ سال کی جنگوں کا انجام ایتھنز کے زوال اور اسپارٹا کے عروج کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسپارٹا نے اپنی سلطنت کو خوب وسعت دی۔ ادھر ایتھنز میں پھر سے جمہوری نظام قائم ہوگیا اور وہاں کے لوگوں نے ایران سے تعلقات پیدا کرکے وہاں کی خانہ جنگی میں حصّہ لیا۔ ایرانی شہزادے سائرس (Cyrus) کی مدد کے لئے تیرہ ہزار سپاہی بھیجے۔ سائرس کو ایران کا تخت مل گیا لیکن ایتھنز والوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ اسپارٹا کی فوجوں کو تھیبس کی فوجوں نے پسپا کرکے اس کی عظمت ختم کردی۔ ۳۵۲ ق م تک یونان کی تمام ریاستیں خانہ جنگی، بغاوتوں اور آپس کی جنگوں کے سبب بالکل تباہ ہوکر رہ گئیں۔ رہے نام اللہ کا۔

روم کی ابتدائی تاریخ

سکندرِ اعظم کے بعد یونانی سلطنت تین حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ان تین حصوں کے حکمراں ایک دوسرے سے جنگ کرتے رہتے تھے۔ اس طرح سیاسی طور پر یونانی سلطنت دن بہ دن کمزور ہوتی گئی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ تہذیب جس کی بنیادیں یونان میں استوار ہوئی تھیں، یونانی سلطنت کے زوال سے ختم ہو جاتیں مگر ایسا نہیں ہوا، کیوں کہ ایک نئی قوم بڑی قوت سے یورپ میں ابھر رہی تھی جس نے یونانی سلطنت کے زوال سے تو فائدہ اٹھایا مگر یونانی تہذیب کو خودکشی سے بچا لیا اور اسے اپنا کر سیاسی عروج کے ساتھ ساتھ بحیرۂ روم کے تمام علاقوں میں پھیلا دیا۔ جس طرح مشرق میں آشوریوں نے بابلی تہذیب کو زندہ رکھا اور پروان چڑھایا۔ اسی طرح روم کے لوگوں نے یونانی تہذیب کو مزید نکھار بخشا۔

اٹلی کا چھوٹا سا شہر روم پہلے جمہوریت کا اور پھر ایک وسیع سلطنت کا مرکز بن گیا۔ رومن ایمپائر کی سرحدیں یورپ، ایشیا اور افریقہ میں پھیل گئیں اور وہ دنیا کی سب سے طاقتور سلطنت بن گئی۔

جزیرہ نما اٹلی کے شمال میں کوہ ایلپس (Alps) کے سلسلے ہیں جنھوں نے اٹلی کو یورپ سے الگ کر رکھا ہے۔ قدیم زمانے میں یہاں کچھ قبائل آباد ہوئے، کیونکہ یہ وادی زرخیز تھی اور بارش کثرت سے ہوتی تھی۔ اس لئے ابتدا سے ہی اٹلی میں زراعت کی ترقی خوب ہوئی اور یہاں کے قدیم باشندوں نے اپنے آپ کو زراعت سے وابستہ رکھا۔

اٹلی کے قدیم باشندوں کے بارے میں خیال ہے کہ وہ دو ہزار سال قبل مسیح کے قریب سوئٹزر لینڈ کی طرف سے اٹلی کے شمال میں داخل ہوئے تھے اور دریائے پو کی وادی میں جھیلوں کے

کنارے آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ آریائی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ کاشتکاری کے طریقوں اور دھاتوں کے استعمال سے واقف تھے۔ پہلے انہوں نے چھوٹے چھوٹے گاؤں بسائے اس وقت ان کو کوئی سیاسی شعور نہیں تھا۔ آگے چل کر کچھ اور قبیلے بھی آ گئے جو اطالوی کہلائے اور ان اطالوی قبیلوں میں سب سے زیادہ مشہور لاطینی (Latins) قبیلہ ہوا۔

تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح ایشیائے کوچک سے کچھ اور قبیلے شمالی اٹلی میں آئے۔ ان کی نسل کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ان کو ایت رسکن (Et Ruskans) کہا گیا۔ یہ دوسرے قبیلوں سے زیادہ مہذب تھے اور تجارت کرتے تھے۔ یہ لوگ سونے، چاندی اور لوہے کے استعمال میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے اٹلی میں ریاستیں قائم کیں۔ اپنے شہروں کی حفاظت کے لئے اونچی اونچی فصیلیں بنوائیں۔ یہ فنِ تحریر سے بھی واقف تھے، لیکن ان کی تحریروں کو اب تک پڑھا نہیں جا سکا ہے۔ ان کے جو شہر دریافت ہوئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ شہروں کی تعمیر میں کافی دلچسپی رکھتے تھے اور فنِ تعمیر سے ان کی دیرینہ وابستگی تھی۔

اٹلی کے جنوبی ساحلوں پر ساتویں صدی قبل مسیح میں یونان کے لوگوں نے نوآبادیات قائم کرنا شروع کیں اور جزیرہ سسلی یونانیوں کی ایک اہم نوآبادی بن گیا۔ اس طرح چھٹی صدی قبل مسیح میں اٹلی تین اہم قوموں کا مسکن بن گیا۔ شمال میں ایت رسکن، وسط اور جنوب میں اطالوی قبیلے اور جنوبی ساحل کے علاقوں میں یونانی نسل کے لوگ۔ مختلف قوموں کی آماجگاہ بننے کے سبب اٹلی میں کوئی سیاسی اتحاد نہیں تھا، بلکہ آپس میں اقتدار کی جنگ ہوتی رہتی تھی۔ خاص طور پر اطالوی قبیلے بڑے جنگجو تھے اور آپس ہی میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ ادھر ایت رسکن لوگوں نے شہری ریاستوں کی بنیادیں ڈال کر بادشاہت قائم کر لی تھی۔ لیکن چونکہ اطالوی قبیلے متحد نہیں تھے اور لاطینی قبائل بھی جنگ میں مہارت پیدا کر رہے تھے، اس کا ایت رسکن لوگوں کو یہ ہوا کہ ان کی تجارتی سرگرمیاں بڑھنے لگیں۔ لاطینی لوگوں نے آلاتِ جنگ حاصل کرنے کے لئے ایت رسکن لوگوں سے تجارتی تعلقات قائم کر لئے دونوں علاقوں میں باہمی آمد و رفت ہونے لگی۔ لاطیم کی پہاڑی جہاں لاطینی آباد تھے، اس کی سرحد پر کچھ

اور آبادیاں قائم ہو گئیں اور پھر ایک بڑا شہر بن گیا جس کا نام روم پڑ گیا۔

روم میں لاطینی لوگ حکمراں رہے۔ انھوں نے اپنی حفاظت کے لئے شہر کے چاروں طرف فصیل کھڑی کی اور دشمنوں سے مقابلے کے لئے باقاعدہ فوج رہنے لگی، کیونکہ روم کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے سبب ایت رسکن لوگ اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح دونوں میں دشمنی پیدا ہو گئی اور ایت رسکن لوگوں نے کچھ عرصے کے لئے روم فتح کر لیا، لیکن ۵۰۹ ق م میں آخری ایت رسکن بادشاہ کو روم سے نکال دیا گیا اور رومیوں نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سے روم کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

روم کے شاہی دور میں جو تاریخی دور نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ اس میں تاریخ سے زیادہ قصے اور کہانیوں کا حصّہ بہت زیادہ ہے۔ بادشاہ کی حیثیت ایک قبیلے کے سردار جیسی تھی۔ شہر کے انتظام میں مشورہ دینے کے لئے سرداروں کی ایک کونسل تھی جسے سینٹ (Senate) کہا جاتا تھا۔ شہر کی عام آبادی کو کچھ سیاسی اختیارات ملے ہوئے تھے۔ لیکن بعد میں وہ بھی ختم ہو گئے۔ جب ایت رسکن لوگوں نے روم پر قبضہ کر لیا تھا تو رومیوں کی زندگی بڑی مجبوریوں میں بسر ہو رہی تھی۔ نہ سینٹ رہی تھی، نہ سرداروں کی کوئی اہمیت تھی اور نہ عوام کو کسی قسم کی آزادی نہ سیاسی حقوق حاصل تھے مگر جب آخری ایت رسکن بادشاہ کو رومیوں نے اپنی بھرپور طاقت اور جذبۂ حب الوطنی کے بل بوتے پر نکال باہر کیا تو پھر آگے چل کر روم کی تاریخ میں انقلابی تبدیلیاں ہوئیں اور ایک نئے تہذیبی مرکز کی باقاعدہ تاریخ مرتب ہونے لگی۔

سکندرِ اعظم

یونانی ریاستوں کے شمال میں ایک چھوٹا سا علاقہ مقدونیہ کے نام سے موسوم تھا، جہاں آریائی نسلوں کے لوگ آباد تھے اور وہ اپنا تعلق ان آریائی قبیلوں سے جوڑتے تھے جو یونان میں بس گئے تھے۔ مقدونیہ پر ایرانیوں کا بھی قبضہ رہا اور ایرانی سلطنت کے یورپی مقبوضات میں سرحدی علاقے کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل رہی، لیکن ایران کا زوال ہوا تو مقدونیہ آزاد ہو گیا۔

یونانی ریاستوں کے لوگ مقدونیہ کے باشندوں کو کمتر سمجھتے تھے اور اسی لئے مقدونیہ کا شمار یونانی ریاستوں میں نہیں کرتے تھے۔ لیکن اولیمپک کھیلوں میں مقابلے کے لئے مقدونیہ کے لوگوں کو بھی دعوت دی جاتی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ نسلی لحاظ سے یونانی وہاں کے لوگوں کو اپنی نسلوں میں شمار کرتے تھے۔ ویسے بھی مقدونیہ کے لوگ یونانی دیوتاؤں پر عقیدہ رکھتے تھے اور معاشرتی لحاظ سے خود کو یونانیوں کے بہت قریب محسوس کرتے تھے۔

مقدونیہ کی اہمیت کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب ۳۵۹ ق.م میں وہاں فلپ دوم برسرِ اقتدار آیا اور چھ سال کے بعد مقدونیہ کا بادشاہ بن گیا۔ پھر اس نے اپنی فوجی طاقت کو بڑھا کر یونانی ریاستوں کو فتح کرنا شروع کیا اور پورے یونان پر اپنی برتری قائم کر لی۔

جس دور میں فلپ اپنی بادشاہت قائم کر چکا تھا، یونانی ریاستیں آپس کی جنگوں اور اندرونی بغاوتوں کے سبب انتہائی کمزور ہو گئی تھیں۔ اس دور میں یونانیوں پر نفسیاتی اثر یہ پڑا تھا کہ وہ ایک ایسی شخصیت کے منتظر تھے جو ان کی خستہ حالی کو از سرِ نو سابقہ عروج کی حالت میں لے آئے اور بجا طور پر ان میں قومی امنگ بیدار کر سکے۔

فلپ کی بڑھتی ہوئی طاقت نے سب کو اس کی جانب متوجہ کیا اور ایتھنز کے فلسفی

سقراط نے اسے پورے یونان کا قائد کہا۔ سقراط نے اس بات پر زور دیا کہ یونان کی تمام ریاستوں کو مشترکہ قومی عروج کے لئے ایک قائد کی رہبری میں متحد ہونا چاہیے۔ مدبر وہ اس کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اس طرح ایران اور ایرانی سلطنت کو فتح کرنا آسان ہو جائے گا، کیوں کہ اہل ایران کئی مرتبہ یونانی ریاستوں پر حملہ آور ہو چکے تھے اور ایک ایسے دور میں جبکہ ایرانی سلطنت زوال کا شکار ہو چکی تھی یونانیوں کے لئے شاندار موقع تھا کہ وہ ایران سے بدلہ لے کر ایرانی سلطنت پر قبضہ جمالیں اور ایشیا میں یونانی عظمت کا بول بالا ہو جائے۔

فلپ نے سقراط کا نظریہ اپنایا اور سب سے پہلے یونانی خانہ جنگی کو ختم کرنے کا ارادہ کیا۔ اسے اپنے مقصد کے حصول میں کامیابی ایک منظم اور مضبوط فوج کے ذریعے ہی ہو سکتی تھی۔ اس لئے اس نے ایسی فوج قائم کی جو فنونِ جنگ اور آلاتِ حرب کے اعتبار سے ممتاز تھی۔ اس کام میں اس کا جواں سال بیٹا بھی پیش پیش رہا جو فلپ کے بعد یونان کا حکمراں بنا اور اتنی بڑی سلطنت کا مالک بنا۔ تاریخ میں اسے سکندرِ اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ایسے بیدار مغز اور بہادر باپ کا بیٹا تھا جس نے یونانی فوج میں رتھوں کے بجائے گھوڑ سوار فوج قائم کی اور فوجیوں کے لئے ہر قسم کی فوجی تربیت کا انتظام کیا۔

ابتدائی دور میں مقدونیہ کے حکمراں فلپ اور اس کے بیٹے سکندر نے پہاڑی قبیلوں اور مقدونیہ کے لوگوں کو ایک قوم بنایا پھر فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ انہوں نے تھریس پر قبضہ کر لیا جہاں سونے کی کانوں سے کافی دولت ہاتھ آئی۔

فلپ کی بڑھتی ہوئی طاقت نے یونان کی ریاستوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک وہ جو فلپ اور سکندر کی سرکردگی میں یونان کا اتحاد چاہتا تھا اور دوسرا گروہ مقدونیہ کی برتری کا مخالف تھا۔ اسی مخالف گروہ نے مقدونیہ کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر ۳۳۸ ق م میں کروتیہ کو میدانِ جنگ بنایا اور اس جنگ نے مقدونیہ کی طاقت کو ثابت کر کے تمام یونانیوں کو یہ باور کر دیا کہ ایک متحدہ فوجی طاقت بن کر ایران پر حملہ کیا جائے، لیکن ابھی یہ منصوبہ ابتدائی مرحلے میں تھا کہ چند مخالفوں نے سازش کر کے فلپ کو قتل کرا دیا۔ اب اس کا بیٹا ۳۳۶ ق م میں یونان کا حکمراں بنا جسے تاریخ نے کچھ ہی عرصے بعد سکندرِ اعظم بنا دیا۔ وہ تختِ نشینی کے وقت صرف بیس سال کا جوان تھا۔ لیکن اس میں زبردست

قائدانہ صلاحیتیں موجود تھیں اور یونان کا مشہور و معروف فلسفی ارسطو اس کا اتالیق تھا جس کی دانشمندی نے سکندر کے دل و دماغ میں نہ صرف جہاں گیری و جہانبانی کا جذبہ پیدا کیا بلکہ فلسفہ و ادب اور دیگر علوم اور فنون سے بھی اسے گہری دلچسپی رہی۔

سکندر کے تخت نشین ہوتے ہی آس پاس کی ریاستوں نے بغاوت پر کمر باندھی جسے سختی سے کچل دیا گیا جس سے دوسری ریاستوں کو عبرت ہوئی۔ اس طرح یونان پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے بعد ۳۳۴ ق م میں سکندر نے ۳۵ ہزار سپاہیوں کی فوج سے ایران کے ایشیائی مقبوضات پر حملہ کیا۔ ایران کا آخری حکمران دارا سوم زبردست فوج لے کر سکندر کے مقابلے میں آیا مگر شکست سے دو چار ہوا اور میدان چھوڑ بھاگا۔ سکندر نے دریائے نیل کے کنارے پر اسکندریہ شہر کی بنیاد رکھی۔ مصر کے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے، ان کے دیوتاؤں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے قربانیاں دیں اور سورج دیوتا کے مندر تک سفر کیا۔

مصر کی حکومت دو پتے دو نامزد بادشاہوں کے سپرد کر کے سکندر پھر ایرانی سلطنت کی طرف متوجہ ہوا۔ ایرانی فوجوں سے جنگ ہوئی، لیکن آخری فتح وادئ دجلہ و فرات کے ایرانی مقبوضات میں سکندر کو ہوئی۔ اس بابل کی عمارتوں اور مندروں کو دوبارہ تعمیر کرایا۔

ایرانی فوجوں سے سکندر کی ایک جنگ میڈیا کے پہاڑی علاقوں میں ہوئی جہاں سے دارا سوم فرار ہو گیا۔ سکندر نے اس کا پیچھا کیا، بلخ کے حاکم نے دارا کو پکڑ کر قتل کر دیا، لیکن سکندر نے اس کی لاش کو بڑے احترام سے دفن کرایا۔

ایرانی سلطنت پر مکمل فتح حاصل کرنے کے بعد ۳۲۷ ق م میں یونانی فوجیں افغانستان کو فتح کرنے کے لئے بڑھیں۔ اس طرح سکندر نئی نئی فتوحات حاصل کرتا ہوا ٹیکسلا پہنچ گیا جہاں راجہ پورس سے اس کا تاریخی معرکہ ہوا اور فتح و نصرت سکندر کے حصے میں آئی۔ وہ مزید فتوحات کا خواہاں تھا لیکن اس کے فوجی مسلسل جنگوں سے بیزار ہو چکے تھے۔ اس لئے مجبوراً اسے واپسی کا ارادہ کرنا پڑا۔ وہ ابھی واپس یونان پہنچا بھی نہ تھا کہ ۳۲۳ ق م میں بابل پہنچ کر وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

رومی فتوحات

جب اسپین کی فوجیں روم کے محاصرے میں بری طرح ناکام ہوئیں اور وہاں کے حکمران ہنی بال کی تمام کوششیں بیکار گئیں تو وہ بری طرح شکست خوردہ ہوگیا۔ ادھر روم کی سینیٹ (Senate) نے فوج کی کمان سیپو (Scipio) کے سپرد کی جو بہت باصلاحیت فوجی جرنیل تھا۔ اس نے پہلے تو اسپین کو فتح کیا پھر اپنی فوجیں افریقہ میں اتار دیں اور کارتھیج کی طرف پیش قدمی کی۔ اس وقت ہنی بال اٹلی کے جنوب میں مقیم تھا اور رومن فوج کارتھیج پر حملے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ کارتھیج کے لوگوں نے ہنی بال کو واپسی کا پیغام بھیجا کیونکہ ان کے نزدیک وہی روم کی فوجوں کو شکست دے سکتا تھا۔ ہنی بال سسلی کے پاس سے ہوتا ہوا کارتھیج پہنچ گیا اور فوج کی کمان سنبھال لی۔ اب فیصلہ اٹلی کی سرزمین پر نہیں بلکہ کارتھیج کی سرزمین پر ہونا تھا۔ دو عظیم سپہ سالاروں اور دو جنگجو قوموں کا فیصلہ کن مقابلہ ۲۰۲ ق م میں زاما (Zama) کے مقام پر ہوا۔ بڑا گھمسان کا رن پڑا، مگر آخر کار ہنی بال کو شکست ہوئی۔ وہ ایشیا کی طرف بھاگ گیا اور ایک سو تراسی سال قبلِ مسیح میں خودکشی کر لی۔ کارتھیج والوں نے رومیوں سے صلح کی بات کی۔ صلح نامے کی رو سے اسے تمام غیر ملکی مقبوضات سے محروم ہونا پڑا۔

اسپین رومن سلطنت کا ایک صوبہ ہو گیا۔ کارتھیج کی بحری فوج تباہ کر دی گئی۔ صرف دس جہاز رکھنے کی اجازت ملی اور تاوان کی صورت پچاس لاکھ ڈالر پچاس برس کے عرصے میں ادا کرنے پر صلح کی گئی۔ یہ صلح کارتھیج کے لئے زوال کا سبب بنی اور اس کی حیثیت صرف ایک تجارتی شہر کی رہ گئی۔ اسے مجبور کر دیا گیا کہ بغیر روم کی اجازت کے نہ کسی سے جنگ کرے گا نہ صلح۔ بحرِ روم پر روم کی برتری قائم ہوگئی۔ کارتھیج کا قبضہ کسی طرح نہ رہا، لیکن رومن لوگوں کے دلوں سے کارتھیج کی نفرت ختم نہ ہوئی۔ وہ یہی کوشش کرتے رہے کہ کارتھیج کے مقابلے میں دیگر افریقی ریاستوں کی مدد کی جائے تاکہ کارتھیج

کی تجارتی برتری بھی دم توڑ دے۔

روم کے لوگ تاوان کی وصولیابی کے لیے اکثر کارتھیج آتے رہتے تھے۔ ان میں ایک مرتبہ سینٹ کا ایک رکن کاٹو (cato) بھی آیا اور کارتھیج کی خوشحالی دیکھ کر اس کے اندر نفرت اور حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ واپس جا کر اس نے اپنی تقریروں میں زور دیا کہ کارتھیج کو طاقتور اور خوشحال نہ رہنے دیا جائے۔ اس کی ہر تقریر اس جملے پر ختم ہوتی تھی "کارتھیج کو تباہ کرنا ضروری ہے"۔ رفتہ رفتہ سینٹ کے تمام ممبر اور رومن عوام اس کے ہم خیال ہو گئے۔ روم کی سینٹ نے افریقہ کی ریاست نومیڈیا کو کارتھیج پر حملے کے لئے اکسایا۔ مجبوراً کارتھیج والوں کو جنگ کرنا پڑی جسے رومن حکمرانوں نے صلح نامے کے خلاف قرار دیا اور کارتھیج کے لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے شہر خالی کر دیں اور ساحل سے دس میل اندر جا کر آباد ہوں۔ یہ مطالبہ منظور نہ ہوا تو رومن فوج نے کارتھیج کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں کے لوگوں نے تین سال تک مقابلہ کیا۔ پورا شہر فوجی کیمپ بن گیا۔ مگر آخر کار روم کی فوج نے فتح پائی۔ پوری آبادی کو قتل کر دیا۔ شہر کو بالکل نیست و نابود کر ڈالا اور کارتھیج کا نام و نشان ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔

جب روم کو بحرِ روم کے علاقوں پر برتری حاصل ہو گئی تو اس کا تصادم مقدونیہ کے حکمراں فلپ پنجم سے ہوا جس نے روم کے دشمنوں کی مدد کی تھی۔

یونان کا حال اس زمانے میں یہ تھا کہ سکندرِ اعظم کی موت کے بعد یونانی سلطنت تین حصّوں میں بٹ گئی تھی اور یونان کا سیاسی انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ شہر آپس میں لڑتے رہنے کی وجہ سے مستقل طور پر کمزور ہوتے جا رہے تھے اور کسی بیرونی طاقت سے مقابلہ کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔

روم کی فوجوں نے ۱۹۷ ق م میں مقدونیہ پر چڑھائی کر دی اور فلپ پنجم کی فوجوں کو شکستِ فاش دی مگر روم نے یونان کے شہروں کو اندرونی طور پر آزاد رکھا البتہ خراج کی ادائیگی کو لازمی قرار دیا۔ بعض شہروں نے رومن اقتدار کے خلاف بغاوت بھی کی مگر ساری بغاوتوں کو کچل دیا گیا۔ خاص طور پر کارنتھ کی بغاوت کو بہت سختی سے دبا کر اس خوبصورت شہر کو آگ لگا دی گئی۔

یونان پر قبضہ کرنے کے بعد روم کا مقابلہ اس یونانی سلطنت سے ہوا جو ایشیائے کوچک میں یونانی سپہ سالار سیلوقس نے قائم کی تھی اور وہ بھی زوال کا شکار ہو چکی تھی۔ ۱۹۲ ق م میں اس نے روم کی اطاعت

قبول کرلی اور اپنے ملک کا بڑا حصہ رومیوں کے حوالے کر دیا۔ اس طرح روم کی طاقت ان تمام علاقوں میں تسلیم کرلی گئی جو کسی زمانے میں یونانی اور فنیقی قوموں کے زیرِ اثر تھے۔

مصر میں بطلیموس کی حکومت سکندرِ اعظم کے بعد سے قائم ہوگئی تھی اور اسکندریہ یونانی تہذیب کا مرکز بن گیا تھا لیکن رفتہ رفتہ یونانیوں کی قوت مصر میں کم ہونا شروع ہوئی اور جب یونانیوں پر رومیوں نے قبضہ کرلیا تو مصر کے یونانی حکمرانوں نے بھی روم کی برتری تسلیم کرلی اور ۱۶۸ ق م میں مصر روم کے زیرِ اثر آ گیا۔ اندرونی طور پر مصر آزاد رہا مگر بالادستی روم کے حصے میں آئی اور بعد میں مصر بھی رومی سلطنت کا ایک صوبہ ہوگیا۔

جب روم کی وسیع سلطنت قائم ہوگئی تو مفتوحہ علاقوں میں روم کے امرا نے اپنی جاگیریں بنائیں۔ علاوہ ازیں پوری سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا گیا اور انتظام کے لئے گورنر مقرر ہوئے جو بڑے اختیارات رکھتے تھے۔ فوج کی تنخواہیں اور حکومت کے اخراجات صوبے کے لوگوں پر ٹیکس لگا کر پورے کئے جاتے تھے۔ ٹیکس کی وصولیابی میں بڑی سختی روا رکھی جاتی تھی۔ صوبے کا گورنر صرف سال بھر کے لئے ہوتا تھا۔ اس قلیل مدت میں ہر گورنر کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ دولت کما سکے۔ صوبوں کی دولت بڑی تیزی سے روم منتقل ہونے لگی۔ ٹیکس وصول کرنے والے رشوتیں بھی وصول کرتے تھے۔ ٹیکس کی زیادتی کے سبب صوبوں کے مقامی باشندے خستہ حال ہوگئے تھے اور رومی تاجر تجارت پر چھا گئے تھے۔ غرض ہر طرح روم کی شان و شوکت اور خوشحالی میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا تھا، لیکن مزدور طبقہ مفلوک الحال تھا جس کی وجہ سے خانہ جنگی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ امرا کے عیش و عشرت کی کوئی حد نہ تھی۔

تہذیبی اعتبار سے روم کے امرا اور طبقۂ خواص نے مفتوحہ علاقوں کی تمام شاندار روایات کو اپنی تہذیب کا حصہ بنالیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے یونان، مصر، بابل اور اسکندریہ کے تہذیبی ورثے سے بہت کچھ حاصل کیا۔

رومی جمہوریت

جیسے جیسے چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں روم کے شہر کو اہمیت حاصل ہوتی گئی اس کا تہذیبی کردار بھی نمایاں ہوتا گیا۔ شروع شروع میں وہی پرانا قبائلی نظام رائج رہا لیکن یونانی تہذیب کے اثرات نے جب رومیوں کو سیاسی اور تمدنی شعور دیا تو انھوں نے رفتہ رفتہ جمہوری قدروں کی جانب قدم بڑھایا۔ بادشاہت کا رواج ختم ہو گیا تو اشرافیہ کی حکومت سینٹ کے ذریعے قائم ہو گئی لیکن یہ طرزِ حکومت بھی موزوں ثابت نہ ہوا اور شہر کے انتظامی معاملات میں خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کا حل اشرافیہ کی حکومت نے یہ نکالا کہ جب شہر کے حالات زیادہ خراب ہو جاتے تو سینٹ ایک افسر مقرر کر دیتی جسے ڈکٹیٹر کہتے تھے اور جو صرف چھ ماہ کے لئے روم کی تقدیر کا مالک بن جاتا تھا۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں اگر اس کی کارگردگی تسلی بخش ہوتی تو اس کے عہدے کی میعاد بڑھا دی جاتی یا پھر اسے ہٹا دیا جاتا۔ پھر دو کونسلیں انتظامی امور انجام دیتی تھیں جو سال بھر کے لئے بنائی جاتیں۔ ان کے وسیع اختیارات ہوتے تھے مگر کوئی غیر قانونی حرکت سرزد ہوتی تو سال گزرنے سے پہلے ہی ان کو توڑ دیا جاتا اور مقدمہ چلایا جاتا تاکہ جرم ثابت ہونے پر سزا دی جائے۔ گویا مستقل ادارہ سینٹ کا تھا اور اس کا ممبر بننے کے لئے طبقۂ اشرافیہ سے ہونا ضروری تھا۔ علاوہ ازیں ۲۸ برس سے کم عمر کا کوئی رکن نہ ہوتا تھا۔ سینٹ کی ممبری تاحیات ہوتی تھی اور سینٹ ہی کو حقیقتاً حکمرانی کے حقوق حاصل تھے۔ وہی مجسٹریٹ، فوجی افسر اور مالیات کے نگراں مقرر کرتی تھی۔ سینٹ ہی کو دشمن کے خلاف اعلانِ جنگ کا اختیار تھا۔

دراصل روم کی آزاد آبادی دو بڑے طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک طبقہ تو وہ تھا جسے تمام ذاتی اور سیاسی حقوق ملے ہوئے تھے اور جو روم پر حکمراں تھا۔ اس طبقے میں امراء اور شرفاء کے طور پر بڑے بڑے زمیندار اور صاحبِ جائیداد لوگ تھے جن کے پاس دولت جمع ہو گئی تھی۔

دوسرا طبقہ چھوٹے زمینداروں، تاجروں، کاریگروں اور مزدوروں کا تھا جنھیں کچھ ذاتی حقوق تو حاصل تھے مگر سیاسی حقوق قطعی نہ ملے تھے۔ اسی طبقے کی مالی حالت خراب تھی۔ امیروں سے قرضے لے کر کام چلتا تھا۔ قرضوں کی وصولیابی کے سخت قوانین تھے اور قانون کی رو سے قرض داروں کو غلام بنایا جاسکتا تھا۔

یہ صورتِ حال زیادہ دنوں تک نہ رہی۔ عوام اور امراء میں کشمکش ہونے لگی۔ اس ابتدائی دور میں روم کی حیثیت ایک معمولی شہری ریاست کی سی رہی اور اس کی طاقت نہ بڑھ سکی۔ عوام اپنی معاشرتی حالت کو بہتر بنانا چاہتے تھے، مگر طبقۂ امرا کے لوگ عوام کو سیاسی طور پر پسماندہ ہی رکھنا چاہتے تھے، کیوں کہ حکومت پر طبقۂ امراء کا قبضہ تھا اور وہ عوام کو اپنا دست نگر رکھنے ہی میں اپنی بقا سمجھتے تھے۔

روم میں حکمرانی کے اختیارات طبقۂ امراء یا اشرافیہ کو حاصل تھے۔ روم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی یہی طبقہ اپنے سر لئے ہوئے تھا، کیونکہ فوجی کمان بھی ان کے ہاتھوں میں تھی۔ عوام میں سے حسبِ ضرورت سپاہی بھرتی کئے جاتے تھے۔ اس طرح جب عوام زیادہ گھٹن محسوس کرنے لگے تو انھوں نے روم کو خیرباد کہہ کر کہیں اور آباد ہونے کا قصد کیا۔ ۴۹۷ ق م میں روم کے عوام واقعی شہر چھوڑ کر نئی بستی بسانے چل دیے۔ امراء کے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔ اس لئے سمجھوتہ کرنے کا وقت آگیا۔ تمام قرضے منسوخ کر دیے گئے۔ جو قیدی تھے ان کو چھوڑ دیا گیا۔ عوام کے حقوق کی حفاظت کے لئے ان ہی میں سے ہر سال دو ٹریبون Tribunes منتخب ہونے لگے جن کا کام عوام کے حقوق کی نگہداشت کرنا تھا۔

عوام کو کچھ حقوق مل تو گئے لیکن تحریر میں نہ آئے۔ اس لئے عوام کا مطالبہ رہا کہ رومی قوانین کو تحریری شکل میں لایا جائے۔ عوام اور امراء کے اختیارات کی حد بندی کی جائے۔ یہ مطالبہ ۴۶۲ ق م میں کیا گیا اور آٹھ سال کی جدوجہد کے بعد اس پر عمل شروع ہوا جب ۴۵۴ ق م میں سینٹ نے دس ممبروں پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا جس کے تین ممبروں کو یونان بھیجا گیا کہ وہ رومی ضابطۂ قوانین کے لئے وہاں سے معلومات فراہم کریں۔

۴۴۹ ق م میں ضابطہ قانون ترتیب دے کر اسے پیتل کی بارہ تختیوں پر کندہ کرایا گیا۔

یہ قانونی دستاویز عوام اور امراء کے لئے یکساں روبہ عمل لانے کے لئے تھی۔ اس میں عوام کو بہتر سماجی

اور سیاسی حقوق ملے تھے اور انھیں آگے بڑھنے کے مواقع مل گئے تھے۔ پھر ان کا مطالبہ یہ رہا کہ عوام کی اسمبلی ہو۔ آخر یہ مطالبہ بھی مان لیا گیا اور عوام کی اسمبلی قائم ہو گئی جس نے ابتدا میں عوام کے لئے قانون بنائے اور بعد میں ان کا اطلاق تمام شہریوں پر ہونے لگا۔ اس طرح دو اسمبلیاں قائم ہو گئیں۔ ایک امراء کی اور دوسری عوام کی۔ رفتہ رفتہ قوانین بنانے کے تمام اختیارات عوام کی اسمبلی کو مل گئے اور اسے عوامی عدالت کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔

عوام کی طاقت کو طبقۂ امراء نے تسلیم تو کر لیا مگر اعلیٰ ترین عہدے طبقۂ امراء ہی کے پاس رہے۔ عوام نے اس بارے میں بھی مطالبات پیش کئے۔ یہ مطالبات جس شخص نے پیش کئے اس کا نام لی سینس (Licinius) تھا۔ اور جب ان کو منظور کر لیا گیا تو اسی کے نام پر لی سینی قوانین بنے جن سے عوام کو بڑی مراعات حاصل ہوئیں۔ مذہبی عہدے عوام اور امراء میں برابر تقسیم ہوئے۔ ہر شہری کو ۵۰۰ ایکڑ زمین رکھنے کا حق ملا۔ حکومت کے بڑے عہدے بھی عوام کو ملنے لگے۔ تقریباً دو سو سال تک کی مسلسل جدوجہد کے بعد روم میں وہ جمہوریت پروان چڑھی جو تاریخ و تہذیب میں ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

عیسائیت (اوّل)

دنیا کے عظیم مذاہب میں اسلام سے پہلے جس مذہب کی تعلیمات نے عالم انسانیت کو بہت متاثر کیا وہ عیسائیت ہے۔ دنیا کی تقریباً ایک تہائی آبادی اس مذہب کی پیروکار تھی۔ معاشرتی رسم و رواج، علوم و فنون، سیاسیات و عمرانیات اور فلسفہ و سائنس پر اس کے اثرات پڑے اور تہذیب و تاریخ نے بھی اپنے سفر میں عیسائیت کی قدروں سے کسبِ فیض کیا۔

عیسائیت کی ابتدا حالانکہ مشرق سے ہوئی تھی، لیکن زیادہ تر مغربی اقوام نے اس مذہب کو اختیار کیا اور مغرب کے ممالک نے اسے بڑا فروغ دیا۔ عیسائیت کی تبلیغ سب سے پہلے روم سلطنت میں ہوئی۔ اس کے بعد یورپ اور امریکا کی اکثر ریاستوں نے اسے سرکاری طور پر اپنایا اگرچہ ابتدائی دور میں یہ مذہب تبلیغی نہیں تھا لیکن بعد میں زور و شور سے اس کی تبلیغ ہونے لگی۔

تاریخی اعتبار سے عیسائیت کی ابتدا یہودیت سے ہوئی مگر یہودیت بنی اسرائیل کے قبیلوں تک محدود رہی اور رفتہ رفتہ یہودیت اور عیسائیت کے اختلافات واضح ہوتے گئے اور اس طرح حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات نے ایک جداگانہ مذہب کی شکل اختیار کرلی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت فلسطین کے ایک چھوٹے سے گاؤں بیت اللحم میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روم میں جمہوریت کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کو قرآن پاک میں ایک معجزہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی والدہ حضرت مریم ناصرہ میں رہتی تھیں لیکن ولادت کے وقت بیت اللحم چلی گئی تھیں۔

حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے ابتدائی حالات مستند تاریخی اور مذہبی کتب میں مرقوم نہیں سوائے اس کے کہ ان کی ابتدائی زندگی محنت و مشقت کے کاموں میں بسر ہوئی۔ بچپن ہی سے آپ بہت نیک

خصلت اور پاک طینت تھے۔ یہودی مذہب کی تعلیمات کا آپ پر گہرا اثر پڑا تھا اور آپ ان تمام نیکیوں کو قبول کرنے میں پیش پیش تھے جو خدائے واحد کی عبادت اور شرفِ انسانیت کی ضامن تھیں۔

کہا جاتا ہے کہ تیس برس کی عمر میں آپ کے قلب پر وحیٔ الٰہی کا نزول ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی اور آپ بنی اسرائیل کو نیکیوں کی تعلیم دینے لگے۔ بیماروں اور قریب المرگ لوگوں کو شفایاب کرنے کا معجزہ آپ کو ودیعت ہوا تھا۔ اسی بنا پر اکثر جو معجزات ظہور میں آتے رہتے تھے ان کی بدولت آپ کو مسیحا کہا گیا۔ اپنے تبلیغی وعظ میں آپ نے لوگوں کو بتایا: "مبارک ہیں وہ جن کی روحیں غریب ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہت ان ہی کی ہے۔ مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں، کیوں کہ زمین کے وہی وارث ہوں گے۔ مبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں کیونکہ وہی اطمینان پائیں گے۔ مبارک ہیں وہ جو رحم دل ہیں کیونکہ ان پر رحم کیا جائے گا۔ مبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں کیونکہ وہی خدا کو دیکھیں گے۔"

نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے سب سے پہلے "الخلیل" کے مقام پر دیہاتیوں اور محنت کشوں میں وعظ فرمایا پھر رفتہ رفتہ آپ کی شہرت پورے فلسطین میں پھیل گئی۔ آپ نے اپنی تعلیمات میں اس بات پر زور دیا کہ انسان آپس میں ایک دوسرے سے محبت کریں، ایک دوسرے کے کام آئیں۔ بیجا طریقوں سے دولت نہ کمائیں۔ دولت کو فضول کاموں میں نہ گنوائیں اور نیک چلن رہیں۔ آپ نے آسمانی بادشاہت کے قیام پر زور دیا اور دنیاوی سلطنتوں کی مخالفت کی۔ اس قسم کے وعظ آپ نے اس دور کی ضرورت کے تحت پہاڑیوں اور میدانوں میں دیے۔ بہت سے یہودیوں نے آپ کی باتوں کو تسلیم کیا، کیوں کہ وہ اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق ایک مسیح کے منتظر تھے جو ان کی کھوئی ہوئی سلطنت دلانے والا تھا۔

حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو غریبوں نے قبول کیا کیونکہ آپ نے دولت کے مقابلے میں غربت کو پسند فرمایا اور غریبوں کو آسمانی بادشاہت کی خوشخبری سنائی لیکن جب آپ لوگوں کو نیکیوں کا درس دیتے ہوئے یروشلم میں داخل ہوئے اور آپ کی قیادت میں عقیدتمند یہودیوں کا ایک کثیر مجموعہ تھا تو یہودیوں نے یہی سمجھا کہ آپ یروشلم میں دنیاوی بادشاہت کے لئے آئے ہیں۔ آپ نے ان کو بتایا کہ حقیقی مقصد دنیا کی بادشاہت قائم کرنا نہیں بلکہ روحانی

بادشاہت قائم کرنا ہے۔ یہ بات یہودیوں کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ آپ کے مخالف ہو گئے۔

یہودیوں کے مذہبی پیشوا کے حکم سے حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کیا گیا اور رومی گورنر کے سامنے پیشی ہوئی کیوں کہ یروشلم پر ان دنوں رومیوں کی حکومت تھی۔ رومی گورنر نے آپ پر بغاوت کا الزام لگایا اور سزائے موت دی۔

حضرت عیسیٰؑ کو کل ڈھائی یا تین سال تبلیغ کی مہلت ملی تھی۔ اس قلیل عرصے میں آپ نے خدا کی وحدانیت، انسانی اخوت اور محبت، ظلم اور لالچ سے نفرت اور ناجائز حصول دولت کی مخالفت پر بہت زور دیا۔ ہر چند کہ یہ اچھی باتیں یہودیت کی تعلیم سے مطابقت رکھتی تھیں، لیکن یہودی اپنے مذہب سے اتنی دور ہٹ چکے تھے کہ وہ آپ کے خلاف ہو گئے۔

رومیوں میں چونکہ بت پرستی کا رواج تھا اور بادشاہوں کو بھی دیوتاؤں جیسا سمجھا جاتا تھا اس لئے وہ آسمانی بادشاہت کے تصور کو کیسے گوارہ کر سکتے تھے۔ اسی لئے حضرت عیسیٰؑ کو انھوں نے اپنے عقیدوں کا باغی سمجھتے ہوئے سزائے موت تجویز کی تھی۔

حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو جن لوگوں نے صدق دل سے مانا تھا ان کی تعداد بہت کم تھی، لیکن وہ لوگ زبردست مبلغ ثابت ہوئے اور یروشلم سے انھوں نے بھرپور تبلیغ کا آغاز کیا۔ ان کا یہ عقیدہ رہا کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ اسی عقیدے کی بنا پر عیسائیت کی تبلیغ جاری رہی۔ یروشلم کے علاوہ فلسطین اور شام کے علاقوں میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہونے لگی، لیکن ۴۰ء میں سینٹ پال نامی ایک شخص نے جو ایشائے کوچک کا باشندہ تھا، عیسائیت کی اصل تعلیمات کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔

عیسائیت (دوم)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرما کر بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لئے رشد و ہدایت کی جو روشنی ودیعت کی تھی وہ بہت قلیل مدت تک ہی نیکیوں کی کرنیں بکھیرتی رہی، پھر جیسا کہ قرآن حکیم میں آیا ہے: "اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔

۳۷ء میں ایک ایسے شخص نے عیسائی مذہب اختیار کیا جو اپنے طور پر عیسائیت کا بہت بڑا مبلغ بھی بنا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے عیسائیت میں نئے تصورات داخل کر کے ایک الگ سی شکل دیدی۔ اس مبلغ کا نام سینٹ پال تھا۔ وہ ایشیائے کوچک کا رہنے والا یہودی مذہب کا عالم سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کا ہمعصر تھا، لیکن اس نے انھیں دیکھا نہیں تھا اور شروع میں وہ عیسائیت اور عیسائیوں کا مخالف تھا، لیکن اس کے اپنے قول کے مطابق۔ جب خواب میں حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا تو متاثر ہو کر عیسائیت قبول کی اور تبلیغ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس طرح ۲۰ برس تک وہ ایشیائے کوچک، یونان اور اٹلی میں عیسائیت کی تبلیغ کرتا رہا اور اس نے کئی عیسائی چرچ قائم کئے، لیکن وہ جس عیسائیت کی تبلیغ کرتا رہا اس میں چند ایسے عقائد بھی شامل کر دیئے جو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے تعلق نہیں رکھتے۔ مثلاً انھیں خدا کا بیٹا قرار دے کر اس نے باپ، بیٹے اور روح القدس کا تصور دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ حضرت عیسیٰؑ نے سُولی پر چڑھ کر تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا اس لئے اب عیسائیوں سے کسی قسم کی باز پرس نہیں ہوگی اور تمام عیسائی بغیر کسی حساب کتاب کے بہشت میں داخل کئے جائیں گے۔

سینٹ پال کی یہ پُرکشش تعلیمات رومن سلطنت کے مختلف حصوں میں پھیل گئیں اور

ان تعلیمات کو ایسے یہودیوں نے بطورِ خاص قبول کیا جو ارضِ فلسطین سے باہر رہتے تھے۔

سینٹ پال اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مشہور حواری سینٹ پیٹر (Peter) شہنشاہ نیرو کے عہد میں گرفتار ہو کر قتل کئے گئے۔ اس سانحے سے عیسائیت کی تبلیغ کو اور زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ علاوہ ازیں رومیوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے بھی عیسائیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ وہ چھپ چھپ کر اپنے گروہوں کو منظم کرتے رہے اور انھوں نے متعدد مقامات پر اپنے چرچ بھی قائم کئے۔ نیرو کے علاوہ دوسرے شہنشاہوں نے بھی عیسائیوں پر ظلم ڈھائے۔ ان کو قید خانوں میں ڈالا، قتل کیا یا کسی اور طریقے سے تباہ و برباد کرنے کے اقدام کئے۔

ظالم اور مطلق العنان شہنشاہوں کے نزدیک عیسائیوں کا وجود دنیاوی آفات کا باعث تھا اس لئے رومن سلطنت میں عیسائیوں کا قتلِ عام شدت سے جاری رہا۔ اسی عرصے میں یعنی چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں رومن سلطنت مغربی اور مشرقی سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی اور دونوں سلطنتوں میں زبردست خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا جو قسطنطین کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ختم ہوا۔

جب رومن سلطنت کے شہنشاہوں نے تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک ہزاروں عیسائیوں کو قتل کر کے کلیساؤں کو تباہ و برباد کر دیا تو چوتھی صدی عیسوی کی آمد نے ظلم و ستم کے اس سیلابِ بلا کو روکا۔ قسطنطین نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد عیسائیت کو رومیوں کے آبائی مذہب پر فوقیت دی۔ ۳۲۵ء کے لگ بھگ اس نے عیسائی بشپس (Bishops) کی ایک کونسل بنائی جس کا مقصد حضرت عیسٰیؑ کے مقام کا صحیح تعین کرنا تھا کیونکہ اس وقت تک عیسائیوں میں تین نظریئے پیدا ہو چکے تھے۔ ایک نظریہ یہ تھا کہ حضرت عیسٰیؑ خدا سے کمتر ہیں۔ دوسرا نظریہ یہ تھا کہ وہ خدا کا ایک روپ ہیں اور تثلیث کے حامیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ باپ، بیٹا اور روح القدس تین الگ الگ ہستیاں ہیں۔ لیکن خدا کے مکمل تصور کے لئے ان تینوں ہستیوں کا ہونا ضروری ہے۔

قسطنطین کی منعقدہ کونسل نے تثلیث کا نظریہ قبول کیا اور باقی نظریات کو کفر قرار دیا۔ تب سے باقاعدہ طور پر تثلیث عقیدہ عیسائیت کا ستونِ اول بن گیا اور خدا کی وحدانیت کا تصور ختم ہو گیا۔ تقریباً ۳۲۹ء میں رومن شہنشاہ تھیوڈوسیس (Theodosius) نے عیسائیت

کو رومن سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیدیا۔ پوری مملکت میں عیسائی چرچ کے علاوہ دیگر تمام مذاہب کے عبادت خانے قانوناً بند کرادیئے اور دیوتاؤں کی پرستش کو جرم قرار دیا۔ ہر شہر میں عیسائی گرجا گھر تعمیر کئے گئے اور ان کی تنظیم بشپ کو سونپی گئی۔ بڑے شہروں کے بشپ چھوٹے شہروں کے بشپ پر نگراں مقرر ہوئے۔

کچھ عرصے بعد جب رومن سلطنت کی تقسیم مستقل حیثیت اختیار کر گئی تو مغرب میں روم کی حیثیت برقرار رہی لیکن مشرق میں بازنطینی سلطنت الگ حیثیت کی حامل ہوئی اور قسطنطنیہ سیاسی و مذہبی لحاظ سے ایک اہم شہر بن گیا۔ اس طرح مغرب میں روم کا اسقف جس نے پوپ کا لقب اختیار کیا سب سے زیادہ با اثر مانا جانے لگا۔ یوں مذہبی اعتبار سے عیسائی دنیا دو بڑے حصوں میں بٹ گئی۔ ایک کی رہبری روم نے پائی اور دوسرے کی قسطنطنیہ نے۔

مغرب میں روم کا مذہبی اقتدار قریب قریب ۴۷۶ء تک قائم رہا جب تک کہ جرمن قبائلی نے اٹلی کو فتح کرکے روم پر قبضہ نہیں کرلیا۔ بہر کیف تقریباً تین سو سال تک رومن سلطنت اور عیسائی مذہب پر جرمن قبائل اثر انداز رہے، لیکن شارلیمن کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ۸۰۰ء میں دوبارہ روم کی اہمیت کو مغربی عیسائی دنیا میں تسلیم کیا گیا اور پوپ کی حیثیت مذہبی معاملات میں سب سے اہم سمجھی جانے لگی۔ پھر ایسا ہوا کہ مشرق کی بازنطینی حکومت کو انتہائی عروج اور قسطنطنیہ کی چرچ کو بڑی عظمت حاصل ہوئی۔

وہی دور مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کا تھا۔ بازنطینی سلطنت سے یروشلم، اسکندریہ اور کچھ دوسرے شہر تو مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے مگر قسطنطنیہ پر عیسائیت کا اقتدار ۱۴۵۳ء تک قائم رہا۔ پھر ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرکے نہ صرف بازنطینی سلطنت کو ختم کردیا بلکہ مشرق سے عیسائیت کے اثرات بھی کافی حد تک زائل ہو گئے۔

روم کا تہذیبی ورثہ

دنیا کی تہذیب و تاریخ پر تقریباً سات سو سال روم کی تہذیبی زندگی اور رومن امپائر کے تہذیبی سفر کا جو اثر پڑا وہ ایک طویل داستان ہے۔ ایک جمہوری شہر نے وسیع سلطنت اور پھر شہنشاہیت تک کے عروج و زوال کا دور دیکھا۔ اس کے دور میں بڑی بڑی حکومتیں روم کا مقابلہ نہ کر سکیں۔

روم کے لوگوں کا نمایاں کارنامہ یہ رہا کہ انھوں نے مفتوحہ علاقوں کے تہذیبی و تمدنی ورثے سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یونان، مصر، بابل و نینوا کے علوم و فنون کو اپنایا اور اس میں اپنی جانب سے ترقی و توسیع کے امکانات کو بڑھایا۔

۳۰۰ سال قبلِ مسیح روم کی سلطنت اپنی فتوحات کے دائرے کو بڑھاتی رہی اور پہلے جمہوری روایات پر عمل پیرا رہی۔ پھر شہنشاہیت کو فروغ حاصل ہوا۔ تاہم دونوں صورتوں میں تہذیب و تمدن کا کارواں آگے بڑھتا رہا اور تاریخِ انسانی میں ایک نئے تہذیبی باب کا اضافہ ہوتا رہا۔ عظیم الشان عمارتیں بنیں، کشادہ سڑکیں تعمیر ہوئیں، تجارت کے نئے نئے پہلو اجاگر ہوئے، زراعت میں ترقی ہوئی، علوم و فنون ترویج و اشاعت کے زمانے آئے، سمندری بیڑے بنائے گئے، سڑکوں کا جال بچھنے سے سفر کی سہولتیں پیدا ہوئیں، سواریوں کے لئے بہتر انتظامات کئے گئے، انتظامی امور اور رفاہِ عامہ کے مشاغل پر توجہ دی گئی، ٹیکس کے نظام کو مختلف طریقوں سے رائج کیا گیا۔ روم میں دولت کے انبار لگ گئے۔ اناج، کپڑا، جواہرات، خوشبوئیں، آلاتِ حرب، شیشے اور پتھر کی مصنوعات، کتابوں کی اشاعت میں اضافہ ہوا۔ شعر و ادب کا ذوق و شوق بڑھا۔ ان تمام باتوں سے تہذیبی ارتقا میں مدد ملی۔

شہنشاہیت کے زمانے میں روم کی آبادی چار طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اعلیٰ طبقہ جس میں بادشاہ، امراء، بڑے فوجی افسر اور جاگیردار شامل رہتے۔ متوسط طبقہ جس میں تاجر، صنعت کار اور زمیندار

تھے۔ تیسرا طبقہ جس میں عوام، مزدور، سپاہی اور چھوٹے چھوٹے کاروباری لوگ شمار کئے جاتے تھے اور چوتھا طبقہ جو غلاموں پر مشتمل تھا جو مفتوحہ علاقوں سے ملتے یا پھر خریدے جاتے تھے۔ روم میں دولت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ غلاموں کی تعداد بھی بہت بڑھی اور ایک زمانے تو روم کی آدھی آبادی غلاموں کی تھی جن کو زیادہ تر زنجیروں سے جکڑ کر رکھا جاتا اور ظالمانہ سلوک کیا جاتا۔

فوج کے ساتھ ساتھ پولیس کا محکمہ بھی قائم تھا جس میں ہزاروں سپاہی بھرتی کئے جاتے تھے۔ تاجر طبقہ بہت خوشحال تھا۔ صنعتی ترقی سے صنعت کار بھی بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے۔ بینکاری کا نظام بھی قائم ہو چکا تھا۔ طبقۂ امرا میں عیش و عشرت کے ساز و سامان کی فراوانی رہتی تھی۔ طرح طرح کی قیمتی پوشاکیں اور بھانت بھانت کے عمدہ کھانے معمولی دعوتوں پر بھی کثیر دولت خرچ ہوتی تھی۔ تفریحات کے لئے رقص و سرور کی محفلوں کا بھی رواج تھا۔ تعلیمی ترقی بھی خاصی ہوئی۔ یونانیوں کو غلام بنا کر ان سے درس و تدریس کا کام بھی لیا گیا۔ اس طرح یونانی علوم و فنون نے روم کی تہذیب کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

روم کے لوگوں کا ایک خاص وصف قانون سازی سے عبارت ہے۔ اسی قانون سازی نے ان کو جمہوری قدروں سے آشنا کیا اور انھوں نے ایسے عالیشان جمہوری ادارے قائم کئے جو آج تک مہذب دنیا کے لئے باعثِ تقلید رہے ہیں۔ روم کے لوگوں نے نا صرف قانون سازی کی بلکہ ان قوانین کو تحریری شکل میں بھی لائے۔ ان کو پیتل کی تختیوں پر کندہ کرایا گیا تا کہ ضائع نہ ہونے پائیں۔ انھوں نے حسبِ ضرورت ایسے قوانین وضع کیے جو رومن شہریوں کے لئے ہی نہیں بلکہ غیر ملکیوں کے لئے بھی قابلِ قبول ٹھہرے اور جن کو بعد میں بین الاقوامی قوانین کی بنیادیں تسلیم کیا گیا۔ آج بھی قانون کے طالب علموں کے لئے رومن لا کا علم حاصل کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے جس میں تمام معاشرتی عوامل کا احاطہ کیا گیا ہے۔

جہاں تک روم کے لوگوں کی مذہبی قدروں کا سوال ہے تو ابتدائی زمانوں میں وہ مافوق البشر روحوں کی عبادت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان روحوں کو ستاروں کے نام سے منسوب کیا جانے لگا۔ جب روم کا یونان سے تعلق قائم ہوا تو انھوں نے اپنے دیوتاؤں میں وہی خصوصیات دیکھیں جو یونانی دیوتاؤں میں تھیں۔ پھر مصر اور ایشائی علاقوں کو فتح کیا تو وہاں کے مذہبی تصورات کو بھی اپنا لیا۔

یہاں تک کہ ایرانی آتشکدوں کی طرح رومن سلطنت میں بھی آتشکدے بنائے گئے اور آگ کی پرستش کی جانے لگی۔ مصر کی طرح رومن بھی اپنے شہنشاہوں کو دیوتاؤں کے اوتار سمجھنے لگے اور ان کے مجسموں کی عبادت ایک اہم مذہبی فریضہ بن گئی۔ جولیس سیزر کے مجسمے اس کی بڑی مثال ہیں۔

دراصل رومیوں کا مذہب مختلف قدیم مذاہب کا مجموعہ بن گیا تھا جس میں بُت پرستی قدرِ مشترک تھی۔ اسی لئے جب عیسائیت کا دور دورہ ہوا تو پہلے رومن لوگوں نے اسے قبول نہ کیا بلکہ شہنشاہوں کے زمانے میں عیسائیوں کو بے دریغ قتل کیا گیا اور عرصۂ دراز تک رومن سلطنت میں عیسائیت کی حیثیت ایک مظلوم مذہب کی رہی۔ مگر جب شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو قبول کر لیا تو رومن سلطنت میں عیسائیت کو بھی بہت فروغ حاصل ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی تصاویر اور مجسموں کو گرجا گھروں کی زینت بنا کر ان کی عبادت کی گئی۔

روم میں جس زبان کی نشوونما ہوئی وہ لاطینی زبان تھی جس کا شمار بعد میں دنیا کی عظیم زبانوں میں ہوا۔ یورپ کی بیشتر زبانیں اسی زبان سے بنیں۔ اسی زبان کے ذریعے قدیم علوم دیگر زبانوں میں منتقل ہوئے۔ اسی زبان میں قدیم ادبی شاہکاروں کے ترجمے ہوئے جن سے شاعری، ڈرامہ نگاری اور فلسفہ وغیرہ میں رومن لوگوں نے اپنا کردار ادا کیا۔

فنِ تعمیر اور مجسمہ سازی کا فن قدیم تہذیبوں کا ورثہ تھا جسے اپنا کر روم کے لوگوں نے نئی نئی جدتیں کیں۔ عمارتوں میں محرابیں اور گنبد بنائے، دریاؤں پر پُل تعمیر کئے۔ ایسے آڈیٹوریم بھی بنائے گئے جن میں ۵۷ ہزار تماش بین بیٹھ سکتے تھے۔

مجسمہ سازی کی ہمہ جہتی ترقی میں اور شیشے کی میناکاری کے عروج میں بھی اہلِ روم بہت مشہور ہوئے۔ سکّے ڈھالنے اور ان کو نقش و نگار کے ساتھ شہنشاہوں کی تصویروں سے مزیّن کرنے میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔

سابقہ تہذیبوں نے جو لافانی یادگاریں چھوڑی تھیں ان میں روم کی تہذیب نے واقعی عہد آفریں اور تاریخ ساز اضافے کئے۔

ظہورِ قدسیؐ

دو شنبہ کا دن تھا اور صبح صادق کا وقت جب عرب کے ایک خاندان بنی ہاشم میں وہ آفتابِ رسالت طلوع ہوا جس کی ذات کامل پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کے سلسلے کو ختم کر دیا اور رسالت بھی دینِ کامل کے ساتھ تکمیل کو پہنچی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے پیارے اور آخری نبی کو رحمت اللعٰلمین کا لقب عنایت فرمایا۔

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۱۲ ربیع الاوّل کو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے ۵۷۱ سال بعد ہوئی۔ آپ کی والدہ محترمہ آمنہ بنت وہب اور والد محترم عبداللہ تھے۔ سلسلۂ نسب قبیلۂ قریش سے ملتا ہے۔ آپؐ کے دادا کا نام عبدالمطلب تھا۔ چونکہ آپؐ کے والد آپ کی پیدائش سے چار ماہ قبل ہی وفات پا چکے تھے اس لئے پرورش کی ذمّہ داری آپ کے دادا نے قبول کی۔ شروع میں آپ نے اپنی والدہ اور اپنے چچا کی کنیز ثوبیہ کا دودھ پیا پھر شرفائے عرب کے دستور کے مطابق قبیلۂ بنو سعد کی ایک دایہ حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا گیا جو آپ کو اپنے قبیلے میں لے گئیں۔ چار سال کی عمر میں حلیمہ سعدیہ نے آپ کو واپس والدہ کے پاس پہنچا دیا۔ دو سال بعد حضرت آمنہ آپؐ کو لے کر اپنے شوہر کی قبر کو دیکھنے یثرب گئیں اور واپسی پر علیل ہو کر رحلت فرما گئیں۔ اس طرح چھ برس کی عمر میں والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ پھر دو سال بعد آپؐ کے دادا بھی وفات پا گئے۔ ان کی وصیت کے مطابق حضرت ابو طالب نے آپؐ کی پرورش اپنے ذمّے لے لی۔ آپؐ کی عمر پندرہ برس کی تھی جب قبیلہ قیس اور قریش کے درمیان جنگ ہوئی جو مقدس مہینوں میں حرم کے اندر لڑی گئی، اسی لئے حربِ فجار کہلائی۔ اس جنگ میں آپ بھی اپنے چچا کے ساتھ تھے اور تیر اٹھا اٹھا کر ان کو دیتے تھے۔ جنگ کے خاتمے پر فریقین نے معاہدہ کیا کہ آئندہ جنگ نہیں کریں گے۔ ملک سے بد امنی دور کریں گے اور مسافروں کی حفاظت اور مظلوموں کی مدد کریں گے۔

چونکہ اس طرح کے معاہدے کی ایک تجویز بہت پہلے بنو جرہم کے تین سرداروں نے پیش کی تھی جن

نے ناموں میں فضل کا لفظ مشترک تھا اس لئے ان کی طرف منسوب کرتے ہوئے لوگوں نے اس کا نام حلف الفضول رکھا۔ اس معاہدے میں آپ بھی شریک ہوئے اور ہمیشہ اس کا احترام فرماتے رہے۔

جب آپؐ جوان ہوئے تو تجارت کو ذریعہ معاش بنایا او... دوسروں سے روپیہ لے کر کاروبار کا آغاز کیا۔ ہو... آپؐ بچپن ہی سے صادق و امین تھے اس لئے کاروبار میں روپیہ لگانے کو بھی اہل دولت تیار رہتے تھے۔ جب آپ کی صفات حمیدہ کا علم قبیلۂ بنی اسد کی ایک دولت مند بیوہ حضرت خدیجہؓ کو ہوئی تو انھوں نے درخواست کی کہ حضورؐ ان کے سرمائے سے تجارت کریں۔ چنانچہ آپ سامانِ تجارت لے کر شام تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی تھا جس واپسی کے بعد آپ کی اعلیٰ اخلاقی خوبیوں اور نیکیوں کے بارے میں انھیں بتایا تو وہ آپ کی گرویدہ ہو گئیں اور انھوں نے بطور خاص آپ سے شادی کی درخواست کی۔ آپ نے اپنے چچا ابوطالب سے رجوع کیا اور ان کی رضامندی پاکر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال تھی۔ شادی کے بعد جب معاشی اطمینان ہو گیا تو آپ کا زیادہ وقت عبادت الٰہی اور خدمت خلق میں صرف ہونے لگا۔

مصدقہ روایت ہے کہ جب حضور تجارت کے لئے حضرت خدیجہ کے غلام میسرہ کے ہمراہ شام کے بازار بصریٰ پہنچے اور ایک راہب نسطورا کی خانقاہ پاس اترے۔ راہب، میسرہ کو جانتا تھا۔ اس نے پوچھا: "اے میسرہ! یہ کون ہیں جو اس درخت کے نیچے اترے ہیں؟" میسرہ نے بتایا کہ "اہل حرم اور قریش سے ہیں" راہب نے کہا، "سوائے نبی کے اس درخت کے نیچے کبھی کوئی نہیں اترا۔" پھر اس نے پوچھا: "کیا ان کی دونوں آنکھوں میں سرخی ہے؟" میسرہ کے ہاں کہتے ہوئے جواب دیا "ایسی سرخی جو کبھی دور نہیں ہوتی" یہ سن کر راہب بولا، "یہ وہی ہیں اور یہی آخرالانبیاء ہیں۔ کاش میں ان کو پالوں جب یہ معبوث ہوں" پھر میسرہ کو نصیحت کی کہ ان سے جدا نہ ہونا اور نیک نیتی سے ساتھ رہنا۔ اللہ نے ان کو نبوت کا شرف عطا کیا ہے۔"

جب حضورؐ کی عمر مبارک ۳۵ برس کی ہوئی تو قریش کے درمیان زبردست جھگڑا کھڑا ہو گیا اور نوبت کشت وخون تک پہنچ گئی۔ واقعہ یہ تھا کہ سیلاب سے خانہ کعبہ کی دیواریں شق ہو گئی تھیں جن کو گرا کر قریش نے از سر نو تعمیر جاری رکھی۔ تعمیر کے دوران یہ سوال پیدا ہوا کہ حجر اسود کو اس کی جگہ کون نصب کرے۔ ہر قبیلے کا اصرار تھا کہ یہ خاص شرف اسے حاصل ہو۔ چار دن تک بحث و تکرار ہوتی رہی اور اختلافات شدید ہوتے چلے گئے۔ آخر ایک سن رسیدہ سردار نے یہ تجویز پیش کی کہ کل صبح جو شخص سب سے

پہلے حرم میں داخل ہو اسے یہ سعادت سونپی جائے اور وہ جو فیصلہ کرے سب اسے تسلیم کریں۔ اس تجویز تمام قبیلوں کے سرداروں نے مان لیا اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دوسری صبح جب وہ سب حرم میں داخل ہوئے تو وہاں محسنِ انسانیت، سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو موجود پایا۔ آپ کو دیکھ کر سب پکار اٹھے "ہٰذا صادق، ہٰذا امین" ہم ان کے فیصلے کو بسر و چشم قبول کریں گے۔ ان سب نے فیصلے کے لئے آپ سے رجوع کیا۔ آپ نے بڑی دانائی اور بردباری سے یہ کیا کہ اپنی چادرِ مبارک فرش پر بچھائی، اس کے بیچوں بیچ حجرِ اسود کو رکھا اور تمام سرداروں سے کہا کہ سب مل کر چادر کو تھامیں اور اوپر اٹھائیں۔ جب چادر کی بلندی اس مقام تک پہنچ گئی جہاں حجرِ اسود نصب کرنا تھا۔ آپ نے اپنے دستِ مبارک سے اسے چادر سے اٹھایا اور پوری احتیاط سے نصب فرما دیا۔ اس سے پہلے آپ نے تمام سرداروں اور متعلقہ افراد کو اتنا اعتماد میں لے لیا تھا کہ وہ آپ کے حسنِ عمل کو خراجِ تحسین ادا کر رہے تھے۔ یہ اتنا خوش کن واقعہ تھا جس نے ایک خوفناک اور خوں ریز قبائلی جنگ کو روک دیا اور سب مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

بعثتِ نبوی

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غور و فکر کرنے کا سلیقہ تو کارسازِ حقیقی نے خزانۂ غیب سے ودیعت کیا تھا۔ آپ اکثر و بیشتر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور حیات و کائنات کے مسائل پر غور و فکر فرمانے مکۃ مکرمہ سے متصل جبل نور کے غارِ حرا میں تشریف لے جاتے جہاں زندگی کے بہت سے حقائق آپ کے قلبِ اطہر پر منکشف ہوئے۔ ان دنوں آپ کی عمر قمری حساب سے چالیس برس کی ہو گئی تھی۔ ایک دن جبرئیل امین تشریف لائے اور کہا "میں جبرئیل ہوں، اللہ تعالیٰ کا فرشتہ۔ مجھے اس غرض سے بھیجا گیا ہے کہ ربِ جلیل کے پیغامبر کی حیثیت سے آپ کو پیغام ربانی پہنچا دوں۔" پھر حضرت جبرئیل نے کہا "اقراء" یعنی پڑھیے۔ آنحضرتؐ نے جواب دیا کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ تب جبرئیل نے آپ کو تین مرتبہ اپنے سینے سے لگایا اور سورۂ اقرا کی تین آیتیں نازل کیں۔ یہ پہلی وحی الٰہی تھی۔

روایت ہے کہ اس واقعے سے آپ کچھ پریشان سے ہو گئے۔ نبوت کے فرائض کا احساس آپ کو خوف زدہ سا کر رہا تھا۔ اسی عالم میں آپ گھر تشریف لے گئے اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا "مجھے کچھ اوڑھا دو۔" کچھ دیر آرام فرمانے کے بعد جب قلب کی حالت پر سکون ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہؓ سے تمام واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا "مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔" آپ کا اشارہ نبوت کی مشکلات کی طرف تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تشفی دی اور اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ کا شمار بڑے عالموں میں ہوتا تھا۔ مذہبی کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کیا تھا۔ پورے مقدس واقعے کو سن کر بولا کہ وہ فرشتۂ رحمت جبرئیل امین تھے جو وحی الٰہی لے کر آپ کے پاس آئے تھے۔ آپ سے پہلے حضرت موسیٰؑ کے پاس بھی وہ ہی وحی لے کر گئے تھے۔ قوم آپ کو یہاں سے نکال دے گی اور اگر میں زندہ رہا تو حتی المقدور آپ کی مدد کروں گا۔

بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اسلامؐ کو ہدایت فرمائی کہ آپ اس دین کو جو آپ پر نازل کیا جا رہا ہے دوسروں تک پہنچائیں۔ چنانچہ آپ نے دینِ اسلام کی تبلیغ کا آغاز فرما دیا۔ جو لوگ آپ پر ایمان لا کر مشرف بہ اسلام ہوئے ان میں حضرت خدیجہؓ، آپ کے مخلص غلام زید بن حارثؓ، آپ کے دوست حضرت ابوبکر صدیقؓ اور آپ کے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ شامل تھے۔ اس ابتدائی دور میں دوسرے لوگ اگر کھلے دشمن نہ تھے تو ان پر تذبذب کی کیفیت ضرور طاری تھی جو بعد میں دور ہوئی اور ایمان لانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد تین سال تک حضرت جبرئیلؑ دوبارہ آپ کے پاس نہیں آئے۔ آپؐ کے قلب میں بے قراری سی رہنے لگی۔ آپ تذبذب اور مایوسی کا شکار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب اتنا بڑا رتبہ عطا کیا جو سارے انبیائے کرام سے افضل و برتر تھا، پھر تین سال تک وحی کا نازل نہ ہونا ایک بڑا واقعہ تھا۔ ایسے میں آپ کی چچی امّ لہب نے آپ کو طعنہ دیا: "شاید تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور وہ تم سے بیزار ہو گیا ہے۔" شیطان سے مراد اس دریدہ دہن کی حضرت جبرئیل سے تھی۔ یہ توہین آمیز طعنہ آپ کو بہت ناگوار گزرا۔ آپ دل برداشتہ ہو کر پہاڑ کی چوٹی پر چلے گئے۔ وہاں اچانک حضرت جبرئیل نمودار ہوئے اور آپ کو تسلی دیتے ہوئے کلام ربانی سنایا "قسم ہے دن چڑھتے وقت کی اور رات کی جب وہ چھا جائے۔ نہ اللہ نے آپ کو چھوڑا ہے نہ آپ سے ناراض ہوا۔ پس یتیم کے ساتھ درشتی سے پیش آنا اور نہ سوالی کو جھڑکنا اور اللہ نے آپ پر جو فضل کیا ہے اسے بیان کرتے رہنا۔" آپ نے اللہ کے اس خصوصی پیغام کے مقصد کو فوراً سمجھ لیا کہ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھنا اور تمام انسانوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا چاہیے۔

اس کے بعد نبی کریمؐ نے پوری تندہی سے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ آپ کی تبلیغ کے دو نمایاں پہلو تھے یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور موت کے بعد زندگی اور آخرت کا تصور۔ آغازِ تبلیغ ہی سے کفارِ مکہ آپ کے بدترین دشمن بن گئے۔ آپ نے حضرت ارقم مخزومی کے مکان کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا اور یہیں مسلمانوں کا اجتماع ہونے لگا۔ حضرت ارقمؓ کا گھر کوہِ صفا کے نشیب میں تھا۔ وہیں نماز بھی ادا کی جاتی رہی۔ تین سال بعد اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ حکم ملا "آپ کھول کر بیان کر دیں جو آپ کو حکم دیا جاتا ہے اور مشرکوں سے کنارہ کشی کیجیے۔"

یہ حکم ملتے ہی رسول اللہؐ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قبیلۂ قریش کے لوگوں کو پکارا۔ وہ سب جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا: "بتاؤ! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ وادیٔ مکہ سے سواروں کا ایک لشکر تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تمہیں یقین آجائے گا؟" وہ سب بولے: "ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولتے دیکھا ہے، اس لئے ہم اس بات کا بھی یقین کر لیں گے۔" یہ سن کر آپ نے فرمایا: "تو میں تم سے کہتا ہوں اگر تم مجھ پر ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر سخت عذاب نازل ہوگا۔" اس پر ابولہب نے آپ کی شان میں نازیبا کلمات استعمال کرتے ہوئے کہا: "اس لئے ہم کو جمع کیا تھا۔" ابولہب کے اس مشرکانہ اور ظالمانہ برتاؤ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ارشاد ہوا: "ہلاک ہوں ہاتھ ابولہب کے اور ہلاک ہوں وہ خود بھی۔ کام نہ آئے وہ مال جو اس نے کمایا ہے۔"

غرض علی الاعلان تبلیغ کے سلسلے میں حضور اکرمؐ کو بہت صبر آزما اور مصائب و آلام سے بھرپور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔

بعثتِ نبوی کے بعد

رسولِ اکرمؐ نے اپنی بعثت کے بعد اسلام کی تبلیغِ حق سے جن لوگوں کو ایمان لانے کا شرف بخشا ان میں سب سے پہلے آپ کی اہلیہ حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ، حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت بلال حبشیؓ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایمان لاتے ہی دعوتِ اسلام دینی شروع کر دی جس کے نتیجے میں حضرت عثمان غنیؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس طرح یہ دس حضرات مجموعی طور پر عشرہ مبشرہ کہلائے اور انھیں جیتے جی جنت الفردوس کی بشارت عطا ہوئی۔ ان کے بعد حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت ارقم بن ابی ارقمؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ، حضرت عبیدہ بن حارثؓ، حضرت خالد بن سعیدؓ اور دیگر حضرات ایمان لائے۔ خواتین میں حضرت فاطمہ بنتِ خطابؓ، حضرت اسما بنتِ ابی بکرؓ، حضرت اسما بنتِ سلامہؓ اور کئی نیک دل بیبیوں نے حضورؐ کی دعوتِ حق کو قبول کر کے سابقین اولین کے زمرے میں جگہ پائی۔

جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے علی الاعلان تبلیغ کا سلسلہ شروع ہوا تو سرداران قریش جن میں ابوسفیان، ابوجہل اور عتبہ جیسے سردار شامل تھے، حضرت ابوطالب کے پاس آکر کہنے لگے کہ آپ کا بھتیجا ہمارے خداؤں کو برا کہتا ہے، ہمارے بزرگوں کو گمراہ بتاتا ہے اور ہمیں احمق ٹھہراتا ہے۔ آپ اسے منع کریں یا بیچ سے ہٹ جائیں، ہم خود سمجھ لیں گے۔ حضرت ابوطالب نے ان کو نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا اور حضورؐ کو بلا کر کہا کہ اے میرے بھتیجے! تیری قوم نے میرے پاس آکر ایسا ایسا کہا ہے۔ تم اپنے آپ پر اور مجھ پر رحم کرو۔ رسول پاکؐ نے جواب دیا "اے میرے چچا! اللہ کی قسم اگر وہ سورج کو میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند کو بائیں ہاتھ پر رکھ دیں تب بھی میں تبلیغِ حق نہ چھوڑوں گا۔ چاہے اللہ اسے غالب کر دے یا میں خود اس میں ہلاک ہو جاؤں۔"

پیامِ حق نے عربوں کے مشرکانہ عقائد اور اہلِ مکہ کی کافرانہ روایات کو متزلزل کر دیا تھا۔ اس لئے انھوں نے اسلام کی تعلیمات کا مذاق اڑایا، مسلمانوں پر طرح طرح کی سختیاں کیں، ظلم و تشدد کا طوفان برپا کر دیا۔ اس شدید مخالفت کا سامنا کرنا آسان نہ تھا۔ تمام مخالفتوں کا پہلا سبب یہ تھا کہ قریش صدیوں سے شرک و بت پرستی میں مبتلا تھے۔ دوسرا سبب یہ کہ ان کے اکثر افعال کو اسلام برا سمجھتا تھا اور ان کی ممانعت کرتا تھا۔ تیسرا سبب یہ کہ قریش اپنے آباؤ اجداد کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اگر وہ شرک و بت پرستی سے باز آجاتے تو گویا اپنے آپ کو ناخلف ٹھہراتے۔ چوتھا سبب یہ تھا کہ خانۂ کعبہ بت پرستی کا سب سے بڑا مرکز تھا جس کے متولی قریش تھے۔ بھلا وہ اپنی برتری پر کاری ضرب کیسے برداشت کرتے۔ بت پرستی سے تو ان کے معاشی مفادات بھی وابستہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سب نے رسولِ اکرمؐ اور اسلام لانے والوں کو ستانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

اسلام کی تبلیغ کو گوارا نہ کرتے ہوئے قریش نے جو مشرکانہ و ظالمانہ طریقے اختیار کئے۔ اسلامی تاریخ میں ان کا ذکر تفصیل سے موجود ہے۔ کفارِ مکہ نے مخالفتوں کا سیلاب اٹھایا جس کا اہم ترین سبب یہ تھا کہ قبیلہ قریش دو ذیلی شاخوں میں بٹا ہوا تھا یعنی بنو امیہ اور بنو ہاشم۔ ان دونوں شاخوں کے درمیان ایک عرصے سے سخت رقابت جاری تھی۔ چونکہ حضورِ اکرمؐ کا تعلق بنو ہاشم سے تھا اس لئے مخالفین کو رقابت کی آگ بھڑکانے کا زیادہ موقع ملا۔ جب قریش نے دیکھا کہ اسلام کا پیغام دور دور تک پہنچ رہا ہے اور مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے تو انھوں نے اذیتوں کے ساتھ ساتھ حضورِ اکرمؐ کی تکذیب پر کمر باندھی۔ آپ کو شاعر، جادوگر، کاہن، پاگل وغیرہ کہا لیکن آپ ثابت قدمی سے تبلیغِ دین فرماتے رہے۔

ایک دن آپ خانۂ کعبہ کے نزدیک نماز پڑھ رہے تھے۔ حرم شریف میں اس وقت مخالفین کی ایک جماعت موجود تھی۔ عقبہ بن ابی معیط نے ابوجہل کی ترغیب سے تازہ ذبح کئے ہوئے اونٹ کی غلاظتیں حالتِ سجدہ میں آپ کے شانوں پر رکھ دیں اور قہقہے لگانے لگے۔ آپ کی صاحبزادی کو خبر ہوئی تو وہ فوراً آئیں اور مبارک شانوں سے اس بلاءِ غلاظت کو ہٹایا۔

اسی طرح شیاطینِ قریش ایک روز خانۂ کعبہ میں جمع تھے اور حضور حسبِ معمول سربسجود تھے کہ ابوجہل ایک بھاری پتھر سے سرِ مبارک کچلنے کے لئے بڑھا لیکن نزدیک پہنچا تو اتنا خوف زدہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی غیبی طاقت نے اس نابکار کو الٹے پاؤں بھگا دیا۔

ایک مرتبہ آپ مقامِ ابراہیم کے پاس نماز ادا فرما رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط نے آپ کی گردن میں چادر ڈالی اور زور سے کھینچا، آپ گھٹنوں کے بل گر گئے۔ وہ ظالم یہ سمجھا کہ آپ جان سے گئے۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ دوڑے ہوئے آئے اور اس ظالم کو للکارا "کیا تم ایک شخص کو اس لئے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے"۔

اذیتوں کا سلسلہ تمام اہلِ ایمان پر جاری تھا۔ آپ کے اصحابؓ بھی طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ وہ غریب مسلمان جن کا مکہ میں کوئی قبیلہ یا ساتھی نہ تھا خصوصیت سے مشقِ ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اذیتیں مختلف قسم کی تھیں مثلاً آگ پر لٹانا، تپتی ریت پر لٹا کر بھاری پتھر سینے پر رکھ دینا، چابک سے مار مار کر کھال ادھیڑ دینا، چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں دینا، جکڑ کر کوٹھڑی میں بند کر دینا، پاؤں میں رسی باندھ کر تپتی ریت پر گھسیٹنا، گلا گھونٹ کر ادھ موا کر دینا، مار مار کر بے ہوش کر دینا اور تیر مار کر ہلاک کرنے کی کوشش کرنا۔

رسولِ اکرمؐ پر جب مکہ میں عرصۂ حیات بے حد تنگ کر دیا گیا اور اذیتوں میں نو بہ نو اضافہ ہوتا رہا تو آپ نے طائف کا قصد کیا تاکہ وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں، لیکن اہلِ طائف نے تو ظلم کی انتہا کر دی۔ آپ پر پتھر برسائے، دشنام طرازیاں کیں اور ایسی شدید ضربیں لگائیں کہ کئی مرتبہ سرتاپا لہولہان کر دیا۔ اللہ اکبر، سرورِ دو عالمؐ کتنے اعلیٰ ظرف اور نیکیوں کا پیکر تھے کہ کسی کے لئے بددعا نہ کی۔ بس خالقِ اکبر کے حضور اسلام کی سربلندی کے لئے دعاگو رہے۔

ہجرتِ نبوی سے پہلے

جب پیغمبرِ اسلام سرورِ دو عالمؐ نے دیکھا کہ مکہ میں مسلمانوں کا رہنا دوبھر ہوگیا ہے تو آپ نے اصحاب سے فرمایا "ملک حبشہ کا بادشاہ اپنے ملک میں کسی پر ظلم نہیں ہونے دیتا۔ تم میں سے جو جاہیں وہ وہاں چلے جائیں۔ چنانچہ بعثت نبوی کے پانچویں سال ماہ رجب میں گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن میں حضرت عثمان غنیؓ اور ان کی اہلیہ محترمہ رقیہؓ بنتِ رسول اللہؐ بھی تھیں۔ حسنِ اتفاق سے اسی وقت دو تجارتی جہاز حبشہ جا رہے تھے۔ انھوں نے سستے داموں ان کو اپنے ساتھ لے لیا۔ قریش نے پیچھا کرکے روکنا چاہا مگر ناکام رہے۔ مہاجرین تقریباً تین ماہ وہاں امن وامان سے رہے لیکن ماہ شوال میں یہ غلط خبر ملی کہ اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے، اس لئے اکثر لوگ حبشہ سے مکہ واپس آ گئے۔

بعثت نبوی کے چھٹے سال حضور اکرمؐ کے چچا امیر حمزہ ایمان لائے اور ان کے تین دن بعد حضرت عمر فاروقؓ بھی مسلمان ہو گئے۔ جو لوگ حبشہ سے واپس آئے تھے قریش نے ان کو اور دوسرے مسلمانوں کو زیادہ ستانا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس مرتبہ ۸۳ مردوں اور ۱۸ عورتوں کو ہجرت کی اجازت دی گئی اور یہ سب حبشہ چلے گئے۔ قریش نے اپنے سفیروں کو حبشہ کے شاہ نجاشی کے پاس تحائف اور نذرانوں کے ساتھ بھیجا مگر نجاشی نے مسلمانوں سے چند مذہبی مکالموں کے بعد کہا " واللہ جو تم کہتے ہو حضرت عیسیٰؑ اس سے ایک تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں ہیں۔"

دشمنانِ اسلام کی ساری سفارتی کوششیں ناکام رہیں۔ ادھر قریش نے اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لئے طے کیا کہ حضورؐ کو اعلانیہ قتل کر دیا جائے۔ اس بات کی خبر حضرت ابوطالب کو ملی تو انھوں نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کو جمع کر کے کہا کہ میرے بھتیجے کو اپنے شعب میں لے چلو۔ اب کفار قریش نے ان سب کا سوشل بائیکاٹ کر کے اذیتیں دیں اور کہا قتل کرنے کے لئے محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ عرصۂ حیات

مزید تنگ ہوتا جائے گا۔ مگر یہ تمام حربے بھی ناکام ہوئے اور تین برس انھیں سخت آزمائشوں میں گزارنے پڑے۔ پھر بعثت کے دسویں سال ابوطالب نے وفات پائی اور تین دن بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ بھی وفات پا گئیں۔ اب کفار مکہ ایذا رسانیوں میں اور زیادہ دلیر ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آپؐ طائف چلے گئے تھے، مگر وہاں تو ظلم و ستم کی انتہا ہو گئی تھی۔

بعثت نبوی کے گیارہویں سال حج کے دنوں میں حسب سابق آپ نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ حضور اکرمؐ ہر سال حج کے لئے آنے والوں میں تبلیغ حق فرماتے۔ عکاظ عرب کی ایک بڑی تجارتی منڈی تھا جہاں ہر سال بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ آپ ڈیروں پر جاکر تبلیغ فرماتے مگر کوئی ایمان نہ لاتا کیونکہ ابولہب بڑی مستعدی سے لوگوں کو ورغلاتا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے دین کامل اور رسول پاک کی نصرت منظور تھی، اس لئے یثرب سے آئے ہوئے چھ حضرات نے اسلام قبول کیا اور جاکر اسلام کی تعریف کی۔

یثرب سرزمین عرب کا ایک قدیم تہذیبی مرکز تھا۔ بہت قدیم زمانے میں یہاں قوم عمالقہ بستی تھی۔ ان کے بعد شام سے یہود آ بسے اور انھوں نے یثرب کے اردگرد اپنی بستیوں کو بڑھا کر چھوٹے چھوٹے قلعے بنائے۔ جب یمن میں زبردست سیلاب آیا تو وہاں کے لوگ مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ چنانچہ قبیلۂ ازد بن غوث قحطانی کے دو بھائی اوس و خزرج نے یثرب کا رخ کیا اور وہاں جا بسے۔ تمام انصار ان ہی دو بھائیوں کی اولاد میں سے تھے۔

چونکہ یثرب میں یہودیوں کا بڑا زور تھا اس لئے اوس و خزرج قبیلے کے لوگ ان کے حلیف بن گئے۔ یہود اہل کتاب اور صاحب علم تھے جبکہ اوس و خزرج بت پرست تھے۔ انھوں نے یہودیوں سے سنا تھا کہ ایک اور پیغمبر عنقریب مبعوث ہونے والا ہے۔ اس لئے جب حضور اکرمؐ کی دعوت حق کو قبیلہ خزرج کے ان چھ آدمیوں نے سنا تو آپس میں کہا "یہ تو وہی ہیں جن کا ذکر ہم نے یثرب کے یہودیوں سے سنا ہے۔ کہیں یہود ہم پر سبقت نہ لے جائیں" اس لئے وہ سب ایمان لے آئے اور واپس جاکر اپنے بھائی بندوں کو اسلام کی دعوت دی۔ پھر آئندہ سال بارہ آدمی آئے اور بیعت کرتے ہوئے عہد کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے، چوری نہ کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے، کہیں امر معروف میں نافرمانی نہ کریں گے۔

حضورؐ نے واپسی پر ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر کو بھیجا تاکہ یثرب کے لوگوں کو

اسلام کی تعلیم دیں۔ اس میں خاصی کامیابی ہوئی اور سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ اسی ماہ رجب کی ستائیسویں شب کو واقعۂ معراج پیش آیا اور پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں۔ بعثت کے تیرھویں سال میں ایّامِ حج پر انصار کے ساتھ ان کی قوم کے مشرکین چھپ کر عقبہ منیٰ میں حضورؐ کے پاس آئے۔ ان میں حضرت عباس بن عبدالمطلب بھی موجود تھے جو ایمان نہ لائے تھے۔ سب سے پہلے وہی بولے "اے گروہِ خزرج! محمد اپنی قوم میں معزز ہیں اور اپنے شہر میں مددگاروں کی ایک جماعت رکھتے ہیں۔ ہم نے ان کو دشمنوں سے بچایا ہے۔ اگر تم اپنے عہد کو پورا کر سکو اور ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی سے ان کا ساتھ چھوڑ دو۔" اس کے بعد حضورؐ نے ان کو دعوتِ اسلام دی جسے ان سب نے بخوشی قبول کیا اور پکے مسلمان ہو گئے۔

ہجرت نبویؐ

دنیا کی بڑی بڑی قوموں نے تاریخ و تہذیبِ انسانی پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ اپنا ایک مستقل نظام تقویم بھی رکھتی ہیں جس کے مطابق وہ اپنی ابتدا اپنے عہد اور اس کے مختلف ذیلی ادوار اور سال کے اہم دنوں کا تعین کرتی رہی ہیں۔ اسی سے کسی قوم کا جداگانہ تہذیبی کردار اجاگر ہوتا ہے اور یہی تقویم اس کے قومی تشخص کو محفوظ رکھتی ہے۔

اسلامی تقویم کا آغاز واقعۂ ہجرت یعنی رسولِ مقبولؐ کے اپنے وطن مالوف مکہ مکرمہ کو خیرباد کہہ کر یثرب کی جانب تشریف لے جانے سے عبارت ہے۔ وہ یثرب جسے مدینۂ منورہ کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں لفظ ہجرت کے معنی نقلِ مقام کے ہیں۔ لیکن رسول اکرمؐ کی نسبت نے اسلام نے اس لفظ کو وسیع تر اور عمیق تر مفہوم عطا کر دیا ہے۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنے مشن کی ابتدا غارِ حرا سے فرمائی تھی جہاں سنہ ۶۱۰ عیسوی میں رمضان المبارک میں آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد چند خوش نصیبوں نے اسلام قبول کیا۔ رفتہ رفتہ ایمان لانے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اسی تناسب سے کفارِ مکہ نے اسلام کی مخالفت کو تیز تر کیا۔ آگے چل کر یہ مخالفت جان لیوا حد تک بڑھ گئی۔

حضورِ اکرمؐ نے قریش کی ایذا رسانیوں سے عام مسلمانوں کو بچانے کے لئے یثرب چلے جانے کا مشورہ دیا اور مسلمانوں نے اس پر عمل کیا۔ تاہم حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور کچھ بیمار و عاجز وہاں مکے میں رہ گئے۔ پھر جب صدیق اکبرؓ نے ہجرت کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا کہ "امید ہے مجھے بھی ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔"

قریش نے جب دیکھا کہ مہاجرین کو انصار نے اپنی حمایت و پناہ میں لے لیا ہے تو وہ

ڈر سے کہ کہیں رسول اکرم (صلعم) وہاں نہ جا پائیں پھر اپنے مددگاروں کو ساتھ لے کر حملہ آور ہوں،
اس لئے تمام قبائلِ قریش نے طے کیا کہ ہر قبیلے سے ایک ایک آدمی چن لیا جائے اور وہ سب
رات کے وقت آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیں تاکہ صبح جب وہ باہر نکلیں تو حملہ کر کے قتل کر دیں۔ ادھر
اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبیؐ کو اس خطرے سے باخبر کرتے ہوئے ہجرت کا حکم دیا۔ چنانچہ شام ہی
کو آپ نے وہ تمام امانتیں جو کفار نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں، حضرت علیؓ کے سپرد کرتے ہوئے
فرمایا کہ میں آج ہجرت کر جاؤں گا۔ تم میرے بستر پر سو رہنا اور صبح کو ساری امانتیں واپس کر دینا۔
اس انتظام کے بعد آپ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور رات ہی کو دونوں روانہ ہو کر مکہ سے تین میل کے
فاصلے پر غارِ ثور میں چھپ گئے۔ صبح کو محاصرہ کرنے والوں نے انتظار کیا مگر مایوس ہوئے۔ سخت
پیچ و تاب میں مبتلا ہو کر تلاش میں دوڑے۔ ایک ٹولی غارِ ثور تک بھی پہنچی مگر اللہ تعالیٰ نے ان
ظالموں کو نامراد لوٹایا۔ تین دن غارِ ثور میں قیام کے بعد روانہ ہوئے اور آٹھویں دن قبا پہنچے جو مدینے کے
نواح میں واقع تھا۔ وہاں چودہ دن قیام فرمایا اور ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی جو تاریخِ اسلام کی پہلی مسجد تھی۔
پھر حضور نبی کریمؐ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچے اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر مقیم ہوئے۔

سنہ ۶۲۲ء عیسوی میں ہونے والی رسولِ مقبولؐ کی ہجرت آپ کے پیغمبرانہ نصب العین کا فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوئی۔ بلاشبہ ہجرت کا واقعہ تاریخ ساز اور عہد آفریں واقعہ تھا جس نے اسلام کی توسیع و اشاعت کے لئے حالات کو یکسر بدل ڈالا اور اسلامی تحریک نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ اس طرح ایک واحد سربراہ کے تحت حق پرستانہ رہنمائی میں اسلامی معاشرہ منظم ہو گیا۔

مکے میں رسول اکرمؐ بنیادی طور پر ایک عام شہری تھے لیکن مدینے میں آپ کی حیثیت کلیتاً ایک سربراہِ معاشرہ کی ہو گئی۔ مکے میں اسلام دشمنوں کی ایذا رسانیوں کو سہنے کے علاوہ آپ وہ سب کچھ نہ کر سکتے تھے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا تھا یعنی دینِ اسلام کی بنیادوں پر ایک ایسے فلاحی معاشرے کا قیام جو رہتی دنیا تک تاریخ و تہذیب میں زندہ جاوید حیثیت اختیار کر سکے گویا مدینہ منورہ سے اسلام کی تاریخ ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔

ہجرت کا مرحلہ بجائے خود کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کا بیان جو غارِ ثور سے روانہ ہونے کے بعد کی کیفیات کو ظاہر کرتا ہے۔ فرمایا: "دوشنبہ کی رات کو روانہ ہو کر ہم برابر چلتے رہے

یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی اور راستے میں آمد و رفت بند ہونے لگی۔ ہمیں ایک بڑا پتھر نظر آیا۔ ہم اس کے نزدیک اونٹنیوں سے اتر پڑے۔ میں نے اس کے سائے میں جگہ ہموار کی، اس پر پوستین بچھادی اور عرض کی کہ یا رسول اللہؐ! آپ سو جائیں میں پاسبانی کرتا ہوں۔ آپ سو گئے۔ میں ادھر ادھر دیکھتا رہا کہ کوئی دشمن تو نہیں آرہا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چرواہا اپنی بکریوں کے ساتھ اسی پتھر کی طرف سائے میں آرام پانے کے لئے لارہا ہے۔ میں نے پوچھا، تو کس کا غلام ہے؟ اس نے قریش کے ایک شخص کا نام لیا تو میں نے اسے پہچان لیا اور دریافت کیا کہ ان بکریوں میں سے دودھ دینے والی بکری کا دودھ نکال کر دے سکتا ہے۔ اس نے کہا، ہاں، تو میں نے ایک بکری پکڑ کر گرد و غبار سے اس کا تھن صاف کیا پھر اس سے کہا کہ وہ بھی اپنا ہاتھ صاف کر لے۔ اس نے لکڑی کے پیالے میں دودھ دوہا۔ میں نے ٹھنڈا کرنے کے لئے دودھ میں تھوڑا سا پانی ملایا اور خدمتِ اقدس میں پیش کیا۔ آپ نے خوب پیا جس سے میری طبیعت خوش ہو گئی۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ چلنے کا وقت نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا، ہاں۔ دن ڈھل چکا تھا کہ ہم وہاں سے چلے۔

یقیناً مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک بڑے صبر آزما مرحلے پیش آتے رہے ہوں گے۔

علاوہ ازیں ہجرت میں جذبۂ ایثار کے کارفرما ہونے کا اظہار رسول اکرمؐ اور صحابۂ کرام سے منقول متعدد اقوال سے ہوتا ہے۔ مثلاً ایک صحابی اپنے اور بعض صحابۂ کرام کے اس وقت کے جذبات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: "میں نے اپنے رشتے داروں، متعلقین اور اپنے مال و جائیداد کو اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے کے لئے چھوڑا تھا۔ ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "ہم نے خدائے بزرگ و برتر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اللہ کے رسولؐ کے ساتھ ہجرت کی۔"

حضورؐ کی مدنی زندگی

ہجرت سے کارنامۂ رسالت کا وہ مہتم بالشان دور شروع ہوتا ہے جو انسانیت نوازی کی بہترین مثالیں اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ اگر رسول اکرمؐ کے سپرد صرف اتنا ہی کام ہوتا کہ لوگوں پر شرک و کفر کی برائیاں واضح کر دیں، توحید کی دعوت دیدیں اور روزِ محشر کی باز پرس سے باخبر کر دیں تو ہجرت کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ یہ فریضہ تو مکہ میں انجام پا چکا تھا۔ مگر قدرت نے آپ کو اس سے بھی اہم تر مقاصد کے لئے مبعوث کیا تھا۔

انسانیت تہذیب و تمدن کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی ایک ایسے مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں صحیح عقلی اور علمی رہنمائی ناگزیر ہو گئی تھی۔ انفرادی تزکیۂ نفس کے ساتھ اسے ان احکام اور ہدایتوں کی ضرورت تھی جو اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کو پاکیزہ بنیادوں پر استوار کر کے نظم و ضبط، عدل و انصاف، اخوت و مساوات، اتحاد و یگانگت، ہمدردی و رواداری اور خلوص و محبت کی شاہ راہ پر گامزن کر دیں۔ ظلم و تشدد، وحشت و بربریت، ناانصافی و حق تلفی، گمراہی و بدچلنی اور ایسی تمام برائیوں کو ختم کر کے امن و آشتی کی فضا اور روحانی و مادی فلاح و بہبود کے سیدھے سچے راستے کھل سکیں۔ یہ مقاصد اسی وقت حاصل ہو سکتے تھے جب اسلام کو سازگار فضا اور آزاد سرزمین حاصل ہو۔ ایسے مواقع مدینہ منورہ میں حاصل ہوئے جہاں مسلمانوں کی وہ اجتماعیت اور تہذیبی یکجہتی وجود میں آئی جو ایمان و اعتقاد کی بنیادوں پر صرف مسلمانوں ہی کا روشن افق نہیں تھی بلکہ جس کی آب و تاب ساری مہذب دنیا کے لئے مشعلِ راہ بنی۔

سرورِ عالمؐ کی ہمہ جہتی قیادت میں مسلمانوں نے ایک ایسی ریاست کی بنیاد رکھی جو تیس برس کی مدت میں بحرِ اٹلانٹک یعنی بحرِ ظلمات سے خراسان و ایران تک پھیل گئی۔ اس مثالی ریاست کا دارالخلافہ مدینہ منورہ تھا۔ جہاں سیاست و معاشرت، تہذیب و تمدن، ادب و ثقافت، عدل و انصاف، صلح و جنگ

بین الاقوامی تعلقات کے وہ اعلیٰ وارفع اصول عمل میں آئے جن کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ اُن مثالی کارناموں کی بنا پر خالق کائنات نے اپنی نعمتوں کے اتمام اور سلسلۂ نبوت کے اختتام کا اعلان فرمایا۔ یعنی اب کوئی ایسا کام باقی نہ رہا جس کی انجام دہی کے لئے کسی دوسرے نبی کو مبعوث کرنا ضروری ہوتا اور نہ اقوام عالم کے لئے کوئی عذر باقی رہا جو روزِ قیامت وہ پیش کرسکیں کہ اللہ کے احکامات ہم تک نہ پہنچے یا ان پر عمل کا طریقہ ہمیں معلوم نہ ہوسکا اس لئے ہم مجرم نہیں ہیں۔

رسولِ اکرمؐ کی زندگی بہترین نمونہ تھی۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس میں خوشگوار معاشرت اور بقائے باہمی کی کوئی کمی ہو۔ تاریخِ عالم کے غیر مسلم اسکالروں تک نے اس دور کی اسلامی ریاست کو ہر لحاظ سے مثالی و فلاحی ریاست کا درجہ دیا ہے۔

مدینہ منورہ میں جو اولین مسئلہ درپیش ہوا وہ مہاجرین کا تھا۔ آپ نے تجویز کیا کہ مدینے کے ہر خوشحال گھرانے کو چاہیئے کہ وہ ایک مہاجر گھرانے کو برادرانہ تعلقات کی بنا پر اپنے ساتھ رکھے۔ دونوں ایک مربوط خاندان کی طرح زندگی گزاریں۔ انصار تو پہلے ہی کشادہ قلبی سے مہاجرین کو گلے لگا رہے تھے۔ اس طرح مہاجرین کا مسئلہ بہت جلد بڑی خوش اسلوبی سے طے ہوگیا۔

دوسرا اہم مسئلہ دفاع سے متعلق تھا۔ جب رسول اکرمؐ مدینے میں قیام پذیر ہوئے تو وہاں سیاسی خلا موجود تھا اس وقت چند متحارب خاندان تھے جو نہ کسی کی قیادت تسلیم کرتے تھے نہ کسی طرزِ حکمرانی سے واقف تھے۔ آپ نے آبادی کے ہر طبقے یعنی مسلمان، مشرکین عرب، یہودیوں اور نصرانیوں کے نمائندوں کو جمع کرکے ایک شہری ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی۔ ایسی ریاست جو ہر حملہ آور کا مقابلہ کرسکے۔ یہ تجویز مان کر سب نے آپ ہی کو اس نئی ریاست کا سربراہ منتخب کیا بلکہ پُرزور درخواست کی کیونکہ سبھی کو معلوم تھا کہ آپ اللہ کے رسول کی حیثیت سے کتنے صادق و امین اور خوش خلق ہیں۔

ریاست کے سربراہ کے طور پر آپ کو سب سے پہلے دستور منضبط کرنا تھا۔ اس دستور کا متن آج بھی موجود ہے جو دنیا میں تحریری دستور کی اولین معلوم مثال ہے۔ یہ دستور سربراہ ریاست کے حقوق و فرائض اور اس کی ذمہ داریوں کا تعین کرتا ہے۔ نیز دفاع، انصاف، سماجی تحفظ اور دیگر ضروری امور کی تفصیل و وضاحت کرتا ہے۔ اس دستور کی سب سے نمایاں خصوصیت انتہائی وسیع مفہوم میں رواداری ہے۔ یہ دستور مسلم و غیر مسلم دونوں کو اس اعتبار سے یکساں حیثیت دیتا

ہے کروہ: بنے عقیدے کے مطابق قانون سے استفادے اور حصولِ انصاف کے سلسلے میں برابر ہیں۔ اسلام کے تعزیری اور دیوانی قوانین کا اطلاق غیر مسلموں پر نہیں تھا۔ وہ اپنی عبادت گاہوں میں عبادت اور مذہبی رسوم ادا کرنے میں آزاد تھے۔

رسولِ اکرمؐ نے اسلامی ریاست کے دفاع کو منظم کیا۔ اس سلسلے میں مدینے کے آس پاس بسنے والے قبائل سے دفاعی معاہدے کئے اور اس اتحاد کی بدولت اہلِ مکہ، شام، مصر اور عراق جانے والے قافلوں کو اسلامی ریاست میں سے گزر کر سفر کرنے سے روک دیا گیا۔

اسلامی نظامِ حیات میں مسجد کو کثیر المقاصد حیثیت حاصل ہے۔ مسجدِ نبوی کی تعمیر نہ صرف عبادت کے لئے بلکہ مسلمانوں کے اجتماع کے لئے ایک راست قدم تھا۔ یہ تربیت گاہ بھی تھی اور فلاحی مرکز بھی۔

بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے میثاقِ مدینہ کو بنیاد بنا کر اپنے مبلغین اور سفراء کے ذریعے مملکتوں کے سربراہوں کو اسلام کی دعوت دی۔ علاوہ ازیں زرعی اور تجارتی ترقی کے لئے بھی مناسب انتظامات کئے۔ صحابہ کرام کو شہر سے باہر مختلف مقامات پر متعین فرمایا کہ دشمنوں کی حرکات و سکنات پر نظر رکھیں۔ ریاست کے اندر غریبوں، محتاجوں، ناداروں اور لاوارثوں کی معقول کفالت کا بندوبست کیا گیا۔

ان تمام حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ مدنی زندگی اور مدنیت کے اعلیٰ اصولوں کا مرکز مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست تھی۔

تعلیماتِ نبوی

حضور اکرمؐ کی اسلامی تعلیمات کے دو حصے ہیں یعنی عقائد اور احکام۔ عقائد میں توحید و رسالت، وحی، حشر و نشر، ملائکہ، بہشت و دوزخ اور خیر و شر جیسے مسائل ہیں۔ یہ مسائل ماورائے عقل ہیں مگر خلافِ عقل نہیں۔ عقل ان کا احاطہ تو کر سکتی ہے مگر ایک حد تک ہی ان کا ادراک ہو سکتا ہے۔ ان ہی عقائد پر اسلام کا پورا ڈھانچہ کھڑا ہے اور اس کے تمام احکام انہی کے تابع ہیں۔ ان پر ایمان لانے ہی سے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے اور انکار کرنے سے کافر ہو جاتا ہے۔

عقائد کو پورے شعور کے ساتھ قبول کرنے کے بعد ہی احکام کی حکمتیں، خوبیاں اور تمام مضمرات عملی صورت میں واضح ہوتے ہیں اور ان کی معنویت سمجھ میں آجاتی ہے۔ عقائد میں جتنی شدت ہوگی، اسی انداز سے احکام کی پیروی کا جذبہ حرکت میں آئے گا اور ایک شخص کے نزدیک جتنی ان کی قدر و قیمت ہوگی اسی حد تک ایثار و سرفروشی کی کیفیت اس کے اندر پیدا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ عقائد کو تعلیماتِ نبوی کا سب سے اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔ پہلا عقیدہ توحید ہے یعنی صرف اللہ کی ذات واجب الوجود ہے۔ اس کا نہ کوئی شریک ہے نہ وہ کسی کا محتاج ہے۔ وہ اپنی ذات سے قائم ہے اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اسی نے پوری کائنات کو پیدا کیا اور اسی کے حکم سے برقرار ہے۔ وہ قادرِ مطلق، عالم الغیب اور عادلِ حقیقی ہے۔ اس نے انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے پیغمبر بھیجے اور تکمیلِ احکام کے ساتھ ساتھ رسولِ اکرمؐ پر رسالت کے سلسلے کو ختم کر دیا۔

عقیدۂ رسالت یہ ہے کہ تمام انبیاء اور رسولوں پر ایمان لانا۔ حضورؐ پر ایمان لانے کے بعد تمام عقائدِ اسلامی پر ایمان لانا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح مسلمان وحی الٰہی، فرشتوں کے وجود، الہامی کتابوں اور یومِ آخرت پر بھی ایمان لے آتا ہے۔ وہ اس بات کو دل میں بٹھا لیتا ہے کہ زندگی کا

سلسلہ صرف دنیا تک محدود نہیں رہتا بلکہ روزِ قیامت اپنے اعمال کا حساب کتاب بھی دینا ہوگا اور اعمال ہی کی بنیاد پر ہی بہشت میں جانے یا جہنم کا ایندھن بننے کی نوبت آئے گی۔

تعلیماتِ نبوی کا دوسرا حصہ احکام پر مشتمل ہے جو خود بھی دو حصّوں میں ہے۔ پہلا حصہ عبادات سے واسطہ رکھتا ہے اور دوسرا زندگی کے تمام معاملات سے۔ دونوں قسم کے احکام ہمیں قرآن و سنّت سے ملتے ہیں۔ مسلمانوں کی مقدس الہامی کتاب قرآن مجید غارِ حرا سے لے کر حضور کی مدنی زندگی تک بتدریج نازل ہوتی رہی۔ عربی میں قرآن کے معنی پڑھنے کے ہیں۔ لفظ سنت کے معنی ہیں راستہ، رواج و معمول سے مراد رسول پاکؐ کے ارشادات و افعال ہیں یا وہ کام اور باتیں جن کی آپؐ نے تلقین فرمائی۔ قرآن کے بعد سنت کو سند کا درجہ حاصل ہے اور سنت کو حدیث بھی کہتے ہیں۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جب اسلامی شرع کے قوانین کا کوئی مجموعہ ترتیب نہیں دیا گیا تھا تو حدیث شریف ہی قواعد و احکامات کا سرچشمہ تھی۔

اسلام میں عقائدِ اسلام پر ایمان لانا اور تمام احکام کی بنیادی طور پر پابندی کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد کے احکام ہوں یا دنیاوی معاملات کے احکام، دونوں صورتوں میں ہمیں قرآن و سنت سے ہی روشنی ملتی ہے جو تعلیماتِ نبوی کے اہم ماخذ ہیں اور جن پر علمائے دین نے صدیوں کے سفر میں بہت گہری نظر ڈالی ہے۔

قرآن حکیم ۱۱۴ سورتوں یعنی ابواب پر مشتمل ہے۔ کچھ سورتیں لمبی ہیں اور کچھ چھوٹی۔ انھیں تاریخی ترتیب سے قرآن میں جمع نہیں کیا گیا سوائے سورہ فاتحہ کے۔ پہلے طویل سورتیں ہیں پھر مختصر۔ سورہ فاتحہ کی سات آیات ہیں جنھیں قرآن مجید کا خلاصہ سمجھنا چاہیے۔ یہ واحد سورت ہے جسے نماز کی ہر رکعت میں پڑھنا ضروری ہے۔ تقریباً ایک تہائی قرآن مجید مکی سورتوں پر مشتمل ہے۔ مکی سورتوں میں ایمان، احساس، استدلال اور اخلاص کی تلقین ہے اور قیامت کا ذکر۔ ان سورتوں کا موضوع مکہ کے کفار تھے جو عرصے تک اسلام کے سخت مخالف رہے۔ مدنی سورتیں زیادہ تر طویل اس لئے ہیں کہ ان میں مدینے میں قائم ہونے والے معاشرے کی اجتماعی زندگی کے قوانینِ الٰہی بیان کئے گئے ہیں۔ قرآن مجید کو عہدِ رسالت میں کاتبانِ وحی نے چمڑے کے ٹکڑوں، لکڑی کے تختوں، اونٹ کے شانوں کی ہڈیوں اور کھجور کے ریشوں وغیرہ پر تحریر کیا۔ قرآن پاک کی اصلی حفاظت کا ذریعہ وہ حفاظ بھی تھے جو قرآن کی سورتوں اور

آیتوں کو اچھی طرح حفظ کر لیتے تھے۔ اس طرح حافظِ قرآن ہونے کی روایت آج تک قائم ہے۔ قرآن مجید اور حدیث شریف کے فرق کو حضورؐ نے خود ہی واضح فرما دیا ہے۔ قرآن مجید وہ کلام الٰہی ہے جو حضرت جبرئیل کے ذریعے وحی کی صورت میں آپ کے قلب پر نازل ہوتا تھا اور اس میں معمولی سی تبدیلی بھی ممکن نہ تھی، نہ ہے اور نہ ہوگی۔ حدیث شریف حضور کے اقوال و اعمال پر مشتمل ہے۔ اگرچہ یہ اقوال و اعمال بھی اللہ کی رضا کے مطابق ہوتے تھے۔ حدیث شریف صحابہ کرام سے تابعین کو زبانی منتقل ہوئی۔ مسلمانوں کی پہلی نسل نے احادیث کی چھان بین اور انھیں مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ محدثین دور دراز کے سفر کرتے تھے تاکہ وہ لوگوں سے حدیثیں سنیں جن تک وہ براہ راست پہنچی تھیں۔ احادیث کے چھے معتبر مجموعے ہیں صحیحین یعنی امام بخاری اور امام مسلم کی مدون کردہ حدیثیں، سُنن یعنی ابو داؤد، الترمذی، النسائی اور ابن ماجہ کے مدون کردہ مجموعے۔ یہ کتابیں تیسری صدی ہجری میں تالیف ہوئیں۔

تعلیماتِ نبوی میں معاملات سے تعلق رکھنے والے جو احکام ہیں وہ دو شخصوں کے تعلقات سے لے کر عائلی، مجلسی، قومی اور بین الاقوامی امور پر حاوی ہیں۔ ان احکام کی ایک تفصیل تو خطبۂ حجۃ الوداع میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ یہ سلسلہ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اس کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ مثلاً چند واضح احکام یہ ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ نہ ڈالو، فتنہ پیدا کرنا قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے، حکومت کے کاموں میں لوگوں سے مشورہ کر لیا کرو، مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، جس نے کسی مومن کو عملاً قتل کیا اس کی سزا جہنم ہے"۔

حضور پر نورؐ نے فرمایا "ایمان تحمل و فراخدلی کا نام ہے، جو شخص ظالم کو ظالم جانتے ہوئے بھی اس کا ساتھ دے گا وہ اسلام سے نکل گیا، وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جو اپنے ماتحتوں پر بری طرح افسری کرے گا۔

سیرتِ طیبہ

یہ ایک اہم تاریخی حقیقت ہے اور زندۂ جاوید معجزۂ لوح و قلم کہ جس تفصیل کے ساتھ رسولِ کریمؐ کی سوانحِ حیات، اسوۂ حسنہ اور سیرت کے حالات محفوظ کئے گئے ہیں اس طرح دنیا کے کسی بھی شخص کے محفوظ نہ کئے جا سکے۔ حضورؐ کی حیاتِ مبارکہ کا ہر واقعہ کا ایک ایک خدوخال ہمارے سامنے آتا ہے اور احکام و ہدایاتِ ربانی کی عملی شکل پیش کر دیتا ہے۔ اس اسوۂ حسنہ کے اندر کون سی ایسی خوبی ہے جو خیرِ کثیر کی ضامن نہ ہو۔ انتہائی درجے کی صداقت و امانت، و دیانت، عصمت و عفت، شجاعت و شہامت، عدل و انصاف، بے تکلفی و فیاضی، محبت و رحمت، ایثار و قربانی، ہمدردی و رواداری، بردباری و دردمندی، دلجوئی و دستگیری، تواضع و انکساری، عفو و درگزر، بے نفسی و بے نیازی، فقر و استغنا، عزم و استقلال اور ثابت قدمی و سلامت روی کی صفاتِ عالیہ کا حسین و جمیل مرقع اگر دیکھنا ہو تو حضورؐ کی سیرتِ طیبہ اس کی واحد اور لافانی مثال ہے۔ آپؐ مکارمِ اخلاق کی تمام جزئیات کا ایک مکمل پیکر تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اے محمدؐ! تم اخلاق کے بڑے درجے پر ہو۔"

حضورؐ کے تقویٰ و طہارت، رقتِ قلب، زہد و عبادت اور روحانی سوز و گداز کا یہ عالم تھا کہ یادِ الٰہی میں ریشِ مبارک اشکوں سے تربتر ہو جاتی۔ کتنی راتیں اقامت میں گزر جاتیں اور کھڑے کھڑے پاؤں سوج جاتے۔ عبادت نافلہ چھپ کر ادا کرتے اور کلامِ پاک کی بعض آیات پر اشکبار ہو جاتے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ آپ کو کلامِ پاک سنا رہے تھے۔ جب وہ اس آیت پر پہنچے "پس کیا حالت ہو گی جب ہم ایک ایک امت پر اللہ ایک ایک گواہ کھڑا کرے گا اور آپ کو تمام امتوں پر گواہ کی حیثیت سے کھڑا کیا جائے گا" حضورؐ نے فرمایا "ٹھہر جاؤ"۔ وہ ٹھہر گئے اور آنکھ اٹھا کر دیکھا تو حضورِ اکرمؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

تہذیب وشائستگی کا یہ عالم تھا کہ قہقہہ لگا کر کبھی نہ ہنستے۔ مسکرانا ہی آپ کی شفقت و رحمت کا اظہار تھا اس لئے اکثر متبسم رہتے۔ بچوں کے قریب سے گزرتے تو خود انھیں سلام کرتے، ان کے سر پر ہاتھ رکھتے، انھیں گود میں اٹھا لیتے۔ بوڑھوں کی عزت کرتے اور ان کو تکلیف دینے سے منع فرماتے۔ آپ نے فرمایا "جو بچوں پر شفقت نہیں کرتا اور بوڑھوں کو عزت نہیں دیتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" آپؐ مجلس میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے، سلام کرنے میں سبقت کرتے، مصافحہ کے لئے بیساختہ ہاتھ بڑھاتے۔ صحابہ کرام کو نام کی بجائے کنیت سے پکارتے۔ گفتگو کے دوران کسی کی بات نہ کاٹتے۔ اگر نفل نماز میں مشغول ہوتے اور کوئی شخص آجاتا تو نماز کو مختصر کر دیتے۔ اس سے ضروری باتیں کرنے کے بعد پھر نماز شروع کر دیتے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک ایک مہینہ چولہا گرم ہونے کی نوبت نہ آتی۔ حضورؐ کا کنبہ کھجور اور پانی پر گزارہ کرتا۔ مدینے تشریف لانے کے بعد مسلسل تین دن تک حضورؐ نے گیہوں کی روٹی نہیں کھائی۔ سائل کو کبھی رد نہ کرتے۔ اگر کچھ بھی دینے کو نہ ہوتا تو اس طرح عذر فرماتے گویا معافی مانگ رہے ہوں۔ کسی مفلس و مسکین کو حقیر نہ سمجھتے اور نہ اقتدار و دولت کے سبب کسی سے خوش اخلاقی سے ملتے۔ ؎

چبھتے ہوئے کانٹوں پہ بھی وہ پھولوں کی بارش کفار سے بھی نرمئ گفتار کا عالم

ارشاد باری تعالیٰ ہے "ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔" جس معبودِ حقیقی نے یہ فرمایا اسی نے ہمیں یہ درسِ حقیقت بھی دیا کہ تمہارے لئے رسول اللہؐ کی ذات میں بہترین اسوہ موجود ہے۔ اور فرمانِ ربی کے مطابق سیرت طیبہ کا ہر نقش یہی ظاہر کرتا ہے۔ آپ مریض کی عیادت کو تشریف لے جاتے، اسے تسلی دیتے۔ اگر وہ کسی چیز کی خواہش کرتا اور وہ چیز میسر نہ ہوتی تو اس کا انتظام فرماتے۔ مریض کو علاج کا مشورہ دیتے اور فرماتے "بندگانِ خدا! دوا کیا کرو، کیونکہ اللہ نے ہر مرض کی شفا مقرر کی ہے بجز بڑھاپے کے۔ آپ عزیزوں کی موت پر آبدیدہ ہو جاتے۔ صدق و امانت اور عفت و عصمت کا یہ عالم تھا کہ بعثت سے پہلے بھی یہ صفاتِ عالیہ موجود رہیں۔ کبھی جھوٹ نہ بولا۔ عرب کی جاہلانہ رسموں کے قریب نہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ کفار نے ساحر، مجنوں اور شاعر کہہ کر مخاطب کیا مگر آپ کی نیک سیرتی میں کوئی عیب نہ نکال سکے۔ اپنی تمام تر عداوت کے باوجود وہ حضورؐ کو امین و صادق اور باحیا و عصمت ہی مانتے رہے۔ واقعی حیاداری کا یہ جذبہ تھا کہ اگر کوئی بات ناگوار گزرتی تو زبان سے اس کا اظہار نہ کرتے صرف روئے مبارک پر

کراہیت کے آثار نمایاں ہوجاتے۔ اگر کسی کی کوئی ناشائستہ حرکت ناپسند ہوتی تو اس کا نام لے کر منع نہ کرتے بلکہ عام الفاظ میں ناگواری کا اظہار فرماتے۔ خود تکلیف اٹھا لیتے مگر شرم سے کسی کو اپنے کام کی زحمت نہ دیتے۔ آپ کے خادم حضرت انسؓ ابن مالک فرماتے ہیں "میں دس برس حضورؐ کی خدمت میں رہا مگر حضورؐ نے کبھی یہ نہ کہا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا یا کیوں نہ کیا"۔ اگر کوئی عذر خواہ معافی مانگنے سامنے آتا تو شرم سے گردن جھکا لیتے۔ کبھی کسی کو بددعا نہ دیتے۔ نہ دشمنوں سے انتقام لیتے۔ جو طاقت سے اسلام کو مٹانے کی کوشش کرتا، اس کے خلاف مدافعت میں پوری دلجمعی سے جنگ کرتے۔ اگر وہ صلح کے لئے ہاتھ بڑھاتا تو صلح کر لیتے۔ عدل کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ غیبت اور عیب جوئی سے روکتے۔ حضورؐ نے فرمایا "ایک دوسرے کی باتیں نہ سنا کرو"۔ روایت ہے کہ جب حضرت سعد بن ہشام بن عامرؓ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ آپ حضورؐ کے خلق عظیم کے بارے میں کچھ بتائیں تو انھوں نے جواب میں پوچھا "کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟" حضرت سعد نے کہا "بے شک پڑھتا ہوں" تو حضرت عائشہ نے فرمایا "نبیؐ کا خلق قرآن تھا"۔

انبیائے کرام میں سے ہر ایک حسنِ اخلاق کی ایک نوع سے مختص تھا مگر سرورِ دو عالمؐ کی ذاتِ اقدس میں حسنِ اخلاق اور جمالِ سیرت کی تمام خوبیاں جامعیت، کاملیت اور عملیت کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص ودیعت کی تھیں۔ پروردگارِ عالم نے حضورؐ کو تمام فضائل و برکات سے بہرہ مند فرماتے ہوئے جملہ انبیائے سابقینؑ کی سیرت کے اتباع کا حکم دیا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ تھا کہ پس آپ ان کی پیروی کریں۔ لہٰذا خصال و کمال، فضائل و شرف جو آپ سے پہلے کے انبیائے کرام میں متفرق طور پر تھے وہ تمام آپ کی ذاتِ اقدس میں جمع ہو گئے۔ حلم و سخاوتِ ابراہیم، صدق و وعدۂ اسمٰعیل، شکرِ داؤد و سلیمان، صبرِ ایوب، معجزاتِ موسیٰ، مناجات ذکریا، تقویٰ یحییٰ، دمِ عیسیٰ جیسی نعمتوں کا مرقعِ جاوید:

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

غزوات

اسلام امن و سلامتی کا مذہب اور خیر کثیر کی قدروں کا علمبردار دینِ فطرت ہے۔ قتل و غارتگری اس کی فطرت میں نہیں لیکن دشمنانِ اسلام نے شروع ہی سے مسلمانوں کو ستانا اپنا فریضہ سمجھا یہاں تک کہ مدینے میں بھی سکون سے نہیں بیٹھنے دیا۔ حضور اکرمؐ ابھی اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں مصروف تھے کہ کفارِ مکہ نے مدینے کی طرف پیش قدمی کی اور غزوہ بدر کی نوبت آئی۔ مسلمان اس جنگ کے لئے قطعی تیار نہ تھے اور تعداد میں بھی کم تھے جبکہ کفار پوری تیاری سے حملے کے لئے آئے تھے، لیکن مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی نے ان کو شکست دی۔ غزوہ بدر میں شکست کے بعد ۳ھ میں کفار کا ایک بڑا لشکر پھر مدینے پر حملہ آور ہوا جس کے سبب غزوہ احد پیش آیا۔ مگر مسلمانوں کے آگے ابتداء میں کفار کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ دشمن ہار گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ بلکہ جنگ جاری تھی اور انجام کار مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا اور رسول کریمؐ بھی کافی مجروح ہوئے۔ تاہم جنگ بغیر کسی فیصلے کے ختم ہو گئی۔

۵ھ میں قریش پھر پوری تیاری سے مسلمانوں پر فیصلہ کن جنگ کے لئے ٹوٹ پڑے تو غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب سے واسطہ پڑا۔ کفار کی حمایت میں خیبر کے یہودی تھے اور مدینے کے بنو قریظہ بھی۔ اس طرح تمام قبائل کی فوج دس ہزار سے چوبیس ہزار تھی۔ اپنے بچاؤ کے لئے مسلمانوں نے شہر کے چاروں طرف خندقیں کھودیں اس لئے اسے غزوۂ خندق کہا جاتا ہے۔ کفار نے تقریباً ایک ماہ مدینہ کا محاصرہ کیا اور ناکام ہو کر واپس چلے گئے۔ یہ بڑی کامیابی تھی جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

۶ھ کو حضورؐ چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لئے روانہ ہوئے اور اس خیال سے کہ قریش کو جنگ کا شبہ نہ ہو، احرام باندھ لئے اور ہتھیار لگانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش نے مزاحمت کی۔ حضورؐ نے ان کو سمجھایا اور معینہ مدت تک کے لئے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ

کرنے کی پیشکش کی لیکن کفار راضی نہ ہوئے اور ایک دستہ حملے کے لئے بھیج دیا جو گرفتار کر لیا گیا۔ حضورؐ نے تحمل سے کام لیتے ہوئے حضرت عثمان غنیؓ کو مصالحت کے لئے بھیجا۔ قریش نے ان کو روک لیا۔ مسلمانوں نے یہ سمجھ کر حضرت عثمانؓ قتل ہو گئے۔ اس موقع پر حضورؐ نے ببول کے درخت کی چھاؤں میں صحابہؓ سے جانبازی اور قصاص لینے کے لئے بیعت لی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اسی وجہ سے اسے بیعت رضوان کہتے ہیں۔ ادھر قریش کو صحابہ کے جوش و خروش کا علم ہوا تو وہ نرم پڑے اور سہیل بن عمر کو اپنے نمائندے کے طور پر بھیجا تاکہ صلح ہو جائے۔ حضورؐ پہلے ہی صلح کے لئے تیار تھے۔ تاریخِ اسلام کا یہ بہت ہی یادگار واقعہ ہے جس کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔

اس واقع کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے پسند فرماتے ہوئے فتح مبین قرار دیا اور بے شک، یہ صلح عین اسلامی نصب العین کے مطابق تھی۔ اس صلح نامے کی کتابت حضرت علیؓ نے فرمائی۔ شرائط یہ تھیں: (۱) مسلمان اس سال عمرہ کئے بغیر لوٹ جائیں گے۔ (۲) اگلے سال آئیں گے اور تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہیں کریں گے۔ (۳) ہتھیار لگا کر نہ آئیں گے صرف تلواریں ہوں جو نیام کے اندر رہیں۔ (۴) مکے میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں انکو آپ لوگ اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے اور جو مسلمان مکے میں رہ جانا چاہے اسے نہ روکیں گے۔ (۵) کافروں یا مسلمانوں میں سے اگر کوئی مدینے چلا جائے یا وہاں پناہ لینا چاہے تو اسے واپس کر دیا جائے گا اور اگر کوئی مسلمان مکہ چلا آئے تو اسے واپس نہیں کیا جائیگا۔ (۶) قبائلِ عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں حلیفانہ معاہدہ کریں۔ (۷) معاہدے کی مدت دس سال ہوگی۔ اس عرصے میں فریقین ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔

جب یہ شرائط طے کی جا رہی تھیں عین اسی وقت سہیل کے بیٹے ابو جندل جو مسلمان ہو چکے تھے اور کفارِ مکہ کی قید میں تھے، کسی طرح رسول اکرمؐ کے پاس پہنچ گئے اور ساتھ چلنے کی درخواست کی۔ سہیل نے کہا کہ شرائط کے مطابق آپ اسے نہیں لے جا سکتے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ابھی معاہدہ مکمل نہیں ہوا ہے، مگر وہ نہ مانا اور کہنے لگا کہ اگر آپ شرائطِ صلح کو اسی وقت سے نافذ نہیں سمجھتے تو ہم صلح کے لئے تیار نہیں۔ مجبوراً آپ نے ابو جندل کو تسلی دے کر سہیل کے حوالے کر دیا۔ تمام مسلمان ابو جندل کی فریاد سن کر تڑپ اٹھے۔ وہ بہت ہی دردانگیز منظر تھا اور مسلمانوں کے لئے بہت صبر آزما مرحلہ تھا، کیوں کہ ذرا سی دیر میں کشت و خون کا بازار گرم ہو سکتا تھا، مگر رسولِ پاکؐ نے معاہدے کی پاسداری کی اور مسلمان جو آپ کے ساتھ تھے، صبر و ضبط،

اطاعت و تابعداری، احترام و عقیدت اور امن و آشتی کی تصویر بنے بیٹھے رہے۔ کیا مجال جو کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نکلا ہو۔ اتنی اطاعت شعاری کی مثال تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔

صلح حدیبیہ کے بعد پیغمبرِ اسلامؐ نے قیصرِ روم، شاہِ ایران، عزیزِ مصر، فرمانروائے حبش، رؤسائے یمامہ، حاکمِ بحرین، بصرہ کے والی اور کئی دوسری سربرآوردہ شخصیتوں کے پاس اپنے قاصد بھیجے اور خطوط کے ذریعے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ بیشتر نے جذبۂ خیر سگالی کا اظہار کیا۔ حبشہ کے فرمانروا نجاشی نے اسلام قبول کر لیا مگر سرحدِ شام کے والی حارث غسانی نے قاصد سے اچھا سلوک نہ کیا اور بصرہ کے والی نے آپؐ کے قاصد کو قتل کر دیا۔ یہی واقعہ سلطنتِ روم اور اسلامی ریاست کے مابین جنگ کا سبب بنا۔ شاہ ایران یعنی خسرو پرویز بھی نامۂ مبارک دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ آخر عرب اور ایران کی جنگ رونما ہوئی۔

صلح حدیبیہ نے قریش کی طرف سے مسلمانوں کو مطمئن کر دیا تھا مگر خیبر کے یہود جو طوفان اٹھائے ہوئے تھے اور دیگر قبائل کے ساتھ حملہ آور ہونا چاہتے تھے، ان کی سرکوبی ضروری تھی۔ اس وقت خیبر میں ان کے چھ قلعے اور بیس ہزار سپاہی تھے۔ مسلمانوں نے ایک ایک کر کے تمام قلعے فتح کر لئے اور سب سے مضبوط آخری قلعہ "قموص" حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فتح کیا۔

فتح مکہ

صلح حدیبیہ نے عرب قبائل کو یہ آزادی دے رکھی تھی کہ وہ قریش یا مسلمانوں کے ساتھ اپنی صوابدید کے مطابق حلیفانہ تعلقات قائم کرسکتے ہیں۔ چنانچہ بنو بکر نے قریش اور بنو خزاعہ نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کرلئے۔ چونکہ دونوں قبائل کے درمیان عرصے سے عداوت چلی آرہی تھی اور قبیلۂ بنو بکر کو قریش کی حمایت حاصل ہوگئی تھی اس لئے انھوں نے بنو خزاعہ پر حملہ کردیا اور عین حرم میں ان کا قتل عام کیا۔ جب یہ المناک اطلاع رسول اکرمؐ کو ہوئی تو آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ بنو خزاعہ کے وفد کو جو فریاد لے کر مدینہ پہنچا تھا، آپ نے تسلی دی اور اپنا ایک قاصد قریش کے پاس بھیجا کہ تین شرائط ہیں۔ ان میں سے ایک قبول کرلو۔ مقتولین کا خون بہا ادا کرو، یا بنو بکر کی حمایت چھوڑ دو یا اعلان کرو کہ صلح حدیبیہ باقی نہیں رہی۔

قریش نے جوش میں آکر کہہ دیا کہ ہمیں تیسری شرط منظور ہے، مگر قاصد کی واپسی کے بعد بڑے فکرمند ہوئے اور ابوسفیان کو تجدید معاہدہ کے لئے مدینے بھیجا لیکن وہ حضورؐ کے سامنے آنے کی ہمت نہ کرسکے اور انھوں نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کو درمیان میں لانا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

آنحضرتؐ نے دس ہزار مجاہدین کا لشکر مکہ کی پیش قدمی کے لئے مکمل فرمایا۔ ادھر قریش کو اطلاع ملی تو انھوں نے صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے ابوسفیان اور چند دوسرے لوگوں کو بھیجا۔ ابوسفیان پر حضرت عباسؓ کی نظر پڑی اور وہ گرفتار کرلئے گئے۔ حضرت عمرؓ نے قتل کرنے کی اجازت طلب کی، مگر رحمت عالمؐ نے اجازت نہ دی اور ابوسفیان کو معاف کردیا۔ دوسری صبح حضورؐ نے لشکر اسلام کو متعدد دستوں میں تقسیم کرکے ہر دستے کا ایک امیر مقرر فرمایا اور مختلف راہوں سے مکہ میں داخل ہونے کا حکم دیا تاکہ قریش مزاحمت نہ کرسکیں اور خوں ریزی کے بغیر مکہ پر قبضہ ہو جائے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ صرف ایک مقام پر عکرمہ بن ابوجہل اور اس کی جماعت نے مسلمانوں پر تیر چلائے۔

مسلمانوں کا یہ دستہ حضرت خالدؓ کے زیرِ کمان تھا۔ اس حملے میں تین مسلمان شہید ہوئے۔ حضرت خالدؓ کے جوابی حملے سے دشمن کے ۱۳ افراد موت کے گھاٹ اتر گئے۔ جب رسول پاکؐ کو خبر ہوئی تو افسوس ہوا اور حضرت خالدؓ کو فوراً جنگ روکنے کا حکم بھیجا۔ اس کے شہر میں داخل ہوتے ہی آپ نے اعلان کر دیا کہ جو شخص اسلحہ رکھ دے، حرم میں پناہ لے لے، ابو سفیان کے گھر چلا جائے یا اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ محفوظ رہے گا۔ اس طرح تمام اہل مکہ کی عزت، آبرو اور جان و مال کا تحفظ کرتے ہوئے آپ حرم کعبہ میں تشریف لے گئے، اسے بتوں سے پاک کیا اور یہ خطبہ دیا۔ "اللہ ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ اس نے اپنے عاجز بندے کی مدد کی اور اسے غلبہ بخشا۔ ہاں، آج تمام مفاخر، انتقامات اور خون بہائے قدیم میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹا دیا۔ تمام انسان آدمؑ کی نسل سے ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔" اس کے بعد کلام پاک کی یہ آیت تلاوت کی "لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں بزرگ تر وہی ہے جو پرہیزگار ہے۔"

فتح مکہ اور رسول اکرمؐ کے انسانیت نواز خطبۂ روح پرور کے بعد جب آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو سرداران قریش سامنے نظر آئے۔ ان میں وہ بھی تھے جنھوں نے مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھائے تھے، جو اسلام کا نام و نشان مٹانے کے لئے بڑھ بڑھ کر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوتے تھے۔ آپؐ نے ان سے پوچھا "تمہیں معلوم ہے میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟" وہ بول اٹھے "تو شریف بھائی اور شریف برادر زادہ ہے۔" رحمت عالمؐ نے فرمایا "تم پر کوئی مواخذہ نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔" اس حسن سلوک اور فیاضی کا یہ اثر ہوا کہ غرور و تکبر سے اکڑے ہوئے سر اللہ تعالیٰ کے حضور جھک گئے اور کفار مکہ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے۔

اہل عرب کی مذہبی اور سیاسی حالت یکسر بدل گئی۔ فتح مکہ کے بعد اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا، مگر دو ممتاز اور جنگجو قبیلے ہوازن اور ثقیف منحرف رہے اور جنگ کی تیاریاں کرکے مکہ مکرمہ کی طرف بڑھے۔ جب حضورؐ کو خبر ہوئی تو بارہ ہزار مجاہدین کے ساتھ مقابلے

کے لئے تشریف لے گئے۔ حنین کے مقام پر معرکہ آرائی ہوئی۔ پہلے تو مسلمان اپنے دشمنوں کی تیر اندازی سے گھبرا کر منتشر ہونے لگے۔ پھر جوش ایمانی نے حوصلہ دیا اور ایسی جنگ لڑی کہ دشمنان اسلام میدان چھوڑ کر طائف کی طرف بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور شکست دے کر طائف کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ بیس دن کے محاصرے کا نتیجہ یہ نکلنے والا تھا کہ قلعہ فتح ہو جاتا لیکن حضور ﷺ نے محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا اور مدینہ واپس آ گئے۔ اس احسان مندانہ خوش خلقی کا اثر یہ ہوا کہ بنو ثقیف، اور بنو ہوازن کے وفد نے حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اس طرح مکہ اور طائف کی درمیانی وادیاں بھی نورِ اسلام سے جگمگانے لگیں۔

غزوۂ حنین کے دس ماہ بعد رجب ۹ھ میں حضور ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ کا آخری غزوہ فرمایا جسے غزوہ تبوک کہتے ہیں۔ فتح مکہ سے پہلے اور صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کا حج پیغام لے کر بصرہ کے والی کی عملداری میں بھیجا گیا تھا اس کی نافرمانی کرتے ہوئے قاصد کو شہید کر دیا گیا تھا اور حضور ﷺ نے ریاست کے خلاف ایک فوج بھیجی تھی جس نے موتہ کے مقام پر دشمنوں سے جنگ کی تھی۔ اس جنگ میں چونکہ دشمنوں کی فوج ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ جبکہ مجاہدین صرف تین ہزار تھے اس لئے یکے بعد دیگرے حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر طیار اور حضرت عبداللہ ابن رواحہ جیسے سالار شہید ہو گئے۔ تب حضرت خالد بن ولید نے علم سنبھالا اور جنگی بصیرت سے کام لے کر باقی فوج کو مدینہ واپس لے آئے۔

فتح مکہ کے بعد مسلسل خبریں مل رہی تھیں کہ قیصرِ روم ہرقل نے چالیس ہزار فوج اپنے والیوں کے پاس بھیجی ہے کہ مدینہ پر حملہ کر دیں۔ غزوہ حنین کے بعد حضور ﷺ نے بھی دفاعی جنگ کے لئے تیس ہزار مجاہدین کا لشکر تیار فرمایا اور اس لشکر کی قیادت فرماتے ہوئے تبوک تک گئے جو سرحدِ شام پر واقع تھا، مگر جنگ نہ ہوئی۔ رومی خوف زدہ ہو کر آگے نہ بڑھے اس لئے سرکارِ مدینہ ﷺ آس پاس کے حکمرانوں کو مطیع بنا کر مدینے واپس تشریف لے آئے۔ چونکہ لشکرِ اسلام قحط کے زمانے میں ترتیب دیا گیا تھا اس لئے اسے جیش العسرت کہا گیا۔

حجۃ الوداع

سنہ ۱۰ھ میں جبکہ سارے عرب میں اسلام پھیل چکا تھا اور اسلام کی تبلیغ کا دائرہ آس پاس کے علاقوں تک وسیع ہو گیا تھا تو سرورِ دو عالمؐ نے حج کا ارادہ فرمایا اور مدینہ منورہ میں اعلانِ عام کرا دیا کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں حج کرنے مکہ مکرمہ جائیں تاکہ وہاں ایک بہت بڑے اجتماع میں شریعتِ اسلامیہ کے اساسی اصول بیان کر دیے جائیں، ممکن ہے کہ اس کے بعد پھر ملنے کا موقع حاصل نہ ہو۔

اس اعلان کے مطابق مکہ میں مسلمانوں کا ایک سیلِ بیکراں امنڈ آیا۔ حضور اکرمؐ کے ساتھ ازواجِ مطہرات اور آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ بھی تھیں۔ ۹ ذی الحجہ کو نمازِ فجر کے بعد آپ عرفات تشریف لے گئے اور ناقہ پر سوار ہو کر وہ معروف خطبہ دیا جو رہتی دنیا تک منشورِ انسانیت کہلانے کا مستحق رہے گا۔ اس عہد آفریں اور تاریخ ساز خطبے میں آپ نے فرمایا:

"لوگو! میں خیال کرتا ہوں کہ میں اور تم پھر کبھی اس مجلس میں اکٹھے نہیں ہوں گے۔ بے شک تمہارا اللہ ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں! عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔ ہاں، جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ اللہ نے تمہارا جاہلیت کے اس فخر کو مٹا دیا ہے جو آباؤ اجداد پر کیا جاتا تھا۔ اللہ سے ڈرنے والا مومن ہے اور اس کا نافرمان شقی ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ ہر مسلمان ایک دوسرے کا بھائی ہے۔ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری ناموس ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں جیسا اس مہینے میں آج کا دن اس شہر میں محترم ہے۔ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔ غلاموں کے ساتھ برابر کا سلوک کرو، جو خود کھاؤ انہیں بھی کھلاؤ، جو خود پہنو انہیں بھی پہناؤ۔ جاہلیت کے تمام خون باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلا میں اپنے خاندان کے ابنِ ربیعہ کا خون باطل کرتا ہوں۔ اسی طرح تمام سود

باطل کر دیے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے عباس ابن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔

عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ عورتوں کے لئے اپنے شوہروں کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کچھ لینا جائز نہیں۔ قرض ادا کیا جائے۔ ادھار لی ہوئی چیز واپس کی جائے اور عطیہ لوٹایا جائے۔ اللہ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا۔ اب کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ مجرم اپنے جرم کا خود ذمے دار ہے۔ باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں۔ لوگو! میرے بعد نہ کوئی پیغمبر آئے گا نہ کوئی جدید امت پیدا ہوگی۔ تمہیں اللہ کے آگے حاضر ہونا ہے وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔ خوب سن لو، اپنے اللہ کی عبادت کرو پنجگانہ نماز ادا کرتے رہو، ماہ رمضان کے روزے رکھو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ خوش دلی سے دو۔ حج ادا کرو اور میرے احکام کی پیروی کرو۔ اگر کٹی ہوئی ناک کا کوئی حبشی بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو اللہ کی کتاب کے مطابق لے کر چلے تو اس کی اطاعت کرو۔ میں تم میں ایک چیز چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم نے اسے مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے وہ ہے قرآن مجید۔"

خطبہ دینے کے بعد حضور اکرمؐ نے اجتماع کثیر سے سوال کیا۔ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میرے متعلق تم سے پوچھے گا تو کیا جواب دو گے؟ صحابہ نے بیک زبان عرض کیا "ہم کہیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔" حضورؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر فرمایا "اے اللہ! تو گواہ رہنا۔" اس طرح آپ نے تین بار سوال کیا اور صحابہ نے جواب دیا۔ عین اسی وقت آپ پر یہ آیت نازل ہوئی "آج ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔"

اس موقع پر حاضرین کی تعداد تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی۔ دوسرے دن جمرہ پہنچ کر رمی جمار کیا اور فرمایا: مذہب میں غلو اور مبالغے سے بچو۔ تم سے پہلے کی قومیں اسی وجہ سے برباد ہوئیں۔ پھر فرمایا کہ حج کے مسائل سیکھو۔ میں نہیں جانتا، شاید اس کے بعد مجھے حج کی نوبت آئے۔ منیٰ کے میدان میں ایک اور خطبہ دیا جس میں فرائض یاد دلائے۔ مسلمانوں کے جان و مال کی قدر و قیمت بتائی اور آخر میں فرمایا۔ جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو پہنچا دیں جو موجود نہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ ان باتوں کو زیادہ یاد رکھنے اور حفاظت کرنے والے ہوں جنھیں یہ باتیں بتائی جائیں۔

۱۴ ذی الحجہ کو بعد نماز فجر حضورؐ نے مسلمانوں کو الوداع کہا اور مدینہ منورہ کی طرف کوچ فرمایا اور اپنا زیادہ وقت عبادت میں گزارنے لگے۔ ایک دن شہدائے احد کی قبروں پر تشریف

لے گئے اور ان سے اس طرح رخصت ہوئے جیسے ایک مرنے والا اپنے عزیزوں سے الوداع کہتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے خطبہ دیا "مجھے اس کا خوف نہیں کہ میرے بعد تم شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے البتہ اس بات کا ڈر ہے کہ دنیا میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ اس کے لئے آپس میں کشت و خون نہ کرو اور اس طرح ہلاک ہو جاؤ گے جس طرح پچھلی قومیں ہلاک ہوئیں۔

۱۸ یا ۱۹ صفر ۱۱ ہجری کو آپ جنت البقیع تشریف لے گئے اور واپس آ کر علیل ہوئے۔ جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی مسجد میں نماز ادا فرماتے رہے۔ جب نقاہت بہت بڑھ گئی تو حضرت ابو بکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ وفات سے چار دن پہلے طبیعت کو ذرا سکون ہوا تو غسل فرما کر حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے سہارے مسجد نبوی میں تشریف لے گئے۔ ظہر کا وقت تھا۔ حضرت ابو بکرؓ نماز پڑھا رہے تھے، آپ کی آہٹ پا کر پیچھے ہٹے، آپ نے اشارے سے روکا اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد وہ خطبہ دیا جو آپ کا آخری خطبہ تھا۔ آپ نے فرمایا:

" سب سے زیادہ جس کی دولت و صحبت کا ممنون ہوں، وہ ابو بکرؓ ہیں۔ اگر دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے دوست بناتا تو ابو بکرؓ کو بناتا، لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لئے کافی ہے۔ ہاں! تم سے پہلے کی قوموں نے اپنے انبیاء اور اولیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔ دیکھو تم ایسا نہ کرنا۔ میں تم کو منع کرتا ہوں۔ میں انصار کے بارے میں تم کو وصیت کرتا ہوں۔ عام مسلمان بڑھتے جائیں گے مگر انصار اس طرح کم ہو کر رہ جائیں گے جس طرح آٹے میں نمک۔ وہ اپنے فرض ادا کر چکے۔ اب تمہیں اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ جو تمہارے نفع و نقصان کا ضامن ہو اسے چاہیے کہ ان میں سے جو نیکو کار ہوں ان کو قبول کرے اور جن سے خطا سرزد ہو ان کو معاف کر دے "

خطبے کے بعد حضورؐ حجرۂ عائشہؓ میں واپس تشریف لائے اور ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری رکھتے ہوئے کہ اللہ ہی بڑا رفیق ہے، آفتابِ رحمت نے رحلت فرمائی۔

حضرت ابو بکرؓ کا دورِ خلافت

تاریخِ اسلام کا انتہائی نازک دور وہ تھا جب حضور اکرمؐ نے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ اس کے بعد خلافتِ راشدہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پہلے خلیفہ کی ذمہ داری سنبھالتے ہی مسلمانوں سے واضح الفاظ میں کہا "لوگو! میں تمہارا امیر بنایا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو، اگر میں بھٹک جاؤں تو مجھے راہِ راست پر کردو۔ یاد رکھو صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ تم میں سے ضعیف اس وقت تک میرے نزدیک قوی ہیں جب تک میں ان کا حق نہ دلوا دوں اور قوی، ضعیف ہیں جب تک دوسروں کا حق ان سے نہ دلوا دوں۔ یاد رکھو، جو قوم جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دیتی ہے اسے اللہ ذلیل وخوار کردیتا ہے اور جس قوم میں بدکاری پھیل جاتی ہے وہ بلائے عام میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ جب تک میں رسول اللہؐ کی اطاعت کرتا رہوں تم میری اطاعت کرتے رہنا اور جب میں (عیاذاً باللہ) ان کے حکم کی نافرمانی کرنے لگوں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں رہے گی۔"

حضرت صدیق اکبرؓ نے ۱۱ ہجری سے ۱۳ ہجری تک خلافتِ راشدہ کے فرائض انجام دیے۔ اس وقت کئی قسم کی دشواریاں تھیں لیکن آپ نے بڑی ثابت قدمی اور دانشمندی سے ہر دشواری پر قابو پایا۔ ظہورِ اسلام سے پہلے لوگ کئی قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اسلام نے ان کو ایک مرکز پر جمع کیا اور اپنے مخصوص احکام کے تابع بنایا۔ چونکہ یہ بات قبائلی فطرت کے خلاف تھی اس لئے ان کے اندر باغیانہ رجحانات پیدا ہوئے۔ بعض قبائل مغلوب ہو کر ایمان لے آئے تھے مگر روحِ اسلام سے ناواقف تھے اس لئے وہ مرتد ہوگئے۔ بعض قبائل پر زکوٰۃ کی ادائیگی گراں تھی چنانچہ انھوں نے تنسیخِ زکوٰۃ کا مطالبہ کیا اور مطالبات منوانے کے لئے مدینہ کی طرف قدم بڑھائے جس سے مرکز کو خطرہ پیدا ہوا۔

ان نامساعد حالات میں خلیفۂ اول نے لشکرِ اسامہ کی روانگی کا حکم دیا۔ صحابہ نے خلافِ مصلحت

سمجھتے ہوئے اسے روک لینے کی درخواست کی مگر آپ اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ لشکر کی روانگی سے ایک طرف تو رومیوں کی پیش قدمی رک گئی۔ دوسری طرف باغیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ آپ نے مدینہ منورہ کے دفاع کا معقول انتظام کیا۔ اہم مقامات پر حفاظتی دستے متعین کئے۔ ایک نئی فوج مخالفین و منکرین زکوٰۃ کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئی۔ آپ نے واضح اعلان کیا "میں ہر اس شخص کے خلاف جہاد کروں گا جو ایک بکری کا بچہ بھی دینے سے انکار کرے گا جو وہ حضور کے زمانے میں بطور زکوٰۃ دیا کرتا تھا۔ آپ نے باطل مدعیانِ نبوت کا بھی خاتمہ کیا۔ فوج کو گیارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر دستے کا ایک امیر مقرر کیا اور غیر معمولی بصیرت سے کام لے کر ان کو اسلام دشمنوں کے خلاف استعمال کیا۔ ہر قدم پر کامیابی نے لشکرِ حق کے قدم چومے۔ فتوحات بھی ہوئیں اور اسلامی ریاست میں توسیع بھی یعنی عراق اور کئی دوسرے علاقے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا سلسلۂ نسب چھٹی پشت میں حضورِ اکرم ﷺ سے ملتا ہے۔ آپ حضور ﷺ کے ہم عمر اور بچپن کے ساتھی تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی آپ کا دامن عرب کی عام برائیوں سے پاک رہا کیونکہ سلیم الطبع اور پاکیزہ خصلت تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی سیرت سے اچھی طرح واقف تھے۔ جب حضور ﷺ نے دعوتِ اسلام دی تو مردوں میں سب سے پہلے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے بلا چون و چرا قبول کر لیا اور ایمان لے آئے۔ مسلمان ہونے کے بعد آپ نے جان و مال اور تن من سب حضور ﷺ پر قربان کر دیا اور کبھی جدا نہ ہوئے۔ آپ کی تبلیغ سے کئی مقتدر حضرات مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان غلاموں کو اپنے مالِ تجارت سے خرید کر آزاد کیا جو قبولِ اسلام کے بعد اپنے مشرک آقاؤں کے ظلم و جور کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ ۹ھ میں حضور ﷺ نے آپ کو امیر الحج بنا کر مکہ بھیجا۔ حضور ﷺ نے اپنی علالت کے آخری دنوں میں مسجدِ نبوی کی امامت آپ کے سپرد فرمائی اور وصال سے چار دن پہلے ارشاد ہوا "سب سے زیادہ جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ رفیقِ نبوت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اخلاقِ نبوی کی مجسم تصویر اور اسلامی تعلیمات کا پیکر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دینی بصیرت اور استقامت عطا فرمائی تھی۔ حق و باطل کے سلسلے میں آپ نے اپنے عہدِ خلافت میں جو فیصلہ دیا وہ برحق ثابت ہوا۔ خصوصاً ایسے دنوں میں جبکہ پورا عرب کفر و شرک کی زد میں تھا۔ طرح طرح کے غیر اسلامی فتنے سر اٹھا رہے تھے اور اسلام دشمن طاقتیں گھات میں لگی ہوئی تھیں، آپ نے بڑی جرأت مندی سے ہر قسم کے حالات پر قابو پایا اور کبھی اپنے عزم و استقلال میں کمی نہ آنے دی۔ آپ کے جذبۂ ایمانی اور شعورِ جہانبانی نے مدینہ کی نوزائیدہ اسلامی حکومت کو نہ صرف قائم

رکھا بلکہ قلیل عرصے میں اتنا مستحکم اور مضبوط کر دیا کہ دنیا کی دو عظیم مملکتوں سے ٹکر لے کر انھیں پسپا کر دیا۔

آپ کے دورِ خلافت کا ایک عظیم الشان کارنامہ قرآنِ حکیم کو جمع کرنا ہے۔ حالانکہ حضورؐ نے اپنی حیاتِ مبارکہ ہی میں کلامِ ربانی کو مرتب کر دیا تھا اور اسی ترتیب سے لوگوں نے حفظ بھی کر لیا تھا پھر بھی ضرورت تھی کہ اسے کتابی شکل دے کر اس کا ایک معیاری نسخہ قلمبند کرایا جائے۔ یمامہ کی جنگ میں چونکہ حفاظِ قرآن کی بڑی تعداد شہید ہو گئی تھی اس لئے حضرت عمر فاروقؓ نے آپ کو مشورہ دیا کہ اولین فرصت میں یہ کام انجام دیا جائے کہ جو کاتبانِ وحی رہ چکے ہیں یعنی حضرت زید بن ثابتؓ وہ کلام مجید کے مختلف لکھے ہوئے اجزا کو یکجا کریں اور حفاظ کی مدد سے اسے کتابی شکل دیں۔ اس سلسلے میں اصحابِ رسولؐ سے بھی مشورہ لے لیا گیا تھا اور یہ ایسا نیک کام تھا جس کا ہونا وقت کی اہم ترین ضرورت کو پورا کرنے کے مصداق ثابت ہوا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ذاتی کردار ایک بندۂ مومن کا اعلیٰ و ارفع کردار تھا۔ رقتِ قلبی، کارِ خیر میں پیش روی، پاکبازی، غمگساری، ہمدردی اور ثابت قدمی کے ساتھ آپ اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے عمر بھر کوشاں رہے۔ بہت معمولی اور موٹا لباس پہنتے اور تمام معمولات میں سادگی اور سلامت روی سے کام لیتے۔ آپ نے اسلامی ریاست کو ہر لحاظ سے فلاحی و رفاہی بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

حضرت عمر فاروقؓ کا دورِ خلافت

حضرت ابوبکرؓ کی رحلت کے بعد حضرت عمر فاروقؓ ۱۳ھ میں مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے اور ۲۳ھ تک اپنی تمام تر ذمہ داریاں بطریقِ احسن ادا کیں۔ قبولِ اسلام کے بعد حضرت عمرؓ شمعِ رسالت کا پروانہ بن گئے۔ مسلمانوں کی حمایت اور کفار سے جنگ میں پیش پیش رہے۔ دوسرے مسلمانوں کی طرح کفار کے ظلم بھی سہے۔ پھر جب حضورؐ کی طرف سے ہجرت کا حکم ملا تو مدینہ چلے گئے اور تمام بڑے معرکوں میں حضورؐ کے ساتھ رہے۔ جیش العسرۃ کی تیاری میں اپنا نصف مال خدمتِ اسلام کے لئے پیش کر دیا۔ آپ کی یہی فداکاری و جاں نثاری تھی جس کی بنا پر آپ کو حضورؐ کا خاص تقرب حاصل رہا۔ حضورؐ نے بھی آپ پر اعتماد کا اظہار کیا۔ حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ بنے تو آپ ان کے مشیر اور دستِ راست رہے۔ تمام صحابہؓ کو آپ کی بصیرت، فراست اور صداقت پر اعتماد تھا۔ اسی لئے انھوں نے بلا اختلاف آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور تاحیات آپ کے معاون رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب فاروقِ اعظمؓ داخلی الجھنوں سے آزاد رہ کر پوری توجہ ان عظیم جنگوں کی طرف مبذول کر سکے جو اسلامی ریاست کے دونوں جانب ایرانیوں اور رومیوں سے ہو رہی تھیں۔ آپ کی رہنمائی میں ان جنگوں کا نتیجہ ایسی شاندار فتوحات کی صورت میں سامنے آیا جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

عہدِ فاروقی میں خلافت کا دائرہ غیر معمولی حد تک وسیع ہو گیا۔ مصر سے لے کر مکران و خراسان تک، اور آرمینیہ سے خلیج فارس تک تمام علاقے اسلامی ریاست میں آ گئے۔ آپ نے فتوحات کی وسعت کے ساتھ ساتھ نظامِ خلافت کو بھی ترقی دی اور اس قابل بنایا کہ ایک بڑی مملکت کا بار اٹھا سکے، اسے اس خوبی سے چلا سکے کہ کوئی نقص نہ رہے اور شورش رونما نہ ہو۔ کسی کے حقوق پامال نہ ہوں اور جرائم ناقابلِ تصور حد تک کم ہو جائیں۔ ہر طرف امن و امان قائم ہو، صنعت، تجارت اور زراعت کو ہمہ گیر فروغ حاصل ہو۔ مفتوح اقوام کی صرف سیاسی نہیں بلکہ تہذیبی، تمدنی، اخلاقی اور مجلسی حالت تک بدل جائے۔ وہ رنگ و نسل کا امتیاز نہ

مٹاکر ایک قوم بن جائیں۔

خلیفۂ دوم کی خلافت مجلسِ شوریٰ کی بدولت شورائی نظام پر قائم تھی اور آپ اپنی حیثیت کو ایک امین سے زیادہ نہ سمجھتے تھے۔ آپ نے فرمایا: "تمھارے مال میں میرا حق صرف اتنا ہے جتنا یتیم کے مال میں متولی کا ہوتا ہے۔ اگر میں دولت مند ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا اور اگر ضرورت مند ہوا تو کھانے کے بقدر لے لوں گا۔ میری حیثیت مسلمانوں کے درمیان صرف ایک فرد کی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میری خواہشات کی پیروی کرو۔"

آپ تمام امور مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے طے کرتے تھے۔ مجلسِ شوریٰ ہی بڑے بڑے عہدیداروں کا تقرر کرتی تھی۔ ہر ایک سے عہد لیا جاتا کہ وہ باریک کپڑے نہیں پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا، ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا، دروازے پر دربان نہیں رکھے گا، اہل حاجت کے لئے ہمیشہ اس کا دروازہ کھلا رہے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ فاروقی دورِ خلافت، عدل و انصاف، اخوت و مساوات، طاقت و احتساب اور ہمہ گیر ترقی و خوش حالی کا آئینہ دار تھا۔

حضرت عمرؓ کی پوری زندگی اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ تھی۔ خشیتِ الٰہی اور ذاتِ نبوی سے والہانہ محبت کے تحت اتباعِ سنّت میں پیش پیش تھے اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے انتہائی تنگی میں رہنا معمولی بات نہ تھی۔ موٹا پیوند لگا لباس، سونے کے لئے فرشِ خاک۔ زہد و تقویٰ، سادگی و شرافت اور شجاعت و مردانگی کی مجسم تصویر تھے۔

انتظامی لحاظ سے خلافتِ فاروقی بڑے بڑے صوبوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ہر صوبے کا والی یا گورنر، کاتب یعنی سکریٹری، کاتبِ دیوان یعنی ملٹری سکریٹری، صاحبِ الخراج، صاحب احداث، صاحب بیت المال اور انصاف کے لئے قاضی ہوتے تھے۔ صوبوں کی انتظامی تقسیم کے لئے اضلاع اور اضلاع بہت سے پرگنوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر ضلع میں ایک عامل، ایک افسرِ خزانہ اور ایک قاضی ہوتا تھا۔ اسی طرح ہر پرگنہ کا تحصیلدار اور اس کا عملہ مقرر تھا۔ اسلامی مملکت کی دفاعی ضرورتوں کے لئے فوج کا نظام بہت اعلیٰ تھا۔ آپ نے تمام مسلمانوں کو مجاہد قرار دے کر ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ باقاعدہ فوج اور ایسی جمعیت مجاہدین جسے ضرورت کے وقت طلب کیا جا سکے۔ ان دونوں قسموں کے مجاہدین کے نام کا اندراج باقاعدہ رجسٹروں میں ہوتا تھا اور ان کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ مجاہدین کے زیر کفالت بیوی بچوں اور غلاموں کے وظیفے بھی مقرر کیے گئے تھے۔ تنخواہ کے علاوہ ہر مجاہد کو معونتہ یعنی بھتہ

بھی ملتا تھا اور وردی بھی۔ ہر فوجی یونٹ کے ساتھ ایک افسر خزانہ، ایک قاضی اور طبیب و جراح ہوتے تھے۔ فوج میں گھوڑ سوار، شتر سوار اور پیدل سپاہی تھے۔ قلعہ شکن آلات اور ہتھیاروں کی فراوانی تھی۔ اہم فوجی چھاؤنیاں کوفہ، بصرہ، موصل اور دمشق جیسے بڑے بڑے شہروں میں تھیں۔ کوئی حکومت بھی ٹیکسوں کے بغیر نہیں چل سکتی۔ حضرت عمرؓ نے محکمہ خراج کو باضابطہ بنایا۔ خصوصاً عشر کا نظام اور غیر مسلموں سے معقول جزیہ وصول کرنے کا انتظام دورِ فاروقی میں احسن طریقے پر ہوا۔

عدالت کو انتظامیہ سے الگ رکھا گیا تھا۔ قاضی کا عہدہ بہت اہم تھا۔ اس پر متقی، عادل، دینی علوم جاننے والے ذہین شخص کا تقرر ہوتا تھا۔ قاضیوں کی تنخواہیں زیادہ رکھی گئی تھیں تاکہ رشوت پر مائل نہ ہوں۔ فیصلے قرآن و سنت کی روشنی میں ہوں۔ ہر ایک کا سخت احتساب ہوتا تھا۔ خلیفہ کی ذات بھی اس سے مبرّا نہ تھی۔ محکمۂ احتساب کے سربراہ کو محتسب کہتے تھے جو حفظانِ صحت، پیمانہ و میزان کی جانچ پڑتال، چور بازاری کی روک تھام اور تمام اہلکاروں کی نظر داری کرتا تھا۔ محکمۂ احتساب کے ساتھ ساتھ محکمۂ احداث یعنی پولیس کا محکمہ بھی وسیع تر تھا۔ بعض علاقوں میں فوج بھی یہ خدمت انجام دیتی تھی۔

ذمی رعایا اور غلاموں کے ساتھ عادلانہ سلوک ہوتا تھا اور ان کو تمام بنیادی حقوق حاصل تھے۔ دورِ فاروقی میں مذہب کی بنیادوں پر عالمگیر قومیت کا تصور عملی صورت میں سامنے آیا۔ حضرت عمرؓ نے دینی علوم کی ترویج و ترقی اور تبلیغِ اسلام پر بھی خصوصی توجہ دی۔ آپ بذاتِ خود لوگوں کی خبر گیری کے لئے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے۔ اپنے دروازے پر کبھی دربان نہ رکھا۔ مسجد کے صحن کو تختِ خلافت بنایا ہوا تھا جہاں ہر کس و ناکس آپ سے مل سکتا تھا۔ عدل کے معاملے میں آپ نے اپنے بیٹے کی بھی رعایت نہ رکھی اور ایک جرم میں اسے کوڑے لگوائے۔

الغرض حضرت فاروقِ اعظمؓ کا دورِ خلافت تاریخِ اسلام اور تاریخِ عالم کا ایک مثالی دور ثابت ہوا۔

حضرت عثمان غنیؓ کا دورِ خلافت

حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد خلافتِ راشدہ کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ بنے جن کا دورِ خلافت ۲۴ھ سے ۳۵ھ تک رہا۔ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد آپ نے سب سے پہلے بڑے عہدے داروں کے نام فرامین جاری کئے کہ عدل و انصاف کا پورا لحاظ رکھیں۔ پوری امانت داری و دیانت داری سے کام لیں۔ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کریں، دشمنوں سے بد عہدی نہ ہو نیز یہ کہ عہدیداروں کی حیثیت محافظ کی ہے۔ وہ عوام کے آقا نہیں ہیں۔ لہٰذا عوام کے ساتھ نرمی و شفقت سے پیش آنا چاہیئے۔

حضرت عثمان غنیؓ کے ابتدائی عہد میں ایران کے اندر چند بغاوتیں بھی ہوئیں جن کا مقصد اسلامی حکومت کو ختم کرکے ساسانی حکومت قائم کرنا تھا مگر ان بغاوتوں پر قابو پا لیا گیا۔ اسی زمانے میں خراسان و آذربائیجان میں بغاوت کے شعلے بھڑکے، اسکندریہ کے رومیوں نے شورش برپا کی لیکن یہ تمام فتنے ختم کر دیے گئے اور پھر فتوحات کا سلسلہ وسیع تر ہوا۔ مشرق میں ترکستان، کابل اور مکران فتح ہوئے۔ مغرب میں شمالی افریقہ کی تسخیر ہوئی۔ اسی طرح کچھ اور علاقوں پر بھی مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا۔

حضرت عثمان غنیؓ کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں عبد مناف پر رسول اکرمؐ کے شجرہ نسب سے مل جاتا ہے۔ آپ کا شمار ان چند لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے زمانہ جاہلیت ہی میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ حضرت محمدؐ نے آپ کو کاتبِ وحی بھی مقرر فرمایا تھا۔ کاتبِ وحی ہونے کے ساتھ ساتھ آپ نے حضورؐ کے معتمد کی حیثیت میں بھی خدمات انجام دیں۔ آپ کا شمار سابقون الاولون، عشرہ مبشرہ اور ان چھ اکابر صحابہ میں ہوتا ہے جس سے رسول اکرمؐ ہمیشہ خوش رہے۔ حضورؐ کی دو صاحبزادیاں آپ کے عقد میں رہیں۔ اس لئے آپ کو ذوالنورین کہا گیا۔ بہت نیک فطرت تھے۔ اسلام سے پہلے بھی آپ کا دامن آلودگیوں سے بچا رہا۔ شرم و حیا آپ کے اعلیٰ اخلاق کی امتیازی علامتیں تھیں۔ آپ عہدِ نبوی کی تمام غزوات میں شریک رہے۔

بڑے مالدار تاجر تھے اور حد درجہ سخی و فیاض۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے بے دریغ اپنی دولت صرف کی۔ ان کی فیاضی و سخاوت کے واقعات اسلامی تاریخی کتب میں کثرت سے موجود ہیں۔ آپ کے عہد خلافت میں تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت، تجارت و زراعت اور علوم و فنون کو بڑی ترقی ہوئی۔ اسلامی مملکت اس دور کی سب سے بڑی مملکت تھی۔ فارغ البالی اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ صحابہ کرام نے مدینہ اور اس کے قرب و جوار میں خوبصورت عمارتیں تعمیر کرائیں۔ قدیم بازاروں کے علاوہ نئے بازار کھلے۔ عمائدین قریش اور تجارت پیشہ مسلمان سرزمین حجاز سے نکل کر دور دور کے علاقوں تک پہنچ گئے۔

آپ کی دینی خدمات میں اہم خدمت مسجدِ الحرام کی توسیع ہے جو ۲۶ھ میں ہوئی۔ ۲۹ھ میں آپ نے مسجدِ نبوی کی تعمیر و توسیع کرائی۔ سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کے مستند نسخے کی اشاعت اور ملت اسلامیہ کو ایک مصحف اور ایک قرات پر جمع کرنا تھا۔ روایت ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ مصحف کی سات نقلیں کرائیں اور ان کو مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفے میں ایک ایک نسخے کے طور پر جاری فرمادیا۔

حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت ۱۲ برس تک قائم رہی۔ اس کا نصف آخر بہت ہی پرسکون رہا۔ فتوحات کی کثرت کے سبب مالِ غنیمت اور محصولات میں اضافہ ہوا۔ تجارت و زراعت بھی پروان چڑھی۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں خوشحالی آئی۔ لیکن ساتھ ہی فساد اور بگاڑ کی صورتیں بھی پیدا ہوئیں۔ عرب قبائل کی باہمی رنجشیں، غیر مسلم اقوام اور علاقوں کا حلقۂ اسلام میں آنا، کچھ غیر مسلموں کی سازشیں فتنہ و فساد کی جڑ بن گئیں۔ چونکہ آپ بڑے نرم دل اور نرم خو تھے اس لئے سازشی عناصر دلیر ہو گئے۔ باغیوں نے آپ پر طرح طرح کے اعتراض اور الزام عائد کئے۔ مثلاً صحابہ کرام کو معزول کر کے اپنے ناتجربہ کار رشتے داروں کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کرنا۔ اصحاب رسولؐ سے ناروا سلوک، بقیع کی سرکاری چراگاہ کو اپنے لئے مخصوص کرنا۔ اموی اہلکاروں کی بدعنوانیوں پر پردہ ڈالنا اور تدارک نہ کرنا۔ بیت المال کی رقم بے جا طور پر صرف کرنا اور اپنے عزیزوں کو بڑی بڑی رقمیں دینا۔ بدعتوں کو فروغ دینے میں حصہ لینا، ایک قرآن کے علاوہ باقی تمام مصاحف کو جلا دینا۔ حکم بن العاص جسے حضورؐ نے جلاوطن کر دیا تھا، دوبارہ بلانا اور مدینے میں رکھنا، مصری وفد کے ساتھ بدعہدی، عبداللہ ابن سعد کو افریقہ کے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بطور انعام دینا۔

ان الزامات میں سے اکثر کا جواب خود حضرت عثمانؓ نے باغیوں کو دیا، جب وہ آپ کے گھر پر

کام ہوئے ہوئے تھے۔ مثلاً انھوں نے کہا تھا کہ کہا جاتا ہے کہ میں نے بڑے بڑے عہدوں پر نوجوانوں کا تقرر کر دیا ہے حالانکہ ان کی تقرری قابلیت اور صلاحیت کے پیشِ نظر کی گئی تھی۔ ایک الزام یہ ہے کہ میں اپنے قرابت داروں کو عطیات دیتا رہتا ہوں حالانکہ ان سے محبت کرنا کوئی بری بات نہیں اور نہ اس وجہ سے کسی پر ظلم کیا ہے۔ میں انھیں بیت المال سے اتنا ہی دیتا ہوں جو ان کا جائز حق ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ دیتا ہوں وہ اپنے ذاتی مال سے۔ مسلمانوں کا مال نہ میں اپنے لئے جائز سمجھتا ہوں اور نہ ان کے لئے۔ میں اپنی معاش کا بوجھ بھی بیت المال پر نہیں ڈالتا۔ کہا گیا کہ قرآن کے کئی مصاحف تھے میں نے ایک کو چھوڑ کر باقی سب تلف کرا دیے۔ حالانکہ قرآن ایک ہی ہے۔ معتمد صحابہ کی جماعت موجود ہے جس نے اسے حضورؐ کی زیرِ ہدایت قلمبند کیا اور میں نے انھیں کے نسخے کی نقلیں جا بجا بھیجیں۔ ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ میں نے حکم بن العاص کو مدینہ بلا لیا۔ حالانکہ میری سفارش پر خود حضورؐ نے اسے آنے کی اجازت دیدی تھی۔ میں نے اپنے عہد میں صرف اس حکم کو نافذ کیا ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ نے تمام الزامات کے ایسے ہی معقول اور مدلل جواب دیے، لیکن سازشی عناصر انہیں قتل کرنے پر کمر بستہ تھے اور وہ اپنے ظالمانہ طرزِ عمل میں کامیاب ہوئے۔ تاہم اپنے دورِ خلافت میں جو کارنامے آپ نے انجام دیے وہ تاریخِ اسلام میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کارناموں میں بحری بیڑے کا قیام، مملکت کی توسیع، عوام کا خوشحالی، سرکاری عمارتوں کی تعمیر۔ عمومی فلاح و بہبود کے کام جیسے مسافر خانوں، مسجدوں، کنوؤں، مدینہ منورہ کی حفاظت کے لئے بند کی تعمیر اور تعلیمی ترقی و توسیع کے لئے معقول انتظامات قابلِ ذکر ہیں۔

مجموعی طور پر حضرت عثمان غنیؓ کا دورِ خلافت تاریخِ اسلام کا ایک اہم اور ناقابلِ فراموش باب ہے۔

حضرت علی مرتضیٰؓ کا دورِ خلافت

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کا دورِ خلافت آیا جو ۳۵ھ سے ۴۰ھ تک رہا۔ حضرت علیؓ رسول اکرمؐ کے چچازاد بھائی تھے اور داماد بھی۔ بعثت نبوی سے دس برس پہلے پیدا ہوئے اور بچپن ہی سے حضورؐ کے ساتھ رہے۔ چونکہ آغوشِ رسالت میں پرورش پائی تھی اس لئے شروع ہی سے پاک باطن اور نیک سیرت رہے۔ بچوں میں آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ کمسنی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ کا شمار ان چار خوش بختوں میں ہوتا ہے جو سب سے پہلے شمعِ رسالت کے جاں نثار بنے۔ آپ ہمیشہ حضورؐ کے ساتھ رہے۔ ہجرت کی شب حضورؐ نے آپ ہی کو اپنے بسترِ مبارک پر سونے کا حکم دیا۔ ہجرت کے دوسرے برس آپ کو حضورؐ کی دامادی کا اعزاز حاصل ہوا۔ آپ نے غزوۂ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شرکت فرمائی اور جانبازی اور جانثاری کے وہ جوہر دکھائے کہ شیرِ خدا کہلائے۔ آپ ہی کے جذبۂ جہاد سے خیبر کا مشہور قلعہ فتح ہوا۔ خلافتِ راشدہ میں تینوں خلفاء کی مجلسِ شوریٰ کے رکن رہے اور اپنے مفید مشوروں سے اسلام کو تقویت دیتے رہے لیکن جن حالات میں آپ کے شانوں پر خلافت کی ذمہ داریاں آئیں وہ بڑے مشکل حالات تھے۔ پوری اسلامی ریاست میں مشرکانہ سازشیں، قبائلی خانہ جنگی، باہمی بے اعتمادی اور انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ آپ کو جو مشکلات درپیش تھیں وہ اجمالی صورت میں یہ تھیں کہ ادارۂ خلافت کے بکھرے ہوئے اجزا کو پھر سے جمع کر کے مستحکم کرنا تھا۔ خلافت کی اصل روح کو قائم رکھتے ہوئے اسے خالصتاً اسلامی قدروں کے مطابق چلانا تھا۔ لوگوں کے شک و شبہات دور کرنا تھے تاکہ بے اعتمادی کا سدِباب ہو سکے۔ قاتلینِ عثمان کا سراغ لگانا اور ان سے قصاص لینا تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ سے جو شکایات لوگوں کو تھیں ان کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر ان کا تدارک کرنا تھا۔

حضرت علی نے بڑی جرأت مندی سے یہ فیصلہ کیا کہ خلافِ اسلام کسی مصلحت کو شی روا نہ رکھا

جائے اس لئے یہ مناسب سمجھا کہ مسلمانوں کی شکایتیں دور کی جائیں اور انھیں بیعت کی دعوت دی جائے۔ شکایتیں زیادہ تر صوبائی گورنروں یعنی والیوں کے خلاف تھیں۔ آپ نے ان کو برطرف کر دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ شام کے والی تھے۔ انھوں نے معزولی کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس انکار سے کئی پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے اور امیر معاویہؓ کے خلاف سخت قدم اٹھانے کی ضرورت پڑی لیکن اس سے پہلے ہی بڑی شدت سے قصاص عثمان کا مطالبہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ نے اس مطالبے سے گریز نہیں کیا تھا مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ قاتلوں کا پتہ چلانا اور ان کے پشت پناہوں کو قرار واقعی سزا دینا جلد بازی کا کام نہ تھا۔ صورت حال اتنی نازک ہو گئی کہ جنگ جمل کی نوبت آ ئی جو خانہ جنگی کی تشویشناک صورتیں لے کر رونما ہوئی، لیکن فریقین میں مصالحت ہو گئی۔ یہ بات ان شر پسندوں کو بہت گراں گزری جو حضرت عثمان غنیؓ کے خلاف سازشیں کرنے میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے وہ چال چلی کہ مصالحت کا خون ہو گیا۔ جنگ جمل ہوئی جس میں چند اکابرین اسلام ناحق شہید ہوئے۔ دار الخلافہ مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر حضرت علیؓ نے نئے سرے سے اندرونی خلفشار کو دور کرنے کی ہر امکانی کوشش کی اور خاصی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

تاریخ اسلام کا یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت کے بعد اسلامی ریاست وسیع تر تو ہوئی مگر اندرونی شورشوں نے اسلامی تہذیب کے ارتقاء اور امن و آشتی کی فضا کو خانہ جنگی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ خصوصاً حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں حضرت امیر معاویہ سے اختلاف کی خلیج اتنی بڑھ گئی کہ جنگ صفین برپا ہوئی جس میں مسلمان ہی مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ مصالحت کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً ۴۵ ہزار شامی اور ۲۵ ہزار عراقی کام آئے۔ ستم بالائے ستم ملتِ اسلامیہ میں سخت تفرقہ پڑ گیا جس کی ایک مثال خارجیوں کے زمرہ کی صورت میں پیش آئی اور آخر خلیفۂ چہارم کی شہادت کا پیش خیمہ بنی۔

حضرت علیؓ ان مقتدر صحابہ میں شامل ہیں جنھیں زندگی ہی میں جنت کی بشارت ہو گئی تھی۔ آپ کی زندگی خلق نبوی اور تعلیمات نبوی کا نمونہ تھی۔ آپ بلند پایہ مفسر، ممتاز فقیہہ اور بے بدل قاضی تھے۔ فن خطابت میں آپ کی دھوم تھی۔ عبادت و ریاضت زندگی کا معمول تھا۔ کثرتِ صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے قائم اللیل اور صائم النہار مشہور تھے۔ بردبار، منکسر المزاج اور متواضع، ایثار،

بے نفسی، سخاوت، ہمدردی اور خدا ترسی میں امتیازی شان رکھنے والے۔ انتہائی ہی تک سادہ اور دنیاوی تکلفات سے آزاد۔ عہدِ خلافت میں بھی اپنے لئے نہ کوئی عمارت بنوائی اور نہ ساز و سامان کو پسند کیا۔ آپ کے پاس اتنی بڑی اسلامی مملکت کا خلیفہ ہوتے ہوئے بھی بچھانے کے لئے ایک مینڈھے کی کھال، اوڑھنے کے لئے ایک معمولی چادر اور بہت ہی سادہ کپڑے تھے۔ بیت المال میں سب کچھ ہوتے ہوئے آپ کے گھر فقر و فاقہ کا ڈیرہ رہتا تھا۔ یہی خاکساری بے نفسی اور مسکینی تھی جس کی بنا پر حضور اکرم نے آپ کو ابو تراب کا لقب دیا جسے آپ نے بے حد پسند فرمایا۔ دیانت داری، امانت داری اور عدل پسندی آپ کے خاص اوصاف تھے۔ انتہائی نازک حالت میں بھی جبکہ حضرت امیر معاویہؓ کے مقابلے میں اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کی خاطر مال و دولت سے بہت کام لیا جا سکتا تھا مگر آپ نے ایک پھوٹی کوڑی بھی بیت المال سے نہ لی اور نہ کسی سے مل کر کوئی سازش کی۔ نہ کسی کو کوئی بے جا رعایت دی۔

دورِ خلافت میں آپ اپنے عاملوں سے پائی پائی کا حساب لیتے اور انھیں خیانت سے بچنے کی تلقین کرتے رہتے۔ ذمیوں کے حقوق کا خاص خیال رکھتے۔ آپ کے عہدِ خلافت تک صحابہ کرام کی بڑی تعداد دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ جو عربی اور عجمی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، ان میں روحِ اسلامی کا فقدان تھا۔ اس لئے خلافت کو قرآن و سنت کے مطابق چلانا دشوار سے دشوار تر ہوتا گیا، لیکن آپ راہِ مستقیم سے نہ ہٹے۔ اگر مسلمانوں میں سچا جذبہ برقرار رہتا تو آپ کی خلافت عہدِ رسالت کی طرح اور اس کی سچی تصویر ہوتی۔ آپ ادارۂ خلافت کو منہاجِ نبوت پر قائم رکھتے ہوئے ایک شقی القلب کے ہاتھوں ۲۱ رمضان المبارک ۴۰ھ کو دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔

خلافتِ بنو امیہ

خلافتِ بنو امیہ کا آغاز حضرت امیر معاویہ کے دورِ خلافت سے شروع ہوا جو حضرت امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری کے بعد ۴۰ھ میں خلیفہ بنے تھے۔ ان کے عہدِ خلافت میں خارجیوں کی بغاوت اور کئی دوسری بغاوتیں ہوئیں مگر انھوں نے حالات پر قابو پالیا۔ پھر فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ چینی ترکستان، شمالی افریقہ، سندھ، قسطنطنیہ وغیرہ پر فوج کشی ہوئی اور بہت کچھ ہاتھ لگا۔ امیر معاویہ ماہر سیاستداں تھے۔ دنیاوی لحاظ سے ان کی سیاست کامیاب رہی۔ انھوں نے فوجی نظام ڈاک کا نظام، پولیس کا نظام اعلیٰ درجے پر قائم کیا۔ زراعت کی ترقی کے لئے نہریں کھدوائیں، سرکاری عمارتیں تعمیر کرائیں۔ بڑی تعداد میں مسجدیں بنوائیں اور ذمیوں کو بھی مطمئن رکھا بلکہ ان کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ خود اپنے لئے دمشق میں عالیشان محل بنوایا اور بیس برس تک شان و شوکت سے حکومت کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد طے شدہ منصوبے کے مطابق ان کا بیٹا یزید تخت نشیں ہوا۔ اس کی زندگی عیش و عشرت میں پرورش پاکر سیر و شکار اور تفریحات کی عادی ہو چکی تھی۔ اسی کے عہد میں سانحہ کربلا رونما ہوا، کیوں کہ خلافت موروثی بادشاہت کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ سانحہ کربلا نے عالمِ اسلام کو جس کربناکی سے دوچار کیا وہ محتاجِ بیان نہیں۔

یزید اول ۶۰ھ سے ۶۴ھ تک برسرِ اقتدار رہا۔ اس کی موت کے بعد معاویہ ثانی تخت پر بیٹھا۔ وہ خدا ترس، دیندار اور صالح نوجوان تھا۔ وہ تین ماہ بعد ہی اقتدار سے دست بردار ہو کر گوشہ نشین ہو گیا۔ پھر مروان اول کا دور آیا۔ اس نے جیتے جی اپنے بیٹے عبدالملک کو اپنا جانشین نامزد کر دیا جو ۶۵ھ میں تختِ خلافت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں عربی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا، اسلامی سکہ رائج ہوا۔ فتوحات کا دائرہ بھی بہت بڑھا اور ۲۱ سال حکومت کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کا شمار

نمایاں طور پر ہوتا تھا۔ اس نے اپنی حیات میں ہی بڑے بیٹے ولید بن عبدالملک کو جانشین نامزد کر دیا تھا جو ۸۶ھ میں تخت پر بیٹھا اور دس سال حکومت کی۔ اس کے دور میں چینی ترکستان، سندھ، سپین اور روم سے معرکہ آرائیاں رہیں جن میں کامیابی اور فتح حاصل ہوئی۔ اس کے کارناموں میں بحری بیڑے کی توسیع، عمارتوں اور مسجدوں کی تعمیر اور رفاہِ عامہ کے کاموں پر کروڑوں روپے صرف ہوئے۔ سڑکیں بنیں، مہمان خانے تعمیر ہوئے، پولیس چوکیاں اور شفاخانے بڑھائے گئے۔ محتاج خانے اور یتیم خانے بھی کثرت سے قائم ہوئے۔ دولت کی ریل پیل تھی اس لئے عمارتوں اور مسجدوں میں سنگِ مرمر کے علاوہ دوسرے قیمتی پتھر بھی لگائے گئے اور سونا چاندی کی میناکاری بھی کی گئی۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا لیکن آدابِ حکومت سے واقف تھا۔ بذاتِ خود سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ نماز روزے کا بہت پابند تھا۔ قرآنِ کریم کی تلاوت اس کے معمولات میں داخل تھی۔ عام لوگوں کی بھلائی کے کام کرنا اسے پسند تھے۔ خود بازاروں میں جا کر چیزوں کی قیمتیں معلوم کرتا اور زیادہ ہوتیں تو کمی کا حکم دیتا۔ مزاج کا بہت سخت تھا۔ اس کی کامیابیوں میں حجاج بن یوسف کو بھی بہت دخل تھا جو خلافت بنو امیہ کا سب سے مضبوط ستون ثابت ہوا۔ عام روایت کے مطابق حجاج نے اپنے دورِ اقتدار میں ایک لاکھ آدمی قتل کیے اور پچاس ہزار کو قید و بند کی سزائیں دیں۔

بنو امیہ کے خلفا میں امیر معاویہ سے لے کر ولید بن عبدالملک تک جہانبانی اور جہانداری کے جو طور طریقے رہے ان میں ملوکیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ بہرکیف ولید کے بعد اس کا بھائی سلیمان تخت پر بیٹھا۔ وہ اپنے بھائی ولید کی حکمتِ عملی سے خوش نہ تھا اس لئے اس نے سابقہ دور کے تمام سپہ سالاروں اور فاتحین کو جن میں محمد بن قاسم بھی شامل تھا اپنی راہ سے ہٹا دیا۔ وہ صرف تین سال حکومت کر سکا اور ۹۹ھ میں وفات پائی۔ وفات سے پہلے اس نے اپنے چچا زاد بھائی عمر بن عبدالعزیز اور اپنے سگے بھائی یزید بن عبدالملک کو جانشین نامزد کیا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تو خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کر دی۔ ان کے بعد یزید ثانی ۱۰۱ھ سے ۱۰۵ھ تک حکمراں رہا۔ پھر ہشام بن عبدالملک نے ۱۲۵ھ تک حکومت کی۔ فتوحات کا دائرہ فرانس تک جا پہنچا۔ اسے علم و فن سے دلچسپی تھی۔ کچھ محدثین سے جن میں امام زہری قابلِ ذکر ہیں، اس نے احادیث کی کتابیں بھی لکھوائیں۔ اس کے بعد ولید ثانی، یزید ثالث، ابراہیم بن ولید اول اور

مروان ثانی کا نام نہاد دورِ خلافت رہا۔ ولید ثانی قطعی نا اہل ثابت ہوا اور ایک سال بھی پورا نہ کیا تھا کہ شامی فوج نے اسے قتل کر دیا۔ یزید ثالث نے بھی کچھ ہی عرصہ حکمرانی کی اور مر گیا۔ مروان ثانی میں بھرپور صلاحیت تھی مگر نظام اتنا بگڑ چکا تھا اور حالات اتنے خراب تھے کہ وہ مشکل سے پانچ سال ہی کھینچ سکا۔

اموی خلافت کا قیام جس طرح عمل میں آیا تھا اس نے خود اپنی ہمہ گیر مقبولیت کی راہیں بند کر دی تھیں پھر بھی خلافت کے کچھ خدوخال مذہبی رہے۔ ساتھ ہی اموی خلافت اپنے مزاج و کردار کے لحاظ سے خالص عربی تھی۔ اس کی ایک اہم خصوصیت فتوحات کی کثرت سے عبارت رہی۔ وہ سیاسی عروج کے اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں سے زوال کی راہیں کھلتی ہیں۔ اموی خلافت میں فوجی طاقت اور عسکری برتری نمایاں رہی جس کی بناء پر اسے نیم عسکری حکومت بھی کہتے ہیں۔ رائے عامہ کو کوئی اہمیت نہ حاصل تھی جس کا نتیجہ تباہی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ خلیفہ حکومت کے تمام شعبوں کا سربراہ ہوتا تھا۔ وہ مطلق العنان تھا۔ مجلسِ شوریٰ کا وجود نہ رہا اس کی جگہ درباروداری نے لے لی۔ خلیفہ کے لئے محل اور شاہی سواری ضروری ہو گئی۔ ڈھیروں غلام اور خدمت گار حاضر رہتے۔ حفاظت کے لئے محافظ دستے، قصیدہ خوانی اور تفریح کے لئے شعراء، قصہ گو اور گلوکار ہوتے تھے۔

اموی خلافت کا نظام پانچ بڑے محکموں پر مشتمل تھا یعنی فوجی محکمہ، مالیاتی محکمہ، سرکاری مراسلت اور فرمان جاری کرنے والا محکمہ، سرکاری ریکارڈ رکھنے والا محکمہ اور ڈاک کا محکمہ۔ پوری مملکت چھ صوبوں میں تقسیم تھی یعنی عرب، شام، عراق، خراسان، مصر اور جزائر افریقہ۔ عدالتی نظام وہی تھا جو خلافتِ راشدہ میں تھا۔ رفاہِ عامہ کے کام بھی خاصے ہوئے۔ مثلاً سڑکوں، نہروں، شفاخانوں، یتیم خانوں، مہمان خانوں اور مدرسوں کی تعمیر۔ ہر قسم کی تعمیر میں آرائش و زیبائش کا خیال رکھا گیا۔ خصوصاً مسجدوں اور رہائشی مکانوں میں بڑی سجاوٹ ہوتی رہی۔ علمی لحاظ سے عربی زبان کو ترقی ملی۔ حضرت حسن بصریؒ، حضرت امام باقرؒ اور کئی دوسرے بڑے علماء نے فقہ، تفسیر، حدیث اور تاریخ کی کتابیں لکھیں اور طب یونانی پر بھی خاصا کام ہوا جو تہذیبی ارتقاء میں کام آیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ کا دورِ خلافت

اموی دورِ خلافت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسی شخصیت کا خلیفہ ہونا ایک معجزہ تھا۔ ان کے والد عبدالعزیز شاہی خاندان کے ممتاز رکن، ولی عہد اور مصر کے گورنر رہے تھے اس لئے ان کی پرورش شاہی ماحول میں ہوئی لیکن وہ فطری طور پر سلیم الطبع، صالح اور صاف باطن شخص تھے۔ زہد و عبادت اور حصولِ علم میں مشغول رہتے تھے۔ علمی اعتبار سے آپ اپنے وقت کے امام تھے۔ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے سے پہلے مختلف بڑے عہدوں پر رہے تھے۔ ولید نے جب آپ کو مدینہ کا والی مقرر کیا تو آپ نے وہاں فقہا کی مجلسِ شوریٰ قائم کی۔ مسجدِ نبوی کی تعمیر آپ ہی کی نگرانی میں ہوئی۔

۹۹ھ میں آپ خلیفہ بنے اور شروع ہی سے اموی طرزِ حکومت سے انحراف کیا۔ آپ کے نزدیک، خلافتِ راشدہ ہی صحیح اسلامی حکومت تھی اس لئے آپ کی ہر امکانی کوشش رہی کہ اسی روایت کو زندہ کریں۔ اس غرض سے آپ نے ازسرِنو مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا "لوگو! میری خواہش اور تمھاری رائے کے بغیر مجھے تم پر مسلط کر دیا گیا ہے اس لئے میں خود خلافت سے دست برداری کا اعلان کرتا ہوں تمھیں حق ہے جسے چاہو منتخب کر لو۔" یہ بہت انقلابی، جرأت مندانہ اور بجا طور پر اسلامی اقدام تھا۔ اس اعلان کو سن کر سب پکار اٹھے ہم آپ ہی کو اپنا خلیفہ منتخب کرتے ہیں۔ اللہ کا نام لے کر اس بار کو اٹھا لیجیے۔
جب آپ کو اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو آپ نے اجتماع سے خطاب کیا "لوگو! جو شخص اللہ کی اطاعت کرے اس کی فرمانبرداری جائز ہے اور جو نافرمانی کرے اس کی اطاعت جائز نہیں۔ جب تک میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں، تم میری اطاعت کرتے رہو۔ یاد رکھو تمہارے نبیؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اور نہ کوئی کتاب اترے گی۔ لہٰذا اللہ نے جو چیز حلال کر دی ہے وہ قیامت تک حلال ہے اور جو چیز حرام کر دی ہے وہ ہمیشہ حرام رہے گی۔ میں کوئی نیا حکم دینے کی بجائے صرف احکامِ الٰہی کو نافذ کروں گا۔

قیام خلافت کے پہلے مرحلے میں فارغ ہو کر جب آپ مسجد سے روانہ ہونے لگے تو شاہی سواری پیش کی گئی، جسے آپ نے واپس کر دیا اور کہا کہ میرے لئے میرا خچر ہی کافی ہے۔ نیزہ بردار حفاظتی دستہ سامنے آیا تو اسے بھی روک دیا اور تمام شاہی ساز و سامان بیت المال میں جمع کرا دیا۔ تن تنہا گھر پہنچے تو بیوی نے پریشان دیکھ کر پوچھا "اتنے فکرمند کیوں ہیں؟" جواب دیا "فکر مندی کی بات ہے۔ مشرق سے مغرب تک امت مسلمہ کا کوئی فرد ایسا نہیں جس کا مجھ پر قرض نہ ہو گیا ہو۔" اس کے بعد گھر کا تمام قیمتی اثاثہ، زیورات وغیرہ بیت المال کی نذر کر دیے اور تمام ذاتی ملازمین کو بھی آزاد کر دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز خلافت راشدہ اور خصوصاً حضرت عمر فاروقؓ کے دور کو اپنے دور خلافت میں لانے کے خواہاں تھے مگر یہ کام اس وقت بے حد خطرناک تھا۔ کیونکہ خلافت نے ملوکیت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ شاہ زادوں اور امرا کو عیش و عشرت کی لت پڑ چکی تھی۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کی جڑیں گہری ہو چکی تھیں۔ بیت المال کو خلیفہ کے ذاتی خزانے کی حیثیت مل چکی تھی۔ معاشرے میں بے راہ روی عام ہو چکی تھی۔ عملداروں کو شان و شوکت سے رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ غرض ایسا اصلاحی قدم اٹھانا بڑے حوصلے کی بات تھی جو انھوں نے اٹھایا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سب سے پہلے وہ جاگیریں جو اموی خلفا نے حیلوں بہانوں سے چھین کر شاہ زادوں میں تقسیم کی تھیں، واپسی کا حکم صادر فرمایا اور اعلان کرا دیا کہ جس کسی کو بھی اپنے حق سے محرومی کی شکایت ہو وہ فوراً مطلع کرے۔ تمام گورنروں کو بھی فرامین بھیجے کہ ریکارڈ دیکھ کر تمام املاک اصل وارثوں کو لوٹائی جائیں اور اگر کسی ضبط شدہ جائیداد کے مالک کا پتہ نہ چلے تو اسے سرکاری تحویل میں لے لیا جائے۔

آپ کے اس حکم سے شاہی خاندان میں ہلچل مچ گئی مگر سب مجبور تھے۔ لہٰذا تعمیل حکم کرنی پڑی۔ باغ فدک رسول اکرمؐ کا خالصہ تھا جس کی آمدنی آپ اپنی اور اپنے اہل خاندان کی ضروریات پوری کرنے پر صرف کرتے تھے۔ خلافِ راشدہ تک اس کے انتظام میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ بنی امیہ کے عہد میں مروان نے اسے اپنی جاگیر بنا لیا اور وراثتاً حضرت عمر بن عبدالعزیز کے قبضے میں آیا۔ اس وقت آپ کے اہل و عیال کی معاش کا دار و مدار اس باغ پر تھا، مگر آپ نے مطلق پروا نہ کی اور اسے سرکاری تحویل میں دے دیا اور اس کا وہی انتظام کیا جو خلافتِ راشدہ میں تھا۔

آپ نے بیت المال کو تمام فضول اخراجات سے پاک کیا۔ آمدنی کے جو ناجائز ذرائع اور غیر شرعی طریقے تھے، وہ ختم کیے۔ شاہی خاندان کے لوگ جو وظیفے پاتے تھے وہ موقوف کر دیے۔

شان و شوکت کے تمام انتظامات کا خاتمہ کر دیا اور بیت المال کو غریبوں، محتاجوں اور اہم ترین دینی اور ملّی ضرورتوں کے لئے قائم رکھا۔

مالی اصلاحات کے سلسلے میں آپ نے جاگیروں کی ضبطی، وظائف کی موقوفی، نذرانوں محصولات کا خاتمہ اور نومسلموں سے جزیہ لینے کی ممانعت فرمادی جس کے نتیجے میں ہزاروں غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ آپ نے مسلمانوں کی زرعی جائیداد پر عشر اور غیر مسلموں پر خراج عائد کیا، مگر بنجر زمینوں کو خراج سے مستثنیٰ رکھا۔ علاوہ ازیں فصلوں کے خراب ہونے پر بھی محاصل معاف کر دی گئیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جیل خانوں کی اصلاح کی، قیدیوں کے کھانے اور کپڑے کا انتظام بیت المال سے کیا جیسے حضرت علیؓ نے اپنے دورِ خلافت میں کیا تھا۔ آپ نے ذمیوں پر بھی پوری توجہ دی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز بذاتِ خود عالم تھے اس لئے حصولِ علم کے لئے زیادہ سے زیادہ مدارس قائم کئے، یہاں دینی علوم کے علاوہ علوم مفیدہ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اساتذہ کو معقول وظیفے ملنے لگے اور علوم کی ترقی سے اشاعت اسلام کو بھی تقویت ملی تمام گورنروں اور عہدیداروں کو حکم دیا گیا کہ وہ خود تبلیغ کریں اور جا بجا تبلیغی وفود بھیجیں۔ ان اقدام سے پوری مملکتِ اسلامیہ میں ہزاروں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ شمالی افریقہ میں لاکھوں بربر مسلمان ہوئے۔ چین میں بھی مبلغین کے وفود جانے سے اسلام پھیلا۔ پورا نظام خلافت قرآن و سنت کے تابع کیا گیا۔ شراب نوشی کی سخت سزا دی گئی اور سب عملداروں کو پابندی سے نماز قائم کرنے کے احکام دیے گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رات کا زیادہ حصہ عبادت میں بسر کرتے تھے۔ آخرت کے خوف سے رو کر دعائیں کرتے۔ بیت المال سے اتنی حقیر رقم لیتے کہ بنیادی ضرورتیں بھی مشکل سے پوری ہوتیں۔ ظالموں نے آپ کو سازش کر کے زہر دلوا دیا تھا۔ آپ جس وقت بسر مرگ پر تھے تو جو جوڑا پہنے ہوئے تھے، اس کے علاوہ کوئی جوڑا بھی نہ تھا۔

آپ نے وہ دینی اور عوامی خدمات انجام دیں جن کی بدولت آپ کا عہد اسلامی جمہوری عہد اور تاریخِ عالم کا مثالی دور کہلاتا ہے۔

خلافتِ عباسیہ

اموی خلافت کا خاتمہ ۱۳۲ھ میں ہو گیا اور اس کی بجائے خلافت عباسیہ کا دور شروع ہو گیا جنھوں نے ۶۵۶ھ تک پانچ سو چوبیس برس تک حکمرانی کی۔ خلافتِ عباسیہ کا پہلا دور جو ایک صدی سے زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ تہذیبی، تمدنی اور سیاسی عروج کے لحاظ سے انتہائی شاندار رہا۔ اس ادوار میں دوسرے عبداللہ ابو جعفر المنصور، ابو جعفر ہارون الرشید، محمد الامین بن ہارون، عبداللہ المامون اور چند دوسرے خلفائے عباسیہ نے نہ صرف سلطنت کو وسیع کیا بلکہ عظیم تہذیبی کارنامے بھی انجام دیے۔

عباسیوں نے قرابتِ رسول پاکؐ اور مذہبی فضیلت کی بنیادوں پر اپنی خلافت قائم کی تھی۔ اور سفاح نے اپنے پہلے خطبے میں یہی وضاحت کی تھی "اللہ تعالیٰ نے اسلام اور رسول اکرمؐ سے قرابت کی بنا پر ہمارا مرتبہ بلند کیا ہے۔" پھر اس کے چچا داؤد نے کہا "ہم اللہ اور اس کے رسول کے واسطے سے اپنے اوپر یہ ذمہ لیتے ہیں کہ ہر معاملے میں ہر خاص و عام کے ساتھ کتاب و سنت کے مطابق عمل کریں گے۔

ہر چند کہ قوانین اسلامی رہے مگر روح و مقاصد کے اعتبار سے خلافتِ عباسیہ کا سیاسی و معاشی نظام وہ نہ رہا جسے صحیح معنوں میں اسلامی کہا جا سکے۔ ہوا یہ کہ مذہب کا دائرہ چند خاص شعبوں کے اندر محدود ہو کر رہ گیا اور ان کی سیاسی تنظیم غیر اسلامی طرز اختیار کرتی چلی گئی۔

بنو امیہ کی طرح عباسیوں کی حکومت بھی شخصی اور موروثی رہی۔ پھر بھی وہ قانون سازی کا مجاز اپنے آپ کو نہ سمجھتے تھے اور نہ عملی طور پر قوانین وضع کیے بلکہ خلافت احکام شریعہ کے تابع خیال کی جاتی رہی۔ عباسی تحریک ایرانیوں کی حمایت سے کامیاب ہوئی تھی اس لئے خلافت و نظام مملکت پر ایرانی اثرات غالب آ گئے۔ پھر ترکوں کا غلبہ ہو گیا۔ اس لحاظ سے دربار کے آداب اور شان و شوکت کے انداز میں عجمی رنگ نمایاں ہوتا گیا۔ بغداد جیسا شہر اس وقت دنیا میں موجود نہ تھا

جو عباسیوں کا دارالخلافہ بنا اور جہاں ان کے عالیشان محلات اور دربار کے لئے نہایت شاندار ایوان تھے جو فن تعمیر کا شاہکار سمجھے جاتے تھے۔ زرق برق سپاہی اور محافظ خلیفہ کے گرد حلقہ باندھے ادب سے کھڑے رہتے تھے۔ دربار میں علماء، فضلاء اور اراکین خلافت کا ہجوم رہتا تھا۔

عباسی عہد مجموعی طور پر تہذیبی و تمدنی عہد تھا اس لئے فتوحات بہت ہی کم ہوئیں پھر بھی صقلیہ اور سوڈان کے کچھ علاقے اور ترکستان کے بعض مقامات مملکت میں شامل کئے گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بازنطینی سلطنت جس پر مسیحی دنیا کو ناز تھا، خلافت کی باج گذار بن گئی۔ عباسی عہد علوم وفنون کی ترقی کا عہد تھا۔ اسے مسلمانوں کی دوسری تمام حکومتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ سلطنت کے استحکام کی وجہ سے امن وامان اور عمومی ترقی و خوشحالی کا دور دورہ رہا۔ بنو امیہ کی خلافت میں وزارت کا کوئی دخل نہ تھا جبکہ عباسی خلفاء نے وزارت کا عہدہ قائم کرکے نظام حکومت کو طاقتور بنایا۔ وزارت کے تحت نئے نئے محکمے قائم کئے اور مرکزی محکموں کی تعداد ۱۳ ہوگئی۔ مثلاً فوجی محکمہ، سرکاری مراسلات کا محکمہ، مالیاتی محکمہ، سرکاری ریکارڈ کا محکمہ، ڈاک کا محکمہ، احتساب کا محکمہ، مظالم کے تدارک کا محکمہ، شکایات وصول کرنے کا محکمہ، دربارِ خلافت کے انتظام کا محکمہ جس کے سپرد شاہی محلات کی تعمیر اور دیکھ بھال بھی تھی، خلیفہ کی ذاتی ملکیت کے انتظام کا محکمہ، فوجی ساز وسامان کا محکمہ اور اس کے علاوہ عوامی فلاح و بہبود کے چند محکمے۔

علمی ترقی کے اعتبار سے خلفائے عباسیہ کا عہد اسلامی تاریخ میں سب سے اہم ہے اس ترقی کی ابتدا خلیفہ منصور کے زمانے ہی سے ہوگئی تھی۔ وہ خود عالم، قاری، فقیہ، محدث اور فلسفی تھا شعر و ادب کا صاف ستھرا مذاق رکھتا تھا۔ علماء کا قدردان اور سرپرست تھا۔ تفسیر، حدیث، وفقہ کی تدوین کا کام علماء نے اسی کے عہد میں شروع کیا اور اسی کی درخواست پر حضرت امام مالک نے حدیث کی مشہور کتاب موطا تالیف کی۔ اس کے عہد میں سنسکرت، یونانی، سریانی اور پہلوی کتابوں کے ترجمے ہوئے جن کے لئے اس نے متعلقہ ماہر اسے علما کو دعوت دے کر بلوایا۔

خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں بغداد علم وادب کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ اس نے علمی ترقی کے لئے بیت الحکمۃ جیسا ادارہ قائم کیا جس کے تحت علم طب، نجوم، ہیئت، فلسفہ، منطق، تاریخ، ادب، فقہ، حدیث اور شاعری کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس نے منصور کے قائم کئے ہوئے کتب خانے

بھی دور دور سے گرانقدر کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا اور ترجمے کے لئے اہل افراد کو بڑی مراعات دیں۔ وہ خود بھی ادیب، عالم اور شاعر تھا۔ موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ "الف لیلہ" جیسی عالمی شہرت رکھنے والی کتاب، اصمعی نے اسی دور میں تالیف کی۔ کلیلہ دمنہ کے قصے کو سہیل ابن نوبخت نے نظم کا جامہ پہنایا۔

علمی کارناموں کے لحاظ سے مامون الرشید کا عہد بھی بہت اہم تھا۔ اس نے دنیا کی بہترین کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کے لئے دارالترجمہ قائم کیا۔ وہ شاعری پر ناقدانہ نظر رکھتا تھا۔ تفسیر، حدیث اور فقہ پر بھی اس کی نظر وسیع تھی۔ تاریخ، فلسفہ، منطق اور ریاضی جیسے علوم کا بے حد شائق تھا۔ یونان کی قدیم کتابوں کے باقاعدہ تراجم اسی کے عہد میں ہوئے۔ اس نے ایک رصدگاہ بھی تعمیر کرائی تھی جس میں سائنسی علوم کے تجربے ہوتے تھے۔

خلفائے عباسیہ کے دور میں صنعت و حرفت اور تجارت کو بھی بہت فروغ حاصل ہوا۔ پارچہ بافی، کاغذ سازی، شیشہ سازی اور لوہے کی صنعتوں نے اتنی شہرت پائی کہ ان کو دور دور کے ملکوں میں برآمد کیا جانے لگا۔ زرعی ترقی کے امکانات کو روشن تر کرنے کے لئے نہریں زیادہ سے زیادہ کھدوائی گئیں اور زراعت پیشہ لوگوں کو خاص مراعات بھی دی گئیں۔

طبی سائنس کے شعبے نے عباسی دور میں بڑے بڑے طبیب اور جراح پیدا کئے۔ ابو بکر ابن زکریا، بو علی سینا اور کئی نامور طبیب اور دانشور اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ عبداللطیف بغدادی نے انسانی ڈھانچے کی ہر ہڈی پر قابل قدر تحقیقی کام کیا۔ اور اس کا ترتیب دیا ہوا رسالہ کئی زبانوں میں منتقل ہوا۔ کیمیا اور دوا سازی کا ہنر بھی اوج کمال کو پہنچا۔ جابر بن حیان اسلامی تاریخ کا پہلا سائنس داں ہے جس نے کیمیائی تحقیقات میں بین الاقوامی شہرت پائی۔ دوسرا اہم سائنس داں امام رازی ہیں۔ ان کے علاوہ عمر خیام، الفارابی، البیرونی اور نصیر الدین طوسی جیسے بلند پایہ لوگ عباسی عہدِ خلافت سے تعلق رکھتے ہیں جو تہذیبِ انسانی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

خلافتِ فاطمیہ

فاطمی تحریک شمالی افریقہ میں پروان چڑھی اور فاطمی خلافت کی ابتدا عبید اللہ المہدی سے ہوئی۔ جس طرح عباسی اماموں نے شام کے ایک گاؤں حمیمہ کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا تھا اسی طرح فاطمی اماموں نے ملک شام ہی کے ایک دوسرے مقام سلمیہ کو اپنا مستقر بنایا اور دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری کیا۔ آخر جب یہ تحریک ابو عبد اللہ حسین شیعی کی کوششوں سے افریقہ میں پھیل گئی اور کامیابی قریب تر ہوگئی تو عبید اللہ اپنے داعی کی دعوت پر سلمیہ سے روانہ ہوا لیکن سجلماسہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ ابو عبد اللہ حسین شیعی نے وہاں کے والی کو شکست دے کر عبید اللہ کو آزاد کرایا اور زیر تسلط علاقے میں اسے گھوڑے پر سوار کر کے خود اس کے آگے آگے چلا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور وہ یہ اعلان کر رہا تھا: "ہمارے آقا یہی ہیں۔ یہی مہدی ہیں۔ اللہ نے ان کے بارے میں اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔" شمالی افریقہ میں فاطمی خلافت تو قائم ہو گئی مگر مسائل خاصے تھے جن پر عبید اللہ مہدی نے قابو پا لیا اور ساحل سمندر کے قریب ایک نیا شہر آباد کیا جو مہدیہ کے نام سے موسوم ہوا اور فاطمی خلافت کا پہلا دارالخلافہ بنا۔ پھر المہدی خلافت کو وسیع کرنے کے لئے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ المہدی نے ۲۵ سال حکومت کی اور ۳۲۳ھ میں انتقال کیا۔ اس کا بیٹا ابو القاسم فاطمی خلافت کا امام بنا۔ پھر اس کے بیٹے ابو طاہر اسمٰعیل نے امامت کا فریضہ سنبھالا جس کے بعد ابو تمیم حکمران ہوا جسے المعز الدین اللہ کی رعایت سے المعز کہا جاتا ہے۔ یہ فاطمی خلافت کا سب سے نامور فرماں رواں ہوا۔ اس نے فتوحات کے دائرے کو اسپین، مغرب اقصیٰ، صقلیہ، مصر اور دمشق تک پھیلا دیا۔ المعز کے بعد ابو منصور العزیز باللہ تخت نشین ہوا جو اپنے باپ کی طرح بہادر، عقل مند اور بردبار تھا۔ اس نے توسیع سلطنت کی بجائے امن و امان اور عمومی ترقی و خوشحالی پر توجہ دی۔ یہود و نصاریٰ کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا۔ اپنی عیسائی بیوی

کے دو بھائیوں کو اسکندریہ اور بیت المقدس کا حاکم مقرر کیا۔ العزیز کے بعد ابو حسن علی الحاکم بامر اللہ تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس کو یہ جنون ہوا کہ خدا اس کے جسم میں حلول کر گیا ہے۔ چنانچہ اس نے مریدوں کو اپنی پرستش کا حکم دیا اور وہ اسے سجدہ کرنے لگے۔ الحاکم کے بعد فاطمی خلافت زوال پذیر ہو گئی یہاں تک کہ ایک حبشن کنیز نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور حبشیوں کو زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی کیا۔ خانہ جنگی نے زور پکڑا اور ۵۶۷ھ میں فاطمی خلافت کا خاتمہ ہو گیا پھر مصر کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

فاطمی خلافت کے کارناموں میں سب سے اہم کارنامہ قاہرہ جیسا شہر آباد کرنا تھا جو اس دور کا ہی نہیں بلکہ اس کے بعد بھی مہذب دنیا کا ایک مشہور و معروف شہر ثابت ہوا۔

فاطمی خلافت کی بنیاد اگرچہ ۲۹۷ھ میں رکھ دی گئی تھی مگر اس کی علمی و تہذیبی تاریخ فتح مصر یعنی ۳۶۲ھ سے شروع ہوتی ہے۔ چوتھے فاطمی خلیفہ المعز نے اپنا دارالخلافہ مہدیہ سے قاہرہ منتقل کر کے وہاں عالیشان عمارتیں تعمیر کرائیں اور جامعہ الازہر کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح تہذیب و تمدن اور علم و ادب کی ترقی نے قاہرہ کو بغداد اور قرطبہ جیسے متمدن شہروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ العزیز نے ایک شاہی کتب خانہ قائم کیا جس میں تقریباً دو لاکھ کتابیں اسی کے عہد میں جمع کی گئیں۔ پھر اس کے جانشینوں نے مزید اضافے کئے یہاں تک کہ وہ بغداد اور قرطبہ کے بعد دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ بن گیا۔ کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ فاطمی حکمرانوں نے علوم و فنون کی ترویج پر بھی فیاضانہ توجہ دی اور اہل علم کی سرپرستی ہوتی رہی۔ قاہرہ ایک ایسا علمی مرکز بنا جہاں اہل قلم اور اہل علم کا اجتماع رہتا تھا۔ خلیفہ حاکم نے اپنے عقائد کی تعلیم و تبلیغ کے لئے ایک مخصوص ادارہ قائم کیا جو "دارالحکمہ" کے نام سے موسوم ہوا۔ فاطمی عہد کے مشہور علماء جنھوں نے تفسیر، فقہ، حدیث اور اسمٰعیلی عقائد پر کام کیا، بطور خاص نوازے گئے۔ ان علماء میں عبدالرحمٰن الرازی، ابو یعقوب، قاضی النعمان، جعفر ابن منصور اور ابن موسیٰ شیرازی جیسے علماء کا نام آتا ہے۔

مذہبی کتابوں کے علاوہ حکمت اور فلسفہ پر بھی توجہ دی گئی اور خصوصیت کے ساتھ ریاضی، علم طب، ہیئت، نجوم اور تاریخ پر خاطر خواہ کام ہوا۔ نجوم و ہیئت کا ماہر علی ابن یونس تھا جس نے رصد گاہ کو اعلیٰ معیار پر پہنچایا اور ایک گھڑی ایجاد کی جو لنگر کی جنبش کے ذریعے وقت بتاتی تھی۔ فاطمی عہد کا دوسرا بڑا سائنس داں علی الحسن ابن ہیثم تھا۔ اس کی کتاب "المناظر" کو یورپ میں بھی

بڑی قدر افزائی نصیب ہوئی۔ تیسرا اہم سائنس داں جس نے بصریات پر ایک اہم کتاب لکھی اور بڑا تحقیقی کام کیا وہ عمار ابن علی الموصلی تھا۔

فاطمی دورِ خلافت میں ادب و شاعری کو بھی خاصی ترقی ملی۔ کئی موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ مثلاً ممتاز کاتب اور ادیب ابوالحسن الشابشتی نے جغرافیہ کی ایک کتاب "الدیارات" لکھی۔

فاطمی حکمرانوں نے فنِ تعمیر میں بھی خصوصی دلچسپی ظاہر کی۔ متعدد عالیشان عمارتیں بنوائیں جن میں سب سے اہم جامع ازہر ہے جس کی محرابیں سنگِ مرمر اور کئی دوسرے قیمتی پتھروں سے بنوائی گئی تھیں۔ کل محرابیں تین سو اسی ستونوں پر قائم ہیں۔ اس کے منارے چوڑے اور مربع نما ہیں۔ جامع حاکم بھی عالی شان عمارت تھی جس کی تعمیر اینٹوں سے ہوئی تھی۔ اس کا گنبد بہت وسیع اور ایک ہشت پہلو عمارت پر قائم ہے۔ حاکم نے اسے ایک لاکھ روپے کے قیمتی مصلّے سے آراستہ کیا تھا۔ اس میں ایک جھاڑ تھا جس میں بارہ سو قندیلیں بیک وقت روشن ہوتی تھیں۔ فاطمی خلافت کا انتظامی ڈھانچہ وہی تھا جس کی مثالیں خلفائے عباسیہ کے دور میں ملتی ہیں۔ البتہ عقیدہ اور نظریہ الگ الگ تھا۔

اسپین میں اموی سلطنت

اسپین کو اموی خلیفہ ولید اول کے عہد میں فتح کیا گیا اور مروان ثانی کے عہد تک خلافت بنو امیہ کا ایک حصہ رہا۔ نظم و نسق ایک گورنر کے سپرد ہوتا تھا جس کی تقرری خلیفہ کی رضامندی سے افریقہ کے والی کو کرنا ہوتی تھی۔ خلافت بنی امیہ پر زوال آیا تو اسپین شدید خانہ جنگیوں سے دوچار ہوا۔ ادھر اموی خلافت کو بنو عباسیہ نے جب جڑ سے ختم کر دیا اور تمام سرکردہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو اموی شہزادہ عبدالرحمٰن بڑی ہوشیاری سے عباسیوں کی دار و گیر سے نکل کر افریقہ بھاگ گیا۔ وہاں اس کے ننھیالی بربروں نے اس کی حمایت کی اور ان کی فوج ظفر موج لے کر عبدالرحمٰن الداخل اسپین پر حملہ آور ہوا۔ فتح و نصرت نے اس کے قدم چومے اور اس طرح اسپین کی ایک نئی سیاسی تاریخ شروع ہوئی۔

عبدالرحمٰن اول (الداخل) اموی خلیفہ ہشام کا پوتا تھا۔ ۱۳۸ھ میں اس نے اسپین پر حکمرانی کا آغاز کیا۔ وہ دور اندیش، متحمل مزاج اور مدبر حکمراں ثابت ہوا۔ اس نے سب سے پہلے اسپین سے عباسی تحریک کو ختم کیا اور پھر اپنے آپ کو عوامی سطح پر لا کر لوگوں کے دل جیت لئے۔ وہ بے تکلف لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا۔ بیماروں کی عیادت کرتا اور جمعہ کی نماز خود پڑھاتا۔ اس کی تقریر دلکش اور شستہ ہوتی تھی۔ عیش و عشرت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خود عالم تھا اور علما کی قدر کرتا تھا۔ اس نے قرطبہ کی جامع مسجد کے علاوہ بہت سے مدرسے، شفاخانے، مہمان خانے اور سرکاری دفاتر بنوائے اور باغات لگوائے۔ اسپین میں عربی صنعت اور دستکاری کی بنیاد ڈالی۔ ۱۷۱ھ میں عبدالرحمٰن اول کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہشام اول تخت نشین ہوا۔ وہ ذاتی طور پر عابد و زاہد اور خدا ترس حکمراں تھا۔ اس کے عہد میں اسلام کو سربلندی حاصل ہوئی۔ وہ نیک سیرتی اور خدمتِ خلق میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مثال تھا۔ اس کے بعد حکم اول تخت نشین ہوا جو اپنے نیک سیرت باپ کے بالکل برعکس تھا۔ اس نے علما کو گرفتار

کر کے قتل کرا دیا۔ وہ عیش و عشرت کا بے حد دلدادہ تھا۔ حکم اول کے بعد اس کا بیٹا عبدالرحمٰن ثانی حکمراں ہوا۔ وہ کامیاب ناظم مملکت ثابت ہوا۔ ملک میں امن و امان رہا اور عمومی خوشحالی رہی۔ علوم و فنون کا سرپرست تھا۔ علما، شعرا، فلسفی اور اہلِ دانش اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ اس نے باغات لگوائے، سڑکیں بنوائیں اور رفاہ عامہ کے خاصے کام کیے۔ عبدالرحمٰن ثانی کے بعد اس کا بیٹا امیر محمد فرماں روا ہوا جو ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ پھر اس کا بیٹا امیر منذر اور اس کے بعد منذر کے بھائی امیر عبداللہ کا دور آیا۔ عبداللہ کے بعد اس کا پوتا عبدالرحمٰن ثالث آیا جس کا عہد سب سے زیادہ تابناک ہے۔ وہ کامیاب سپہ سالار، ماہر سیاستداں، بہترین ناظم اور عمارت سازی کا دلدادہ تھا۔ قصرِ زہرا اور مسجدِ قرطبہ کی تکمیل اس کے قابلِ ذکر تعمیراتی کارنامے ہیں۔ پھر اس کا بیٹا الحکم ثانی اور پھر اس کا بیٹا ہشام ثانی حکمراں ہوا جس کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ اس کی کمسنی کی وجہ سے ایک سرکاری ملازم محمد ابن ابی عامر اس پر چھا گیا اور عملاً ملک کا حکمراں بن بیٹھا۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنا لقب المنصور اختیار کیا۔ تاریخ میں وہ حاجب المنصور کے نام سے مشہور ہے۔ وہ کامیاب سیاستداں ثابت ہوا۔ لیکن اس کی موت کے بعد ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ خانہ جنگی شدت اختیار کر گئی اور آخرکار ۴۲۲ھ میں مستحکم حکومت کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال تک اسپین پر حکمرانی کی اور اس طویل عرصے میں مملکت کو برتری کے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں یورپ کا کوئی ملک اس زمانے میں نہ پہنچ سکا تھا۔ انھوں نے عالیشان عمارتیں بنوائیں جن کی عظمت کے آثار آج بھی قرطبہ، طلیطلہ، بطلیموس، اشبیلیہ اور غرناطہ میں پائے جاتے ہیں۔ قصرِ الحمرا کا ایک حصہ اب بھی موجود ہے جسے دیکھ کر لوگ آج بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے اسپین میں اسلام کے عادلانہ نظام کے تحت پست طبقوں کو بھی ترقی دی۔ سب کے جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ کیا گیا۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی حفاظتی دستے موجود رہتے۔ بڑے بڑے بند باندھ کر اتنی نہریں جاری کی گئیں کہ پورا ملک سرسبز و شاداب ہو گیا۔ گنا، چاول، کپاس اور زعفران کی کاشت سے یورپ والے مسلمانوں کے ذریعے ہی روشناس ہوئے۔ طرح طرح کے میوے اگانے اور سائنسی طریقوں سے انھیں محفوظ رکھنا مسلمانوں ہی سے سیکھا۔ صوبہ بلنسیہ میں انھوں نے جو بند تعمیر کرائے وہ آج بھی مسلمانوں کے علمی و فنی کمالات کے گواہ ہیں۔ آب رسانی اور آب پاشی کے لئے جو آلات استعمال کئے دنیا اس وقت ان سے ناواقف تھی۔

صنعت و حرفت میں ترقی کا یہ عالم تھا کہ ہر قسم کے کارخانے قائم تھے جن میں ہزاروں کاریگر کام کرتے تھے۔ روزانہ کے استعمال کی چیزیں، اسلحہ جات، آرائشی سامان اور طرح طرح کے آلات کثرت سے تیار ہوتے تھے۔ کاغذ سازی کا فن مسلمانوں ہی نے یورپ پہنچایا۔ بڑے بڑے بحری جہاز سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے بنائے۔ زرعی اور صنعتی ترقی سے تجارت کو بھی بے پناہ فروغ ملا۔ برآمد کے لحاظ سے اسپین سرِفہرست رہا۔ سب سے قیمتی عطیہ جو اسپین کے مسلمانوں نے مہذب دنیا کو دیا وہ علمی سرمایا تھا جس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ضخیم کتابیں بھی ناکافی ہیں۔ ملک کے ہر حصے میں کتب خانوں، مدرسوں، جامعات اور علمی مرکزوں کا جال سا پھیل گیا۔ یہی وہ مراکز تھے جو مدتوں یورپ کی دھندلی فضاؤں میں علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کا نور بکھیرتے رہے۔ سائنسی تجربات کے لئے جگہ جگہ رسدگاہیں موجود تھیں۔ قرطبہ میں علما، فضلا اور اہلِ دانش کا ہجوم رہتا تھا۔ تمام دینی و دنیاوی علوم پر کتابیں لکھی گئیں اور بے شمار ماہرین پیدا ہوئے۔ فنِ جراحی کا موجد ابوالقاسم اندلس ہی کا رہنے والا تھا۔ معروف علمی شخصیات میں ابنِ رشد، محمد ابنِ جابر، ابوبکر محمد، ابو محمد مکی اور علامہ ابن خلدون بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ مشہور فلسفی اور سائنس داں ابوالقاسم نے پتھر سے شیشہ بنانے کی ترکیب دریافت کی۔ وقت معلوم کرنے کے لئے ایک آلہ ایجاد کیا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے پروں کا ایسا لباس تیار کیا تھا جسے پہن کر ہوا میں اڑا جا سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ علم و ادب کے تمام شعبوں پر اسپین کے مسلمانوں کا بہت بڑا تہذیبی احسان ہے۔

ظہورِ اسلام اور تاریخِ تہذیب

اسلام دنیا کا سب سے پہلا اور ہمہ گیر تہذیبی انقلاب ہے۔ اس کے ارتقائی دور کی پوری تفصیل تاریخ میں موجود ہے۔ تاہم اسلام سے قبل مختلف خطوں مثلاً ہندستان، چین، ایران، یونان، روم اور عرب کے لوگ جن خیالات و افکار کے حامل تھے ان میں انسانی قلب و ضمیر کو منور کرنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔ انسانوں کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں، مصلحوں اور مفکروں نے ہدایت کے جو چراغ مختلف قوموں اور ملکوں میں جلائے تھے وہ سب کے سب چھٹی صدی عیسوی کے آخر تک بجھ گئے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے اوائل میں اسلام کے نام سے عظیم الشان تہذیبی انقلاب کی وہ کرن پھوٹی جس نے تاریکی اور جہالت کے پردے چاک کر دیے۔

اسلام پھیلنے کے بعد تاریخِ عالم میں عظیم تہذیبی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تاریخ ایک نئے موڑ پر آگئی۔ فتوحات کے ساتھ علم و ادب اور تہذیب و شائستگی کے وہ مظاہر سامنے آئے جو رہتی دنیا تک نوعِ انسان کے لیے چراغِ راہ کا کام دیتے رہیں گے۔

تاریخ تہذیب کا پہلا مرحلہ المغازی، سیرت، روایات اور الاخبار سے شروع ہوتا ہے۔ بقول ایک مغربی مفکر "حضرت محمدؐ نے تہذیبِ اسلامی کے وہ بیج بوئے جن سے تاریخ کی کھیتی لہلہا اٹھی اور تاریخ میں تہذیبی دلچسپی پیدا ہوئی۔ آپ کے خیالات و ارشادات سے ایک عظیم تاریخ نے جنم لیا۔ آپ کے اعمال و کارناموں سے وحدتِ انسانی کے راستے ہموار ہو گئے۔"

اسلام کے ابتدائی عہد میں جن حضرات نے قابلِ قدر تحریری کارنامے انجام دیے ان میں ابومخنف، عوامہ بن الحکم اور سیف بن عمر پیش پیش نظر آتے ہیں اور ان کے پیش رو ابوالحسن المدنی ہیں جو اسناد کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ایک ہی واقعہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات

مل سکیں۔ تو اس سے اصل واقعہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ابوالحسن علی المدنی نے اپنی تاریخ نویسی کا آغاز زمانۂ ماقبل اسلام سے کیا اور تیسری صدی ہجری کے ربعِ اول یعنی ۲۲۵ ہجری تک کے تہذیبی و تمدنی واقعات قلمبند کیے۔ انھوں نے حضور اکرمؐ کی سیرت، ازدواجِ مطہرات، صحابۂ کرام، عہدِ نبوی کے مختلف وفود، حضورؐ کے میثاق، حضورؐ کے عسکری اور انتظامی ڈھانچے، حضورؐ کے دشمنوں اور اس عہد کے مختلف قصوں پر دو سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ عروہ بن زبیر، ابنِ اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابنِ سعد، الیعقوبی، بلاذری، طبری، المسعودی، الکبری، السہاوی اور دیگر معروف مسلم مورخین نے چھٹی صدی ہجری تک جو کارنامے انجام دیے اور چھٹی صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک جن بلند پایہ اہلِ قلم نے تحقیقی تصانیف یادگار چھوڑیں وہ ہمارا قابلِ قدر تہذیبی سرمایہ ہیں۔

مسلم محققین نے اسلام کی عالمگیر تحریکِ تہذیب کو جس عرق ریزی سے فروغ دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یوں تو طلوعِ اسلام کے بعد ہی یہ سلسلہ شروع ہوا تاہم تیسری اور پھر چوتھی صدی ہجری میں تو مسلمان مورخین کے کارنامے پوری مہذب دنیا میں مشہور ہو گئے۔ خصوصاً چوتھی صدی ہجری کے مسلم مورخین کے کارناموں کی آفاقیت اور جامعیت کی آئینہ دار ہے۔ اس دور میں ایسے مورخین پیدا ہوئے جن کی تصانیف آج بھی جدید سائنسی دور کے تحقیقی معیاروں پر پوری اترتی ہیں۔ پھر چوتھی سے چھٹی صدی ہجری تک کے دور میں کافی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اس دور کی تاریخِ تہذیب میں عالمی سیاست کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ابنِ سحاوی اور ہلال الصہب کی قابلِ اعتماد کتابیں اس کا واضح ثبوت ہیں۔ اسی دور میں ایک یہ بھی تبدیلی رونما ہوئی کہ ماضی میں تدوینِ تاریخ مذہبی قدروں کو مدِ نظر رکھ کر کی جاتی تھی مگر اس دور میں اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں کو بھی سامنے رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ الرازقی عبداللہ بن الحکم کی کی تاریخِ مکہ اور تاریخِ مصر اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اسی دور میں سوانح نگاری کا فن بھی عروج پر پہنچا۔ شخصیات اور ان کے کرداروں میں اسناد کے رواج کو منسلک کیا گیا اور زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو جلی سرخیوں سے ظاہر کیا گیا۔ سوانح عمریوں کو ماہ و سال کی تخصیص کے ساتھ ترتیب دیا گیا۔ مثلاً خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی باقاعدہ سوانح عمری اسی دور میں مرتب ہوئی۔ الخطیب البغدادی نے چودہ ابواب پر مشتمل اپنی خودنوشت ترتیب دی اور وہ ۴۶۳ھ تک زندہ رہے۔

چھٹی صدی کے شروع میں عبارت آرائی پر زیادہ زور دیا گیا اور اس وقت کی درباری دنیا

میں پرتکلف اندازِ تحریر بہت مقبول ہوا۔ اسی زمانے میں العتبی نے سبکتگین اور محمود غزنوی کے حالات "الکبیر" نامی کتاب میں لکھے جو فارسی میں ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ بھی اسی دور میں منظرِ عام پر آیا۔

چھٹی صدی ہجری کے اختتام پر فارسی میں کئی اہلِ قلم نے تاریخِ تہذیب پر طبع آزمائی کی کیونکہ چوتھی صدی میں ترکوں کی جگہ ایرانی حکمراں ہو گئے تھے انھوں نے فارسی زبان وادب کی سرپرستی کی اور عربی کو نظر انداز کر دیا۔ اس عہد کے مشہور مصنف محمد بن علی الرواقدی، الہمدانی، ابن الجوزی، الیشیابی اور فخر الدین مبارک شاہ ہیں۔

چھٹی صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک انسانی زندگی کے تمام پہلو تاریخِ تہذیب کے موضوعات بن گئے۔ اس عرصے میں شخصیات کے مطالعے کے ساتھ ساتھ قوموں کے عروج و زوال، ملکوں کی شکست اور ریخت، تہذیبی، ثقافتی رسم و رواج اور سیاسی، معاشی، مذہبی اور معاشرتی کیفیات کو بھی ضابطۂ تحریر میں لایا گیا۔ گویا جامعیت اور کاملیت کو معیار ٹھیرایا گیا۔ عزیز الدین ابن اثیر اور تاج الدین الاعباسی جو عراق کے بلند پایہ مصنف تھے اور جنھوں نے عربی میں کتابیں لکھیں۔ مصر میں ابن طقطقی، ابن ابوالذیحان، تقی الدین المقریضی، علی بن داؤد الجوہری اور جلال الدین السیوطی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب خلیفہ مامون الرشید نے علم و فن کی بھرپور سرپرستی کی۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخِ عالم مسلمانوں ہی کے تاریخی سرمائے کی مرہونِ منت ہے اور مسلمانوں نے ان ابتدائی صدیوں میں اقوامِ عالم کی قیادت کی جب ساری مغربی دنیا جہالت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اسلام کا مذہبی نظام

طلوعِ اسلام سے پہلے دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں شرک و بت پرستی رائج تھی۔ متعدد معبود تھے جن کی حسبِ ضرورت پرستش ہوتی تھی۔ شجر پرستی، حجر پرستی، عناصر پرستی، نجوم پرستی، حیوان پرستی اور انسان پرستی۔ غرض ہر قسم کی مشرکانہ پرستش نام نہاد مہذب ملکوں اور قوموں کا معمول بنی ہوئی تھی، مگر ایک معبودِ حقیقی کی پرستش اور عبادت کہیں نہ تھی۔

قوموں میں یہود و نصاریٰ دو ایسی قومیں ضرور تھیں، جنھیں موحد ہونے کا دعویٰ تھا مگر صورتِ حال یہ تھی کہ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے بعثت نبوی تک کسی نہ کسی نوعیت کے شرک اور بت پرستی میں مبتلا رہے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کو ہلاک نہیں کیا جیسا کہ خداوند نے ان کو حکم دیا تھا بلکہ ان قوموں سے مل گئے اور ان کے بتوں کی پوجا کرنے لگے۔

یہود کے نزدیک خدا کا تصور اتنا دھندلا تھا کہ عہد نامہ عتیق کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کو اخلاقی اصول سکھائے اور اسے مہذب بنانے کی کوشش کی وہ انسانی قربانی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے سمجھا بجھا کر اسے باز رکھا۔ نعوذ باللہ۔

نصاریٰ تثلیث کے قائل تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور ان کے بت بنا کر کلیساؤں میں نصب کرتے تھے۔ بعض فرقوں نے حضرت مریم کو مادرِ خدا تصور کیا اور ان کے بھی بت بنائے گئے۔

حضور اکرمؐ نے پہلی کاری ضرب شرک و بت پرستی پر لگائی۔ مخلوق پرستی کی تمام صورتوں کو ختم کر کے خدائے واحد کی پرستش کی طرف رہنمائی فرمائی۔ دینِ اسلام میں داخل ہونے کی اولین شرط کلمہ توحید پر ایمان لانا قرار دیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو شرک و بت پرستی کی تمام لعنتوں سے مبرا کیا۔ اسی کو معبودِ حقیقی ماننے کی تبلیغ و تلقین کی اور اسی کی عبادت کرنے کو احسن و افضل طریقہ سمجھایا۔

آخرت کا عقیدہ اکثر مذاہب میں تو پایا ہی نہیں جاتا تھا اور جہاں کہیں تھا بھی تو اتنا مبہم اور غیر واضح کہ آج تک کوئی اس کا صحیح مفہوم متعین نہیں کر سکا۔ بعض مذاہب آواگون یعنی تناسخ کے قائل تھے اور عقیدۂ آخرت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہود و نصاریٰ میں حیات بعد الموت کا عقیدہ پایا جاتا تھا اگرچہ یہود کے نزدیک آخرت کی تمام نعمتیں ان کے لئے مخصوص تھیں اور نصاریٰ کے حضرت عیسیٰؑ نے سولی پر چڑھ کر عیسائیوں کے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ لہٰذا مرنے سے پہلے کسی پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لینا نجات کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیدۂ آخرت کو واضح الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا کہ تمام تفصیلات اور عقلی توجیہات سامنے آگئیں یعنی ہر انسان کے تمام اعمال قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے اور ان کے مطابق جزا و سزا ملے گی۔ اس دن اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہ کوئی شفاعت کر سکے گا اور نہ کوئی عذر کام آئے گا۔

اسلام دین فطرت ہے اس لئے اس کا تمام تر مذہبی نظام بھی فطری اصولوں سے ہم آہنگ ہے۔ مثلاً عقیدۂ آخرت، جس نے دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا اور جیسا کہ اصول فطرت ہے کہ جو کچھ بویا جاتا ہے اسی کی فصل کاٹی جاتی ہے۔ اسلام نے دنیا کی تمام نعمتیں انعامات اخروی کے تابع کر دیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نفس پرستی، ہوس رانی اور خود غرضی کی بجائے ایثار و ہمدردی، اخوت و مساوات اور ایسے ہی اچھے اعمال کی ترغیب ملی۔

دنیا کے تمام مذاہب میں مذہب کی تفہیم و تعلیم کے لئے ایک مخصوص طبقہ موجود رہا جو اجارہ دار بنا رہتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر عبادت گاہیں عیاشی، لوٹ کھسوٹ اور بدکاری کے اڈے بن گئیں۔ اسلام نے اس طرح کے کسی طبقے کی گنجائش نہ رکھی۔ حضور اکرمؐ نے بتایا کہ اللہ تمہاری رگِ گلو سے بھی قریب تر ہے۔ وہ اپنے ہر بندے کی پکار ہر وقت سنتا ہے۔ اس تک رسائی پانے کے لئے کسی وسیلے کی ضرورت نہیں۔ بندۂ عاجز کے مضطرب قلب کی کیفیت اور اس کی پکار اللہ تعالیٰ کے دامنِ رحمت کو فوراً وسیع کر دیتی ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ براہ راست تمام اہل ایمان اور تمام انسانوں کو مخاطب کرتا ہے تاکہ ہر فرد بذاتِ خود اس کے احکام اور اس کے فضل و کرم کو سمجھے اور اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اہلِ علم اور فہم دین رکھنے والوں سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح رسولِ پاکؐ نے دینِ اسلام کو ان تضادات و فسادات سے محفوظ رکھنے کا انتظام کیا جو دوسرے مذاہب میں مخصوص طبقے کی اجارہ داری سے پیدا ہوتے رہے تھے۔ ساتھ ہی آپ نے ہر شخص کے لئے سیدھے سچے انداز سے دعا کرنے اور مغفرت کا طالب ہونے کے دروازے کھول دیے۔

دنیا کے تمام مذاہب نے اظہارِ بندگی کے لئے کچھ طریقے مقرر کئے۔ کسی نے ناچ گانے، کسی نے چڑھاوے چڑھانے اور کسی نے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جانے کو عبادت میں داخل کیا۔ کسی نے نفس کشی، تجرّد کی زندگی، جسمانی ایذارسانی اور مذہبی پیشوا کے وعظ میں شرکت کرنے کو قربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھا۔ مگر اسلام نے اظہارِ عبودیت کے لئے نماز ادا کرنے کا باوقار طریقہ بتایا جس میں رکوع و سجود اور قیام و قعود کا منظم و منضبط انداز موجود ہے۔ نماز سے پہلے وضو ایک ایسا عمل ہے جو ہاتھ پاؤں اور چہرے کی طہارت اور تازگی کا سبب بنتا ہے اور نمازی اپنے منہ کو پاک صاف کر کے اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتا ہے۔ روزے کی تعلیم کے فوائد سب پر ظاہر ہیں۔ جہاد وہ عمل ہے جو ہر گھڑی حق کے لئے جینے اور حق کے لئے مرنے کا درس دیتا ہے۔ زکوٰۃ کا نظام اپنے مال میں خدا ترسی اور انسانی ہمدردی و رواداری کے طور پر اجتماعیت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ اسی طرح حج ملتِ اسلامیہ کا ایسا عظیم الشان اجتماع ہے جو خانۂ خدا میں سارے مسلمانوں کو حاضری دینے، سربسجود ہونے اور ایثار و قربانی کا درس دیتا ہے۔ غرض یہ کہ اسلام کا پورا مذہبی نظام اعلیٰ اخلاقی قدروں اور عمومی فلاح و بہبود سے عبارت ہے اور اس کا حاصل حصول یہ ہے کہ

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اسلام علمِ معرفت

اسلام صرف مذہب ہی نہیں ایک اعلیٰ نظامِ معاشرت اور گہوارۂ تہذیب وثقافت ہے۔ ایسی تہذیب و ثقافت جس میں اخلاقی و روحانی قدروں کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اور یہی نفضیلت اسلامی تہذیب کو عالمِ انسانیت میں افضل و برتر حیثیت عطا کرتی ہے۔

انسان کی دسترس میں جس قدر علم ہے۔ اسلامی علم معرفت میں اس کی چار قسمیں ہیں:

پہلی قسم وہ ہے جس میں عالمِ حواس کا ادراک حواسِ خمسہ اور قوت استدلال سے کیا جاتا ہے۔ اسے ہم عمومی اصطلاح میں سائنس یا حکمت کہتے ہیں۔ اس کی علامت پانی ہے کیونکہ وہ ایک صاف ستھری بہنے والی شے ہے۔ دوسری قسم وجدانی علم کی ہے جو قوتِ متخیلہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں آرٹ، ادب اور فلسفہ شامل ہیں۔ فلسفے سے مراد علم تفکر ہے اور علامہ نصیر الدین طوسی نے اس کی علامت دودھ کو قرار دیا ہے جو ایک قوت بخش غذا ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جس میں انبیائے کرام اور عارفوں کے فوق الحسی تجربات و تعلیمات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اسے حکمتِ الٰہیہ کہتے ہیں جیسا کہ لفظ حکمت سے ظاہر ہے، یہ بھی ایک طرح کا فلسفہ ہے اور اس کی علامت شہد ہے جو دودھ سے زیادہ قوی اور لذیذ ہوتا ہے۔ علم کی چوتھی قسم وہ ہے جس میں روحانی ادراک کی مخفی قوتوں کو بیدار کر کے طبعی یا ذہنی قویٰ کے وسیلے کے بغیر فوق الحسی حقیقت کا براہ راست تجزیہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً الہام و کشف۔ اس کی علامت نصیر الدین طوسی نے بادہ کو قرار دیا ہے یعنی روحانی سرور۔

روحانی تجربے کی اعلیٰ ترین مثال تو مسلمانوں کے نزدیک وہ ہے جسے لیلۃ القدر کہتے ہیں۔ جب حضورِ اکرمؐ پر حضرت جبرئیلؑ پہلی بار قرآن مجید لائے تھے اور دوسری شبِ معراج ہے جب رسولِ پاکؐ کو مسجدِ اقصیٰ لے جایا گیا اور اس کے بعد وہ بلند ترین روحانی سفر آن کی آن میں طے ہوا۔

دراصل روحانی ذکر و فکر کے دو بڑے ماخذ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کلام جو رسول کریمؐ پر نازل ہوا اور حدیث شریف یعنی حضورؐ کے اقوال جو صحابہ کرامؓ کے ذریعے ہم تک پہنچے۔ اسلامی تصوف میں خاص طور پر قرآن مجید کی تفصیلی آیات پر توجہ دی جاتی ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا "اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ سوچیں سمجھیں۔"

حدیث شریف میں ایسی احادیث بھی ہیں جن میں متکلم خود ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ اسی لیے ایسی حدیث کو حدیثِ قدسی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیثِ قدسی کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے "میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہا۔ لہٰذا میں نے دنیا کی تخلیق کی۔" یہ مقدس الفاظ شیدائیانِ حکمت کی تعلیم میں خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ روحانی ذکر و فکر کا اصول مسلمان صوفیا کی بے شمار تحریروں اور اقوال و ملفوظات کے ذخیروں سے بھی عام مسلمانوں تک پہنچا اور اس طرح اسلامی تصوف نے ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی۔ اس تحریک کا فیضان یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی ممالک میں اشاعتِ اسلام کو تقویت ملی۔

علم و عرفان کی اسلامی تحریکِ تصوف نے شریعت کے ساتھ طریقت کی اصطلاح کو عام کیا۔ طریقت یہ ہے کہ شرعی مسائل کو زندگی کی گہرائیوں کے ساتھ دیکھا اور سمجھا جائے تاکہ روحانی ذکر و فکر میں روحِ قرآنی اور احادیثِ مبارکہ کا حقیقی جوہر شامل ہو۔ اس سلسلے میں بلند پایہ صوفیا کرام نے جو تصنیفی اور تالیفی کارنامے انجام دیئے ان کی اہمیت کو ساری مہذب اور علم و عرفان کی شیدائی دنیا نے تسلیم کیا ہے۔ مثلاً محی الدین ابن عربی جو اندلس میں پیدا ہوئے اور ۶۳۷ء میں دمشق کے مقام پر وفات پائی۔ انھوں نے ۲۷۰ تصانیف کی فہرست مرتب کی۔ ان کی طویل کتاب "فتوحاتِ مکیہ" ہے۔

مسلمان صوفیائے کرام کا نقطۂ نظر وحدتِ ادیان رہا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم اس کے دلی خیالات تک سے واقف ہیں اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی قریب ہیں۔" رسول اللہؐ کی ایک حدیثِ مبارکہ ہے۔ "جو شخص اپنے نفس کو پہچانتا ہے وہ اپنے رب کو بھی پہچانتا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے وجود کی مخفی گہرائیوں ہی کے ذریعے فوقِ حسی حقیقت کی معرفت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن یہ معرفت طبعی یا ذہنی قویٰ کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتی۔ تیسری صدی ہجری کے مشہور صوفی بزرگ حضرت ذوالنون مصری کا قول ہے "اللہ تعالیٰ کو وہی شخص

بہتر جان سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ وہ اس کے بارے میں کم جانتا ہے۔"

فوق حسی حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لیے ادراکِ روحانی کی تربیت ضروری ہے۔ اسے چشمِ قلب کہتے ہیں؛ دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب   آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

بے شک عرفانِ حقیقت انسان اپنی مرضی اور ارادے سے حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ اللہ کی دین ہے جسے چاہے بخش دے۔ قلب یا نفسِ روحانی صرف اپنی روح کو منعکس کرتا ہے۔ بقول حضرت فریدالدین عطارؒ "روح بدن میں مخفی ہے اور نور روح میں۔" حلاج منصور نے کہا تھا "میں نے اپنے اللہ کو چشمِ قلب سے دیکھا ہے۔" طریقت میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے ساتھ ساتھ مجاہدے اور شرعی عبادات کو بھی بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ حدیث قدسی ہے "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے جو کچھ فرض کیا اس پر عمل کر کے میرا مومن بندہ مجھ سے قریب ہو سکتا ہے۔ نوافل کی پابندی کر کے بندہ میرے قریب اور محبوب ہو سکتا ہے۔ جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو جو کچھ وہ سنتا ہے، میں سنتا ہوں۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے، میں دیکھتا ہوں۔ میں اس کے ہاتھ سے پکڑتا ہوں اور پاؤں سے چلتا ہوں۔"

حضور اکرمؐ کا فرمان ہے "ہر چیز کی صفائی ہے اور دل کی صفائی ذکرِ الٰہی ہے۔" دل کی صفائی اور ذکرِ الٰہی کے لیے صوفیائے کرام نے بڑے مجاہدے کیے۔ خلقِ خدا کو صدق و صفا کی تعلیم و تربیت دی اور تحریکِ تصوف کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ برصغیر میں غیر مسلموں کو دائرہ اسلام سے وابستہ کرنے کا سہرا حقیقتاً بلند پایہ صوفیائے کرام کے سر ہے۔

اسلام کا نظامِ تعلیم

اسلام میں حصولِ علم کو ایک مقدس فریضہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ بغیر علم کے انسان حیوانوں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم میں قرآنِ حکیم کا علم ایک نہایت ہی خوبصورت مرقع ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو دعوتِ مطالعہ دیتی ہے، عقل و اسرار کو ہم آہنگ کرتی ہے۔ تخلیقِ حیات و کائنات پر غور کرنے والوں اور عدل و انصاف کرنے والوں کی توصیف کرتی ہے۔ قرآن کا عطا کردہ علم انسان کو ایقان کے ساتھ راہِ نجات کا شعور بھی دیتا ہے۔ وہ انسان کو اشیاء کے ادراک کے علاوہ اپنی معرفتِ نفس عطا کرتا ہے اور دوسروں کی حیثیت تسلیم کرنے کی ہدایت بخشتا ہے۔ اس کی حقانیت اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ ترقی ایک مسلسل عمل کا نام ہے اور اس کے مقاصد و انجام کا تعین ان فوائد ہی سے کیا جائے گا جو اس سے انسانیت کو حاصل ہوں گے۔

اسلام میں علم، تعلیم اور تعلیم کی اصلاحات بار بار دہرائی گئی ہیں جن سے علم اور اس کی ترویج کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ علم کا انسانی معاشرتی ذمہ داریوں سے بڑا گہرا تعلق ہے اس اعتبار سے اسلام میں اساتذہ کا کردار تکنیکی کم اور اخلاقی زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا استاد اور شاگرد کے تعلق کا ہونا ضروری ہے۔ عہدِ نبوی میں بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے والے قیدیوں تک کو رہا کر دیا جاتا تھا اور مسجدِ صفہ جس کی تعمیر ہجرت کے فوراً بعد مدینہ منورہ میں ہوئی، پہلی اسلامی درسگاہ تھی۔

اسلام کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ایمان اور علم کو باہم ملا کر الوہی اور انسانی علوم کی حفاظت کی اور انسانی علم پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ دینِ اسلام کی منطق میں علم کا مقصد یہ ہے کہ علم حق و باطل میں تمیز سکھاتا ہے اور اندھیرے سے اجالے میں لاتا ہے۔ اسلام کی اصل خوبی یہ نہیں کہ وہ علم کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے بلکہ وہ حصولِ علم کی لامتناہی تلاش کا قائل ہے۔ اسلام علم کو ایک ایسی مشترکہ تہذیبی میراث

قرار دیتا ہے جس پر کسی انسان کی اجارہ داری نہیں۔ اسلام کی نظر میں وہ نظام انتہائی ناپسندیدہ ہے جو علم کے استعمال کو محدود کر دے یا اس کی ترویج کو روکے۔

علم کی طلب کس قدر ضروری ہے اس کا اظہار رسول پاکؐ کی دعائے مبارک سے ہوتا ہے "اے میرے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما"۔ ارشادِ ربانی ہے "کیا عالم اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں"۔ قرآن حکیم یہ حکم دیتا ہے۔ "اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کرو"۔

سن ہجری کی ابتدائی صدیوں میں مدرسہ اسلامی دنیا کی یونیورسٹی ہوا کرتا تھا۔ اس کا نصاب تعلیم زیادہ تر قرآن و حدیث اور دینیات و قانون پر مشتمل ہوتا تھا لیکن علم کی دیگر اقسام قواعدِ زبان، ادب، ریاضی اور طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مدرسوں میں تعلیم مفت تھی۔ طلبہ کو بیت المال اور وقف سے امداد ملتی تھی انھیں تعلیمی وظائف اور قیام و طعام کی سہولتیں حاصل تھیں۔ استاد منبر پر بیٹھ کر درس دیتا تھا اور طلبہ اس کے گرد حلقے کی صورت میں بیٹھتے تھے۔ زیادہ تر مساجد کو درسگاہوں کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ درس و تدریس ایک مقدس اور لامتناہی سلسلہ تھا۔ مقصدِ تعلیم مادی منفعت اور پیداواری عمل کی تقویت نہ تھا بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کی بجا آوری نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کا اساسی مقصد تھا۔

مشہور کہاوت ہے کہ وہ علم جو برتا نہ جائے بارش سے خالی بادل کی طرح ہوتا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم محض سطحی مفادات کے لئے حصولِ علم پر زور نہیں دیتا بلکہ علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے مفید ہو اور انسانیت کی روحانی، ذہنی اور مادی ضروریات کی اس سے تکمیل ہوتی ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سائنس اور ٹکنالوجی کو ایسے عملی اصولوں کے مطابق ہونا تھا جن سے انسان کی قیمت اور اس ورثے کی حفاظت ہو سکے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنے نائب اور حامل وحی کی حیثیت سے عطا کئے۔ انسان نے یہ ذمہ داری قبول کی جسے اٹھانے سے پہاڑ بھی سہم گئے تھے۔

اسلامی معاشرے میں عالم پہلے متعلم ہوتا تھا اور پھر کہیں کسی علم میں ماہرِ خصوصی۔ اسلام کے تعلیمی خاکے میں استاد کا مقام اس قدر اہم ہے کہ قرآن کریم نے اسے دورانِ جنگ لڑائی میں حصہ لینے سے مستثنیٰ قرار دیا۔ مسلمانوں کے لئے استاد ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ وہ تربیت یافتہ ذہن کا مالک ہوتا تھا اور تربیت سے عاری علم ایسا ہے جیسے بغیر ایندھن کے آگ ہو اور ادب سے عاری علم ایسا ہے جیسے بغیر جسم کے صرف دماغ ہو۔ استاد اپنی تعلیمات کا چلتا پھرتا نمونہ ہوتا تھا۔ جو پیغام وہ دیتا تھا اس

پر وہ خود بھی عمل کرتا تھا۔ اس کے نزدیک تعلیم ایک معاشرت آموز عمل تھا ۔

اسلامی نظامِ تعلیم کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں علم منتقل کرنے کے طریقے کو اتنا ہی اہم سمجھا گیا جتنا خود علم کو۔ استاد اپنے شاگرد کو اولاد جیسا تصور کرتا تھا۔ اپنے شاگردوں کو تعلیم دے کر اسے روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ تعلیم کو ناکامی کا کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوتا تھا اور اس نظام کے تحت اساتذہ کے لئے ہر شاگرد کی قدرتی صلاحیت اور اس کی ذہنی رفتار کا اندازہ کرنا آسان تھا۔ ادھر شاگرد سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اس سے کئے جانے والے سوالات پر غور کرے۔ وہ مکمل طور پر خود کو حصولِ تعلیم کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ شاگرد کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ عملی طور پر علم کی قدر و قیمت کا جائزہ لے اور حصولِ علم کی راہ میں حائل مشکلات سے ہمت نہ ہار بیٹھے۔ اپنے استاد کا احترام کرے تاکہ استاد اسے دل و جاں سے عزیز رکھے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ استاد اور شاگرد کے درمیان عالمانہ گفتگو اور معلوماتی بحث ہوتی تھی۔

مدرسوں کا قیام مملکت کے نظریات کی تکمیل کے لئے نہیں تھا بلکہ اولین مقصد کارِ خیر تھا۔ مدرسے اقامتی تھے۔ قیام و طعام کی ذمہ داری اسلامی مملکت کی تھی۔ اساتذہ کو پابندی سے تنخواہ ملتی تھی لیکن مملکت مدرسے کی خود مختاری یا علمی آزادی میں مداخلت نہیں کرتی تھی ۔

اساتذہ اور طلبہ شروع میں مسجد ہی کو درس و تدریس کا مرکز تصور کرتے تھے ۔ بہ حیثیت ادارہ مدرسوں کا جداگانہ قیام پانچویں صدی ہجری میں ہوا مگر اس سے پہلے دارالحکمت وجود میں آ چکے تھے ۔

شاگردوں میں ایسے بچے شامل ہوتے تھے جنھیں مذہبی اور معاشرتی زندگی اختیار کرنی ہوتی تھی۔ ان میں دست کار، اہلِ حرفہ، ماہرِ قانون بننے والے اور کسی بھی حیثیت سے اسلامی معاشرے کا مفید شہری بننے کے خواہاں ہوتے تھے ۔

اسلامی نظامِ تعلیم میں کتب خانوں یعنی لائبریریوں کو بڑی اہمیت دی گئی تھی اور بتدریج علوم و فنون کی کتابوں میں گرانقدر اضافہ ہوتا رہا تھا ۔

مسلمانوں کا عقیدۂ تخلیق وارتقاء

مشرقی تہذیبوں کے بارے میں اہلِ مغرب نے خاصی کتابیں لکھیں، لیکن مشرقی زبانوں کا خزانہ کچھ خالی خالی سا نظر آتا ہے خصوصاً عصرِ حاضر میں کوئی قابلِ قدر تحقیقی کام نہیں ہوا۔ تقریباً پچیس برس پہلے سید سبطِ حسن نے بڑی جگرکاری سے ایک تحقیقی کتاب "ماضی کے مزار" لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس میں انسان اور انسانی تہذیب کے عقیدۂ تخلیق پر بھی کئی تحقیقی مقالے ہیں۔ مثلاً اہلِ بابل، قدیم مصریوں، قدیم چینیوں، آریاؤں، کنعانیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کا عقیدہ و نظریۂ تخلیق اور سب سے اہم مسلمانوں کا عقیدۂ تخلیق۔ بقول سبطِ حسن " اسلام کے عقیدۂ تخلیق سے ہر کلمہ گو تھوڑا بہت ضرور واقف ہے۔ جن لوگوں نے قرآن و حدیث کا بغور مطالعہ کیا ہے ان کو تفصیلات کا بھی علم ہوگا ۔"

تاریخی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ عقائد کے اعتبار سے عرب میں پانچ قسم کے قبائل آباد تھے۔ اول مشرکین جو اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کو مانتے اور ان کے بتوں کی پرستش کرتے۔ دوسرے کفار جو اللہ کو نہیں مانتے تھے بلکہ اپنے قبائلی بتوں کو پوجتے تھے۔ تیسرے یہودی جو اہلِ کتاب ہونے پر فخر کرتے اور اپنے خدائے واحد یہودہ کی عبادت کرتے تھے۔ چوتھے نصاریٰ جو زیادہ تر غاروں اور صحراؤں میں راہبانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ پانچویں گروہ کو اہلِ مکہ حنیف کہتے تھے، یہ لوگ فقط اللہ کی عبادت کرتے تھے اور مکہ کے دوسرے خداؤں کو نہیں مانتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل حنیف ہی تھے۔

مکہ معظمہ بلکہ پورے حجاز میں غالب اکثریت مشرکین کی تھی جو دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے لیکن سب سے بڑا معبود اللہ ہی تھا۔ آثارِ قدیمہ سے برآمد ہونے والی چیزوں میں صفا اور یمن سے پانچویں صدی قبل مسیح کے وہ پتھر بھی ملے ہیں جن پر اللہ کا نام کندہ ہے۔ یعنی عرب میں اللہ کی عبادت کا رواج حضرت ابراہیمؑ یا اس سے بھی پہلے رہا ہوگا۔ اِلٰہ تمام سامی قوموں میں خدا کا نام تھا۔ قرآن حکیم میں

اس طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔ مشرکین کے مطابق اللہ کی تین بیٹیاں تھیں، اللات، عزیٰ اور مناۃ۔ اللات سورج کی دیوی تھی اس کا بت طائف میں تھا۔ عزیٰ کا بت مکے کی مضافاتی بستی نخلہ میں تھا۔ مناۃ مکہ اور یثرب کے درمیانی اور ساحلی علاقے کی دیوی تھی، لیکن قریش کا نہایت بزرگ بت معبود کے طور پر ہُبل تھا جو کعبہ کے اندر کنوئیں کے پاس نصب تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس تخلیق کائنات کی ایک مکمل داستان موجود تھی۔ آثارِ قدیمہ سے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا جس سے قریش یا دوسرے قبیلوں کے عقیدہ تخلیق کا علم ہو سکے۔ البتہ پروفیسر حِتّی نے عربوں کی تاریخ میں لکھا ہے کہ وہ اللہ ہی کو ہر چیز کا خالق مانتے تھے۔

قرآن کریم نے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا واضح اعلان کیا بلکہ کلمۂ شہادت کی پہلی شرط ہی لاالٰہ الا اللہ رکھ دی اور اہلِ مکہ کو نہ صرف دوسرے خداؤں کی عبادت ترک کرنے کی تلقین کی بلکہ یہ بھی وضاحت کر دی کہ کائنات کا حقیقی و تنہا خالق و مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

قرآن حکیم میں ہے کہ ہر شے کو عدم سے وجود میں لانے والا اللہ تعالیٰ ہر شے اور ہر عمل پر قادر ہے۔ تخلیقِ آدم، تخلیقِ کائنات کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ بابلی تہذیب کی قدیم داستانوں میں بھی تخلیقِ آدم کے تذکرے ملتے ہیں۔ قدیم بابلی نوشتے میں لکھا ہے "دیوتاؤں میں سب سے دانا مامی نے اپنا منہ کھولا۔ لوُ للّو پیدا کر جو وحشی ہے تاکہ وہ بارِ تخلیق اٹھائے اور تمام دیوتاؤں کی خدمت کرے، اسے گیلی مٹی سے بنا اور خون سے اس میں جان ڈال" اس عبارت کو بابلی منتر کے طور پر زچگی کے وقت پڑھتے تھے۔ مصر کی قدیم داستانوں میں بھی انسان مٹی ہی کا بنایا ہوا ہے۔ یہی بات یہودیوں کے عقیدے میں ہے کہ خدا انسان کو مٹی سے بناتا اور اس کے نتھنوں میں روح پھونکتا ہے۔ قرآن کا عندیہ ہے "ہم نے انسان کو خلق کیا کھنکھناتی ہوئی مٹی سے جو بنی تھی سڑی ہوئی کیچڑ سے اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو۔ تحقیق بجا لو میں پیدا کرنے والا ہوں آدمی کو بجنے والی مٹی سے جو بنی تھی سڑی ہوئی کیچڑ سے۔ پس جب درست کر دوں میں اس کو اور پھونک دوں روح اپنی سے۔ پس گر پڑو واسطے اس کے سجدے کرتے ہوئے۔ ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "میں نے انسان کو چکنی مٹی سے پیدا کیا"

مسلمانوں کے بنیادی عقیدوں میں یہ بات شامل ہے کہ تمام الہامی کتب اور رسول اکرم سے پہلے مبعوث ہونے والے رسولوں پر بھی ایمان لایا جائے۔ اسلامی نظریۂ ارتقا حضرت آدم ہی کو بنیاد تسلیم کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ حضرت آدمؑ کے تیسرے بیٹے کا نام حضرت شیثؑ تھا جو ہابیل کے قتل

کے پانچ برس بعد پیدا ہوئے۔ اس وقت حضرت آدمؑ کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ چونکہ قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل ہوگیا تھا اس لئے نعم البدل کے طور پر انھیں پیدا کیا گیا۔ شیث کے معنی ہیں اللہ کی بخشش۔

حضرت شیثؑ پر پچاس صحیفے نازل ہوئے۔ انھیں سے نسلِ انسانی چلی کیونکہ ہابیل نے اپنا کوئی وارث نہیں چھوڑا اور قابیل کے وارث سیلاب میں غرق ہوگئے۔ حضرت شیثؑ نے ۹۲۱ سال کی عمر پائی۔ وہ مکہ میں رہتے تھے اور انھوں نے خانہ کعبہ کو پتھر اور چکنی مٹی سے بنایا تھا۔ روایت ہے کہ ان کے عہد میں انسان دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ جو ان کی اطاعت کرتا تھا اور دوسرا گروہ قابیل کی اولاد کا پیروکار تھا۔

اکثر و بیشتر تذکروں میں حضرت نوحؑ اور طوفانِ نوح کا ذکر آتا ہے۔ آپ نے بڑی طویل عمر پائی۔ جب ۹۵۰ برس کے تھے اس وقت طوفانِ نوح کا واقعہ پیش آیا۔ حضرت آدمؑ کے بعد آپ پہلے نبی ہیں جن کو رسالت سے نوازا گیا۔ آپ نے کفر و الحاد میں گھرے ہوئے لوگوں کو دینِ حق کی طرف بلایا مگر وہ نہ مانے اور عذابِ الٰہی نازل ہوا۔ آپ کے بیٹوں کے نام سام اور حام بتلائے جاتے ہیں۔ سام سے سامی نسل چلی اور حام سے حامی یعنی حبشی نسل۔ ارتقائے نسلِ آدم میں یوں تو کئی انبیائے کرام کا بیش بہا حصہ ہے مگر ابو انبیا حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا درجہ بلند ہے۔ آپ اور آپ کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ نے از سرِ نو خانۂ کعبہ کی تعمیر کی۔ مسلمانوں کے لئے دینِ اسلام کی ایک رفعت یہ بھی ہے کہ اسے دینِ ابراہیمی بھی کہا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد ارتقائے تہذیبِ انسانی میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے جلیل القدر کارنامے اور نسلِ آدم کے پھیلاؤ کا حال احوال صحیفوں میں موجود ہے خصوصاً قرآنِ حکیم نے انتہائی عمدگی سے تکمیلِ دین کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ رہتی دنیا تک انسانی نسل اور عالمِ انسانیت کی حقیقی فلاح و بہبود اور مہذب و شائستہ زندگی کے لئے اسلام جو نظامِ حیات تجویز کرتا ہے اور جس کا ثبوت ہمیں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ سے بھی ملتا ہے وہی دنیاوی اور آخروی زندگی کا خزینہ ہے۔

انسان اور انسانیت

اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انسان ہی وہ اشرف و افضل مخلوق ہے جسے مسجودِ ملائک ہونے کا اعزاز روزِ ازل ہی میں حاصل ہوا تھا۔ اس حقیقت کا ایک اور ماورائی پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے محسنِ انسانیت سرورِ دوعالم حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کو اس دنیا میں بھیجا جو انسان کی آماجگاہ اور اس کا عارضی مسکن رہی ہے۔ بیشک قادرِ مطلق نے اپنی قدرت سے بہت کچھ عطا فرمایا، تاہم اس کے خمیر میں بصیرت و بصارت کا جو نور ہے اس کا اوّلین مظہر عرشِ اعظم پر نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ گویا وہ خالقِ حقیقی نے اسی طرح تخلیق فرمایا تھا، جیسے کوئی دائرہ کھینچنے والا پرکار سے ایک نقطہ ثبت کرتا ہے اور پھر اسے دائرہ مکمل کرنے کے لئے اسی نقطۂ اوّلین پر آنا پڑتا ہے۔ اسلام کے دینِ کامل پر تہذیبِ انسانی کا دائرہ مکمل ہوا اور نبوت کا دائرہ حضورؐ کے نور سے شروع ہو کر حضورؐ کے نور پر ہی تکمیل کو پہنچا۔ اس کی گواہی وجدانی طرزِ احساس ہی سے نہیں شعور و آگہی سے بھی ملتی ہے۔

انسان مٹی سے بنا ہے۔ اس کا ذکر متعدد آسمانی صحیفوں اور قرآن حکیم میں موجود ہے۔ لیکن وہ مرحلہ عجیب تھا جب خالقِ کائنات نے اپنے فرشتوں کو تخلیقِ انسان کا مژدہ سنایا اور یہ فرمایا کہ جب مٹی کے اس پتلے میں رُوح پھونک دوں تو تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس کے رُوبرُو سربسجود ہو جانا۔ سارے فرشتوں نے فرماں برداری کی مگر معلم الملکوت کو اپنے اوپر اتنا ناز تھا کہ وہ فرماں برداری سے محروم رہا اور ابلیس کہلایا۔ پروردگارِ عالم نے اسے مردود بنا دیا۔ تب اس نے بارگاہِ ربی میں درخواست

کی " اے میرے رب! مجھے اس دن تک مہلت دے جس دن وہ یعنی تمام انسان اٹھائے جائیں گے"۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا " جا تجھے مہلت دی جاتی ہے، ایک معلوم وقت تک"۔ پھر ابلیس نے کہا " میرے رب جس طرح تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا ہے، میں انہیں زمین میں خوبصورت بن کر دکھاؤں گا اور ان سب کو ناکارہ رکھوں گا سوائے تیرے خاص بندوں کے"۔ فرمایا " یہ سیدھا راستہ ہے میری طرف کہ میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں چلے گا، مگر وہ جو جاہلوں میں سے ہوں اور تیرے پیچھے چلیں۔ اور یقیناً ان سب کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ اس کے سات دروازے ہیں، ہر ایک دروازے کے لئے ان میں سے ایک حصّہ الگ کر دیا گیا ہے۔ جبکہ متقّی جنتوں اور چشموں میں رہیں گے کہ ان میں سلامتی سے داخل ہو جاؤ اور جو ان کے دلوں میں کدورت ہو گی ہم اسے نکال دیں گے۔ وہ بھائیوں کی طرح آمنے سامنے تختوں پر ہوں گے۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔ میرے بندوں کو خبر دیدے کہ میں بخشنے والا ہوں، رحم کرنے والا ہوں اور یہ کہ میرا عذاب دردناک ہے"۔

ان تمام فرمودات ربانی سے انسان کی تخلیق، زمین پر اس کے منصب دین اور نظریۂ حیات پر روشنی پڑتی ہے تاکہ وہ اپنے مقصدِ تخلیق کو سمجھے لیکن گمراہ انسانوں نے کبھی اپنے آپ کو مظاہرِ فطرت سے خوفزدہ ہو کر ان کی پرستش پر دھیان دیا۔ خود اتنے مجبور ہو گئے کہ خس و خاشاک بن گئے اور کبھی سرکشی پر آئے تو خود خدا بن بیٹھے۔ اسلام کے نزدیک ان دونوں انتہاؤں کے مابین اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر قادرِ مطلق کی رضا نہ ہو تو اس مختصر سے عرصۂ حیات میں انسان خود کو ایک لمحہ بھی زندہ رکھنے پر قادر نہیں ہے۔ اور ساتھ ساتھ یہ فرمانِ الٰہی بھی ہے کہ انسان کو اس کائنات میں اہم مقام حاصل ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوتا ہے:

" ہم نے بنی آدم کو عزّت بخشی اور خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور انہیں پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے"۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلیفۃ الارض ہونے کا منصب عطا کیا ہے۔ وہ اس دنیا میں اللہ رب العزت کا نائب ہے اور نیابت کے لئے لازم ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کا آئینہ دار ہوتے ہوئے وہ اس کائنات میں تصرف کا حقدار تو ہو مگر اپنے منصبی نصب العین کی امانت میں خیانت کا مرتکب نہ بنے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو اپنا خالق و مالک اور معبود نہ سمجھے، جو حدود و قیود اس کے لئے مقرر کی گئی ہیں ان سے تجاوز نہ کرے۔ اپنے اعمال کو صراطِ مستقیم سے نہ ہٹنے دے اور روزِ جزا کی جواب دہی کے لئے آمادہ رہتے ہوئے کارِ خیر سے انحراف نہ کرے۔ ان مقاصد کے لئے اس کو فکر و احساس، شعور و آگہی، عقل و دانش اور فہم و ادراک سے نوازا گیا ہے۔ اب اگر وہ ان خداداد صلاحیتوں کو گمراہی کے لئے برتے تو گویا اس نے ابلیس کی مریدی کو اپنا شعار بنا لیا اور حق سے پھر گیا۔

قدیم ترین اور قدیم تہذیبی ورثے میں قابلِ قدر حصہ ان برگزیدہ ہستیوں کا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے رسالت سے نوازا اور ان کے ساتھ اللہ کے وہ نیک بندے بھی رہے جنہوں نے اپنے سچے رہنماؤں کی ہدایات پر عمل کیا۔ مگر ان کے برعکس دنیا میں مظاہر پرستی، بت پرستی اور نجوم پرستی کے علاوہ انسان پرستی کی مہیب صورتیں بھی رہیں۔ قدیم دور میں مردہ انسان کو بھی پوجا گیا اور زندہ انسانوں میں بھی ایسے شداد و نمرود و فرعون پیدا ہوئے جنہوں نے جبراً اپنی پرستش کرائی۔

انسان پرستی کا باقاعدہ آغاز مصر میں ہوا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فرعونوں کی اسی سرزمین پر ایک شہنشاہ اخناتون (AKHNATOON) بھی ہوا جس نے اب سے قریب قریب ساڑھے تین ہزار برس پہلے سب سے زیادہ توجہ اہلِ مصر کے مذہبی عقائد درست کرنے پر دی۔ ہر قسم کی مشرکانہ عبادتوں کو ختم کر کے ایک خالق کی عبادت پر زور دیا۔ اخناتون نے جب معبودِ حقیقی کی عبادت کا یہ درس دیا، اس وقت مصر میں دو ہزار سے زیادہ بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے ان بتوں کے پرستار اور مندروں کے پروہت اس کے سخت خلاف ہو گئے۔ اخناتون کو جنگ و جدل سے سخت نفرت

تھی۔ وہ خوں ریزی سے بہت بیزار تھا۔ ذرا اس کی سلامت روی دیکھئے کہ ہر طرف سے جارحانہ حملے ہوئے، اس نے کسی دشمن سے مقابلہ نہ کیا۔ حالاں کہ اگر وہ اپنی فوج کو حکم دیتا تو کتنی زبردست خوں ریزی ہوتی۔

اخناتون تو خیر شہنشاہِ مصر تھا، اللہ تعالیٰ کے ایسے نیک بندے قدیم ترین ادوار سے ہی ہر دور اور ہر زمانے میں رہے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ تاریخ کے گمشدہ اور ناپید اوراق میں ان کا کوئی حوالہ نہ ہو۔

فراعینِ مصر جیسا حال بابل کے بادشاہوں کا تھا، جن میں ایک نمرُود بھی تھا۔ اُدھر قدیم ہندو مذہب میں بھی انسان پرستی کی صورت انسانی شکل کے دیوتاؤں پر مرکوز رہی۔ مصر سے شاہ پرستی کی روایت یونان پہنچی، یونان سے روم میں جولیس سیزر نے اپنی پرستش کا جواز لیا۔ اِدھر مشرق میں حالاں کہ مہاتما گوتم بُودھ نے بت پرستی کی سخت مُذمّت کی تھی مگر بودھ مذہب کے پیروکار بھلا کب چُوکنے والے تھے۔ چین، جاپان، کوریا، جہاں بھی بودھ مت پھیلا وہاں گوتم بودھ کے بت نصب کیے گئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والوں نے بھی یہی کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اسلام نے بت پرستی کی جو بیخ کنی کی تھی، وہ روایت آج بھی زندہ ہے اور اسے تا ابد زندہ رہنا ہے تاکہ انسان، انسانیت نوازی کی سچی راہ پر قائم ودائم رہے۔

حصولِ علم و حکمت

کہتے ہیں کہ مصر میں دو سگے بھائی رہتے تھے۔ بڑے بھائی نے خوب علم حاصل کیا۔ صاحبِ علم اور صاحبِ حکمت ہوا۔ چھوٹے بھائی نے جائز و ناجائز طریقے سے خوب مال کمایا اور ملک کا وزیر بن گیا۔ تب اس چھوٹے بھائی نے ایک دن بڑے بھائی کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا اور کہا "میں نے اتنی بڑی سلطنت تک رسائی حاصل کی مگر تم بدستور غریب اور مسکین رہے۔" چھوٹے بھائی کی یہ بات سن کر بڑے بھائی نے کہا "مجھے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں نے پیغمبروں کی میراث پائی یعنی علم و حکمت پائی اور تجھے فرعون کی میراث ملی جو تو نے دولت کے بل بوتے پر حاصل کی۔" چھوٹا بھائی یہ سنتے ہی کچھ شرمندہ ہوا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان پر بے حد و بے حساب احسانات فرمائے ہیں۔ اسے بہترین صلاحیتیں دے کر احسن طریقے پر پیدا کیا۔ عقل و شعور کی دولت دی۔ جاننے اور معلوم کرنے کی حکمت بخشی۔ متعدد قوائے جسمانی عطا کیے تاکہ وہ علم و حکمت کے بل بوتے پر تسخیرِ فطرت اور تسخیرِ کائنات کا حق ادا کر سکے۔ یہاں تک کہ اپنے پیغمبروں، رسولوں اور نبیوں کے ذریعے غیبی علوم بھی عطا فرمائے۔ حضورؐ پر بعثتِ نبوی کے بعد جو سب سے پہلی وحی غارِ حرا میں نازل ہوئی وہ علم ہی کے بارے میں تھی۔ جسے حضرت جبرئیل نے یوں پہنچایا "اے نبی! پڑھیے۔ آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم دی۔ انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔" پھر حضورؐ کو عالم الغیب نے یہ دعا بھی سکھائی "اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما۔" یہ دعا حضورؐ کی وساطت سے تمام اہلِ اسلام کو سکھائی گئی اور

اس دعا کا مفہوم یہ ہے کہ علم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اسی لئے حضورؐ نے تحصیلِ علم و حکمت پر عالمِ انسانیت اور خصوصاً مسلمانوں کو جن فرمودات سے نوازا ان میں ایک یہ ہے کہ "مہد سے لحد یعنی جھولے سے قبر میں پہنچنے تک علم حاصل کرتے رہو"۔ علم کی اہمیت اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا ہے، اس بارے میں ارشادِ ربانی ہے "کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں"۔ کیا عالم اور جاہل مساوی قرار دیے جا سکتے ہیں، نہیں ہرگز نہیں۔ یہ علم و حکمت ہی کا کرشمہ ہے کہ انسان تسخیرِ کائنات کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہا ہے۔

لغت میں علم کے معنی جاننے اور آگاہ ہونے کے ہیں۔ حکمت کو آپ سائنس کہہ لیجیے اور تسخیر کے معنی فتح کرنا اور اپنے تصرف میں لانا۔ یہ وہ مقصد ہے انسانی تخلیق کا جس پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اگر ہم انسان کی بناوٹ پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت سی قوتیں عطا فرمائی ہیں جن سے غیر شعوری طور پر بھی اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر آنکھیں دی ہیں جن کی مدد سے ہر نئی چیز کو دیکھ کر اس کا نقشہ دماغ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ کان دیے ہیں جن سے سن کر نئی نئی باتیں انسان کے دماغ میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ ناک دی ہے جو سونگھ کر خوشبو اور بدبو سے آگاہ کرتی ہے۔ زبان دی ہے جو مختلف چیزوں کو چکھ کر ان کے خواص بتا دیتی ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر دل عطا کیا ہے جو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ ساری انسانی قوتوں کو متحرک کر کے اس کارگہ حیات میں بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کے قابل بناتا ہے۔

حضورؐ نے علم حاصل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی جو پُر زور ہدایت فرمائی ہے اس کا مدعا یہی ہے کہ ہم علم و حکمت سے انسانی فلاح و بہبود کے لئے بہتر سے بہتر خدمات انجام دیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور زمین و آسمان کی ہر شے حتیٰ کہ چیونٹی اور مچھلی تک نیک علم پڑھانے والے کی بھلائی مانگتی ہیں"۔ حضورؐ کا ایک اور ارشادِ مبارک یہ ہے کہ "ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے"۔

علم و حکمت کا مقصد زندگی کو مفید تر اور پاکیزہ تر بنانا ہے۔ یہ تبھی ہو سکتا ہے جب

علم حاصل کرنے والا عمل بھی کرے۔ آپؐ کا ارشاد ہے "قیامت کے روز سب سے شدید عذاب اس عالم کو ہوگا جس کے علم نے اس کو کچھ کام نہیں دیا۔" اسی طرح علم کو جاہ طلبی میں استعمال کرنے والا بھی عذاب سے نہیں بچ سکے گا۔

مسلمان علما اور اہلِ حکمت نے جو کارنامے انجام دیے وہ تاریخ کا زریں باب ہیں۔ اسلام نے حصولِ علم پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی۔ یہ ایک انقلابی قدم تھا جس کی بدولت قدیم و جدید علمی سرمائے سے مستفیض ہونے کی راہیں بھی ہموار ہوئیں۔ تسخیرِ فطرت اور تسخیرِ کائنات کی راہیں کھلیں۔ یہاں تک کہ مہذب دنیا نے مسلمانوں سے سائنس اور علم و حکمت کی باتیں سیکھ کر ایسی ایسی ایجادات کیں جو ساری دنیا کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہیں۔

علامہ اقبال نے حضورؐ کی معراج کے حوالے سے کہا ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

کاش مسلمانوں میں حصولِ علم و حکمت کا پھر وہی جذبہ پیدا ہو جو کبھی ان کے دورِ عروج میں تھا۔

براعظم افریقہ پر اسلام کے اثرات

براعظم افریقہ میں اسلام کی اشاعت اہل افریقہ کے لئے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اسلام سے پہلے افریقی باشندے مختلف قسم کی روحوں اور بھوت پریتوں وغیرہ کو اپنی قسمت کا مالک سمجھتے تھے جو ان کے نزدیک کنوؤں اور ندی نالوں میں رہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان کی زندگی اس زنجیر کی ایک کڑی ہے جس کا سرا اس کے جد یعنی قبیلے کے پراسرار بانی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ دیوتاؤں اور آباؤ اجداد کی خوشنودی کا طالب رہتا تھا جن کی بدولت اسے قبیلے کی سرداری ملی ہے

طلوع اسلام کے بعد شروع ہی سے شمالی افریقہ کے علاقوں میں اسلام کا بول بالا ہونے لگا اور پھر بتدریج براعظم افریقہ کے بیشتر علاقوں تک اسلام کی روشنی پہنچی۔ اس طرح اسلام افریقہ میں ایک ایسے عقیدے کی حیثیت میں متعارف ہوا جس کے علمبردار کلام الہٰی پر مبنی تہذیب و ثقافت کے امین تھے۔ ان مبلغین اسلام نے براعظم کے مختلف علاقوں میں تجارت کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس طرح ایک طرف عرب اور بربر قبائل میں میل جول بڑھا۔ دوسری طرف جنوب کے افریقی قبائل میں تہذیبی اثر و نفوذ کی راہیں کھل گئیں۔ اسلام نے افریقہ کے باشندوں کی ذہنی، معاشرتی اور ثقافتی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ فرد اور جماعت کے تصور میں وسعت پیدا ہوئی۔ پہلے ایک افریقی باشندے کی ساری زندگی محدود دائرے میں محصور تھی۔ اسلام کے دائرے میں آتے ہی اس کے ذہنی ارتقاء میں حیرت انگیز ترقی ہوئی اور بین الاقوامیت کا شعور پیدا ہوا۔ قبائلی افریقیوں نے اسلام قبول کیا تو انھیں پہلی بار اتنی بڑی برادری کا حصہ بننے کا احساس ہوا جو دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسلام کی تعلیمات اس کرۂ ارض کے ہر مرد وزن کے لئے عام تھی۔

سماجی سطح پر قبول اسلام کے بعد قبائل کا باہمی ربط و ضبط بھی اسلامی رواداری کے دائرے میں آگیا۔ مختلف نسلوں کے درمیان اشتراک و تعاون کی راہیں ہموار ہوئیں۔ اسلام نے تجارت اور لین دین کو بھی اخلاق کی

مشترکہ بنیاد فراہم کی تھی اور مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ بھی شرعی احکام کے مطابق معاملات کرتے تھے۔ مقامی تنازعات میں الجھے ہوئے علاقوں میں ایسے غیر جانبدار فریق کی ضرورت ہوتی ہے جو جنگجو فریقین کے درمیان صلح کرادے۔ یہ کام اولین دور میں اور بعد کے ادوار میں بھی مسلمان تاجروں نے کر دکھایا۔

تجارت اور اسلام کے اس قریبی تعلق کی وجہ سے نو مسلم افریقیوں کا اعتماد اسلام اور مسلمانوں پر زیادہ سے زیادہ ہوتا گیا۔ اگرچہ افریقی نو مسلم عربی نہیں جانتے تھے لیکن اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا تھے۔ کسی نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والوں کے لئے یہ رویہ ایک انقلابی تبدیلی کا درجہ رکھتا تھا جس کے باعث افریقہ میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلتا گیا اور کسی سطح پر مزاحمت نہ ہوئی۔

سوڈان کے مغرب میں جو تین بڑی ریاستیں اس زمانے میں قائم ہوئیں ان کے بارے میں تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اسلام کی بدولت قائم ہوئیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان سلطنتوں پر حکمران مسلمان تھے۔ اس لئے ان سلطنتوں پر اسلامی تہذیب کے جو اثرات پڑے ان کی چھاپ خاصی گہری ثابت ہوئی اور پھر یہ چھاپ ان سلطنتوں کے زیر اثر افریقی باشندوں پر بھی لگنے لگی۔ اس طرح نہ صرف عبادات کی حد تک بلکہ عام زندگی میں ایک مخصوص تہذیبی رویہ دور رس اور خوشگوار تبدیلیوں کا پیش خیمہ بنا۔

اسلام میں نیک اعمال کا جو درجہ ہے اور اسے جس طرح عقیدۂ آخرت سے وابستہ کیا گیا ہے اسلامی مبلغین کے ذریعے افریقی باشندوں کو جب اس کا علم ہوا تو ظاہر ہے مسلمان ہونے کے بعد ان کے فکر و عمل میں تبدیلی آئی۔ ان کو بھی یہ احساس ہوا کہ اس زندگی میں جو اعمال سرزد ہوں گے آخرت میں ان کا حساب دینا ہوگا لہٰذا وہ اپنی روح کے تحفظ کی خاطر اخلاقی ذمہ داریوں کو قبول کرنے لگے۔ گویا ان کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ روحانی اعتبار سے انسان دنیا میں تنہا ہے اور اسے مذہب کے تمام احکام پر عمل کرنا چاہیے۔

اپنی ذات اور زندگی کے بارے میں اسلامی تصور حیات نے کئی افریقی نو مسلموں کو مبلغ اسلام بنایا اور ان کے ذریعے اسلامی عبادات مثلاً نماز ادا کرنے کے سلیقے عام نو مسلم افریقیوں کو معلوم ہوئے ساتھ ہی ساتھ ان کے لباس اور جسمانی طہارت کے عمل میں وہی رنگ و آہنگ پیدا ہوا جو مسلمانوں کا ہونا چاہیئے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے بہرہ ور ہوتے گئے۔

اسلام نے افریقیوں کی معاشرتی زندگی کے اندر بھی کئی تبدیلیاں پیدا کیں۔ مسلمان علما کی آمد سے قرآنی مدرسوں کا قیام عمل میں آنے لگا۔ جو اسلامی تعلیم اور عربی کو سیکھنے میں مدد

دینے لگے۔ مقامی زبانوں میں عربی الفاظ و اصطلاحات کا انجذاب ہونے لگا اور وہ اپنی زبان کے روایتی الفاظ ترک کرتے چلے گئے۔ جس افریقی زبان پر اس عمل کا بہت نمایاں اثر ہوا اس کی بہترین مثال "ولوف" نامی زبان ہے جس میں سب سے پہلے بکثرت عربی کے الفاظ شامل ہوئے اور اس زبان کا اہم جزء بن گئے۔ مثلاً ہفتے کے دنوں کے ناموں میں تبدیلی آگئی۔ سینیگام بیاں کے علاقے میں جو 'ولوف' بولی جاتی تھی اس میں ثلاثہ، اربعہ اور جمعہ کے الفاظ رائج ہو گئے۔ اس سلسلے میں اسلام کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ مقامی زبانوں کے لئے عربی رسم الخط استعمال کیا جانے لگا۔

اسلام کے اثرات کا پہلا نتیجہ وہ اخلاقی تحریریں اور تفاسیر تھیں جو مغربی سوڈان کے علماء نے لکھیں۔ یہی نہیں بلکہ اسلامی علوم کو اپنے طلبہ تک پہنچانے میں بھی سوڈان کے علماء نے قابلِ قدر خدمات دیں۔ ادھر شمالی افریقہ میں جامع ازہر جیسے بڑے تعلیمی اداروں کے قیام سے افریقہ کے لوگوں میں حصولِ تعلیم کا شوق بھی بڑھنے لگا۔ اس ذوق و شوق کی بدولت اہلِ افریقہ کو یہ محتاجی نہیں رہی کہ وہ باہر سے آنے والے علماء ہی کے محتاج ہو کر رہ جائیں، کیونکہ مقامی زبانوں کے بولنے والوں کو مطمئن کرنا ان کے اپنے ہم زبانوں کے لئے زیادہ آسان تھا۔

پچھلی اور موجودہ صدی میں افریقی باشندوں کو مغربی تسلط کے خلاف سخت جہاد کرنا پڑا ہے اور اب خدا کے فضل سے پورے افریقہ میں مسلم ریاستیں ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی جاتی ہیں جو ان علامات کو ظاہر کرتی ہیں کہ آنے والی صدی میں افریقہ کے مسلمان عالمِ اسلام میں بڑی طاقت ثابت ہوں گے، انشاءاللہ۔

برصغیر پر اسلامی تہذیب کے اثرات

عرب و سندھ کے تعلقات صدیوں پر محیط رہے ہیں۔ طلوعِ اسلام سے پہلے عربوں کے تجارتی جہاز بحرِ عرب کو عبور کر کے چین تک جایا کرتے تھے۔ عرب جہاز ران دو راستوں سے بحرِ عرب عبور کرتے تھے۔ ایک راستہ عدان سے براہ راست مالابار، لنکا، انڈونیشیا اور چین تک جاتا تھا۔ دوسرا خلیج فارس سے گزر کر مکران کے ساحلی علاقوں سے ہوتا ہوا سندھ کے ساحل تک آتا تھا۔ یہ سلسلہ ظہورِ اسلام کے بعد بھی قائم رہا بلکہ اس میں گرانقدر اضافہ ہو گیا، کیونکہ عہدِ فاروقی میں اسلامی ریاست کی سرحدیں مکران تک آ گئیں۔ پھر سندھ کو خلفائے اموی کے دور میں محمد بن قاسم نے فتح کیا اور سندھ باب الاسلام کہلانے لگا۔ اس طرح ساتویں صدی عیسوی میں عربوں کے اثرات سے سندھ اور قریب کے علاقوں میں اسلامی تہذیب کے اثرات نمایاں ہوئے۔ شمال مغربی علاقے میں درۂ خیبر ایسا راستہ ہے جو آریائی قبیلوں کی آمد کا ذریعہ بنا تھا اور اسی ذریعے سے سلطان محمود غزنوی نے پنجاب، سندھ اور گجرات کے علاقوں پر سترہ حملے کیے جن میں سب سے بڑا حملہ سومنات کے مندر پر تھا۔ اس طرح غزنوی سلطنت میں شمالی مغربی علاقے جو اب پاکستان میں ہیں غزنوی سلطنت میں شامل رہے پھر غوری خاندان کے سلطان شہاب الدین غوری نے کئی حملے کئے اور ہندوستان میں مسلم ریاست کے قیام کی راہ ہموار کی۔ مگر سن۶۰۲ھ میں اس کی موت نے غوری سلطنت کو بھی ختم کر دیا۔ البتہ علمائے دین اور بلند پایہ روحانی بزرگوں کی بدولت اسلام کی تبلیغ جاری رہی اور پسماندہ عوام حلقۂ اسلام میں آنے لگے۔ شہاب الدین غوری کے بعد ۱۱۹۳ء سے ۱۵۲۶ء تک کئی خاندانوں کی حکمرانی رہی خصوصاً دہلی کو دارالسلطنت کا درجہ حاصل رہا۔ لاہور، ملتان اور کئی دوسرے اہم شہر بھی اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز بننے لگے۔ خاندانِ غلاماں نے ۹۴ سال حکومت کی۔ قطب الدین ایبک، التمش، رضیہ سلطانہ اور بلبن اسی خاندان کے حکمراں تھے پھر خلجی خاندان کا راج ۳۰ برس تک رہا جو علاء الدین خلجی سے عبارت رہا پھر

تغلق خاندان کے محمد تغلق، فیروز تغلق اور جانشینوں نے ۹۳ برس حکومت کی۔ اس کے بعد خاندان سادات کا دورِ حکومت ۳۷ برس رہا اور خاندانِ لودھی نے ۷۵ سال حکومت کی۔ اس طرح ۳۲۳ برس تک پنجاب، سرحد، دہلی اور کئی علاقے مسلم حکمرانوں کے زیرِ نگیں رہے۔ پھر ۱۵۲۶ء میں مغل فاتح ظہیر الدین بابر نے سلطنتِ مغلیہ کی بنیادیں اتنی مضبوطی سے قائم کیں کہ مغل حکمرانی کا دور انیسویں صدی کے ابتدائی دور تک قائم رہا علاوہ ازیں مختلف علاقوں میں کچھ خود مختار مسلم ریاستیں بھی قائم ہوتی رہیں جو دکن کے علاقے میں اور ہندوستان کے مشرقی حصوں میں تھیں۔

مغلوں کی آمد سے پہلے اسلامی تہذیب کے جو خدوخال پاک و ہند کی سرزمین پر نمایاں ہوئے ان میں عربی زبان وادب اور بالخصوص دینی علوم کی ترقی و توسیع، فنونِ لطیفہ، صنعت و حرفت کا فروغ اور مسجدوں کی عالیشان تعمیرات جو آج بھی کافی حد تک اس عہدِ رفتہ کی یاد دلاتی ہیں۔ عربی کے ساتھ فارسی اور عجمی اثرات زیادہ بھرپور انداز میں نمایاں ہوئے جس کی ایک مثالی شخصیت امیر خسرو ہیں۔

برصغیر میں صوفیائے کرام کے سلسلوں کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی جو قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور کئی دوسرے سلسلوں سے اب تک قائم ہیں۔ ان کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ غریب عوام نے اسلامی اخوت و مساوات اور خدا ترسی کی تعلیم سے اسلام قبول کیا۔

۱۵۲۶ء میں مغل شہنشاہ بابر نے لودھی خاندان کی حکومت ختم کر کے مغلیہ حکومت کی بنیاد ڈالی۔ وہ صرف فاتح ہی نہیں تُوزکِ بابری کا مصنف بھی تھا۔ وہ مغلیہ حکومت قائم کر کے صرف چار سال زندہ رہا۔ مرتے وقت اس نے اپنے جانشین ہمایوں کو نصیحت کی تھی کہ مذہبی تعصب اور گاؤ کشی سے پرہیز کرنا۔ کسی کی عبادت گاہ کو نہ گرانا، اسلام کی اشاعت لطف و احسان سے کرنا، شیعہ سنی اختلاف میں نہ پڑنا۔ اپنی رعایا کی مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھنا۔ لیکن ہمایوں کو شیر شاہ سوری نے شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ پھر جب شیر شاہ سوری کی اچانک موت کے بعد ہمایوں کو دوبارہ فتح حاصل ہوئی تو ۱۵۵۶ء سے اٹھارویں صدی کے وسط تک مغلیہ سلطنت کو اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالمگیر جیسے طاقتور حکمران ملے۔ اکبر اور اس کے جانشینوں نے رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے۔ ان سے پہلے شیر شاہ سوری نے اپنے ۵ سالہ دورِ اقتدار میں وہ کام کر دکھائے تھے جو دوسرے حکمران پچاس برس میں بھی نہ کر سکے مثلاً زمین کی پیمائش، پشاور سے کلکتہ تک شاہراہ کی تعمیر، مسافروں اور غریب عوام کے لئے سرائیں،

شفاخانے، مدرسے اور بہت سی فلاحی عمارتیں وغیرہ۔ عہدِ مغلیہ سے پہلے جو سلاطین ہوئے انھوں نے بھی دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان اور بہت سے بڑے بڑے شہروں میں مسجدیں، مقبرے، مدرسے، مہمان خانے، حوض، منارے، حمام وغیرہ بنوائے اور باغات لگوائے۔ کئی نئے شہر بھی بسائے جو آج بھی مشہور ہیں۔

مغلیہ تہذیب اسلامی ہونے کے باوجود دراصل محلاتی تہذیب تھی جیسے عباسیہ عہد میں تھی۔ البتہ مغل حکمران بڑے خوش مذاق تھے جس کی اعلیٰ مثالیں دہلی کی شاہی مسجد، لاہور میں شالامار باغ، آگرہ کے تاج محل اور کئی دوسری شاندار عمارتوں کے علاوہ فنونِ لطیفہ کی ترقی و توسیع سے ملتی ہیں۔ کوتاہی ان سے یہ ہوئی کہ بحری طاقت پر قطعی کوئی توجہ نہ دی۔ چنانچہ مغربی اقوام نے رفتہ رفتہ تجارت کے بہانے سیاسی غلبہ حاصل کرلیا۔ پھر اورنگ زیب عالمگیر کی انتہائی وسیع سلطنت کے بعد مغربی طاقتوں نے رفتہ رفتہ وہ رنگ جمایا کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک پورا ہندوستان برطانوی غلامی میں مبتلا رہا۔ البتہ عہدِ غلامی میں سرسید احمد خاں کی تحریک، علمائے دیوبند کی تحریک، خلافت کی تحریک اور تحریکِ آزادی نے قیامِ پاکستان کی منزل آسان کردی۔

برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے تہذیبی ورثے کے سلسلے میں یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس سرزمین پر شیخ احمد سرہندی، مولانا عبدالقدوس گنگوہی، شاہ ولی اللہ اور کئی ممتاز شخصیات ایسی بھی پیدا ہوئیں جنھوں نے مسلمانوں کے دینی و مذہبی اور تہذیبی تشخص کو اسلام کے دامنِ رحمت سے وابستہ رکھا۔ دینی مدارس ہر دور میں قائم رہے۔ قرآنِ کریم کو حفظ کرنے والے، قرآن و سنت اور سیرتِ طیبہ پر تحقیقی نظر رکھنے والے اور علم و ادب کے حوالے سے اسلام کا بول بالا کرنے والے اہلِ علم اور دانشور نامساعد حالات میں بھی بیش بہا خدمات انجام دیتے رہے۔

موجودہ صدی میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا مفتی محمد شفیع اور کئی دوسرے فرزندانِ توحید نے اسلام کا پرچم بلند رکھا اور ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی میں تاحیات اہم خدمات انجام دیتے رہے۔

مسلمانوں کی خود مختار ریاستیں

جب تک مسلمانوں کا دورِ خلافت قرآن و سنت کی بنیادوں پر مضبوطی سے قائم رہا، ملتِ اسلامیہ کا اتحاد بھی کافی حد تک برقرار رہا اسلامی تہذیب بھی خوب پھلی پھولی لیکن دوسری صدی ہجری میں خود مختار مسلم ریاستوں کا دور شروع ہوا اور رفتہ رفتہ بڑھتا ہی گیا۔ مغرب اور شمالی افریقہ میں دولتِ ادریسیہ، دولتِ اغالبہ، دولتِ طولونیہ، دولتِ اخشیدیہ اور دولتِ ایوبیہ جیسی ریاستوں کا دور رہا اور مشرقی خطوں میں طاہریہ، زیدیہ، صفاریہ، سامانی سلطنت، آلِ بویہ، غزنوی سلطنت، غوری سلطنت، آلِ سلجوق اور سلطنتِ خوارزم کا عہد۔ دولتِ ادریسیہ کا علاقہ مراکش اور الجزائر کے کچھ حصے پر مشتمل تھا۔ یہ ریاست ۱۶۹ھ سے ۳۰۹ھ تک قائم رہی۔ اس کے قیام کا سبب یہ تھا کہ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے عہد میں جب اہلِ بیت پر عتاب نازل ہوا تو ادریس بن عبداللہ کسی طرح چھپ چھپا کر مراکش پہنچ گئے اور وہاں انھوں نے ایک چھوٹی سی ریاست قائم کر لی جو ہمیشہ عباسی خلافت سے آزاد رہی۔

خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں ابراہیم بن اغلب کو تیونس اور الجزائر کا والی بنا کر بھیجا۔ اس نے اس شرط پر یہ عہدہ قبول کیا کہ امارت اسے موروثی طور پر دیدی جائے۔ اس طرح اغلبہ ایک عرصے تک حکومت کرتے رہے اور انہی کے عہد میں صقلیہ فتح ہوا۔

دولتِ طولونیہ اس طرح قائم ہوئی کہ ۲۵۴ھ میں ایک ترکی غلام احمد بن طولون نے مصر میں خود مختار ریاست قائم کر کے طولونی حکومت کی بنیاد ڈالی مگر خلافت سے رشتہ قائم رکھا۔

دولتِ اخشیدیہ کی بنیاد ایک دلیر ترکی امیر نے رکھی جس کا لقب اخشید تھا۔ یہ ریاست بھی خلافتِ عباسیہ کی طفیلی ریاست تھی۔ دولتِ ایوبیہ کی بنیاد صلیبی جنگوں کے دوران سلطان صلاح الدین ایوبی نے ڈالی جو مصر کی سرزمین سے تعلق رکھتی تھی۔ ریاستِ طاہریہ خراسان میں عباسی خلیفہ مامون الرشید

کے مشہور ایرانی سپہ سالار طاہر ابن حسین نے قائم کی جو وہاں کا والی مقرر ہوا۔ یہ ریاست بھی مرکزی خلافت کو خراج ادا کرتی رہی۔ بعد میں اسے صفاریوں نے ختم کر کے بیشتر حصے پر اپنی حکومت قائم کرلی۔

صفاریہ سلطنت محمد یعقوب ابن صفار نے ایک ایرانی علاقے میں قائم کی۔ پہلے خود مختار رہی بعد میں مرکزی خلافت عباسیہ سے رشتہ جوڑ لیا۔ ان تمام ریاستوں میں جو خلافت عباسیہ کے دور میں قائم ہوئیں سامانی ریاست سب سے اہم تھی۔ اس کی بنیاد ۲۶۱ھ میں اسمٰعیل سامانی نے ڈالی۔ خلافت عباسیہ کی حمایت سے یہ طاقتور ہوئی اور اس میں خراسان اور افغانستان شامل ہو گئے۔ اس کا مرکزی شہر بخارا تھا جسے تہذیبی لحاظ سے بڑا عروج حاصل ہوا۔ فارسی زبان و شاعری کی نشو و نما اسی ریاست سے شروع ہوئی یعنی رودکی اور دقیقی جیسے ابتدائی دور کے شاعر اسی ریاست میں تھے۔ تاریخ طبری کا ترجمہ فارسی میں یہیں ہوا۔ ابن دقیقہ، امام زکریا رازی اور حمزہ اصفہانی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ترکستان، خراسان اور افغانستان کے علاوہ دیلم کی سرزمین سے ایک نیا خاندان ابھرا جو آل بویہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مورث اعلیٰ ابو شجاع بویہ ایرانی بادشاہ بہرام گور کی نسل سے تھا۔ اس کے تین بیٹوں یعنی علی، حسن اور احمد نے عراق اور ایران کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر کے شیعہ ریاست قائم کی جو آل بویہ کہلائی۔ اس کے بانی چونکہ مذہباً شیعہ تھے اس لئے عباسی خلافت کو جائز نہ سمجھتے تھے لیکن سیاسی مصلحتوں کے تحت انھوں نے عباسی خلافت سے رشتہ قائم کر کے اجازت نامہ اور خطابات پائے۔ عباسی خلافت کمزور ہوئی تو ترکوں نے بغداد پر اپنا اقتدار قائم کیا لیکن بعد کو آل بویہ نے بغداد پر بھی قبضہ کرلیا اور خلافت کو اہل بیت کے حوالے کرنا چاہا مگر ریاست کے امرا نے مخالفت کی۔ آل بویہ کے خلاف مسلمانوں میں سخت بے چینی پیدا ہوئی اور ہر طرف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا مگر بغاوتیں ناکام رہیں اور تقریباً سو سال تک آل بویہ ایران اور عراق پر حکومت کرتے رہے۔ عید غدیر منانے اور تعزیہ داری کی رسم آل بویہ نے ہی شروع کی۔ نجف میں حضرت علیؓ کا مزار اور کئی دوسری عمارتیں اسی دور میں تعمیر ہوئیں۔ عرب کا مشہور شاعر متنبی بھی اسی دور میں گزرا۔ یہی زمانہ تھا جب بغداد میں ایک اور بڑا کتب خانہ تعمیر ہوا۔ آل بویہ کا مشہور وزیر اعظم اسمٰعیل ابن عباد بڑا عالم اور ناقد تھا۔ اس نے ایک عربی لغت "محیط" کے نام سے مرتب کی اور علم عروض پر تحقیقی کتاب لکھنے کے علاوہ تاریخ قم بھی تحریر کی۔ اس کے دربار سے کئی عالم، فلاسفہ اور سائنس داں وابستہ تھے۔

۴۷ ۸ھ میں آلِ بویہ کے آخری حکمراں کو سلطان طغرل بک نے گرفتار کرکے بویہ حکومت کا خاتمہ کر دیا جو آلِ سلجوق سے تھا۔ سلجوقی نسلاً ترک تھے اور بخارا کے قریب آباد ہو گئے تھے۔ چوتھی کے وسط میں سلجوقیوں کا سیاسی عروج ہو۔ سلجوق کے چار بیٹے تھے۔ اس کی موت کے بعد ارسلان قبیلے کا سردار منتخب ہوا۔ اس کی رہنمائی میں سلجوقیوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محمود غزنوی طاقت پکڑ رہا تھا۔ محمود نے ان کے خلاف کارروائی کی اور اس طرح آلِ سلجوق اور غزنوی خاندان میں دشمنی پیدا ہوئی۔ محمود کی وفات کے بعد سلجوقیوں نے اپنے سردار طغرل کی قیادت میں خاندانِ غزنوی کو زیر کرکے خراسان، طبرستان، اصفہان، جرجان اور موصل کو فتح کرتے ہوئے بغداد پر چڑھائی کی۔ نام نہاد خلیفہ نے طغرل کی فاتحانہ عظمت تسلیم کر لی اور اسے ملک المشرق و مغرب کا خطاب دیا۔ اس طرح عباسی خلافت کو نئی زندگی ملی اور سلجوقیوں کا اقتدار بھی پروان چڑھا مگر جب طغرل بغداد سے واپس آگیا تو ایک ترک جرنیل نے بغداد پر قبضہ کر کے سلجوقی اہلکاروں کو قتل کرادیا اور عباسی خلیفہ کا نام خطبے سے خارج کرکے مصر کے فاطمی خلیفہ کا نام داخل کرادیا۔ ایک سال بعد طغرل نے پھر بغداد پر چڑھائی کی۔ خلیفہ قائم جو چھپ گیا تھا اسے دوبارہ تختِ خلافت پر بٹھایا۔

طغرل نے ۴۵۵ھ میں وفات پائی اور اس کا بھتیجا الپ ارسلان تخت نشین ہوا۔ اس نے حجاز و شام سے فاطمیوں کے اثرات ختم کئے، بازنطینیوں کو شکستِ فاش دی اور سلجوقی سلطنت کو بحیرۂ روم تک وسیع کر دیا۔ اس کے بعد الپ ارسلان کا بیٹا ملک شاہ حکمراں ہوا جس نے سلجوقی سلطنت کو چین تک پہنچا دیا۔ ملک شاہ کا وزیر اعظم نظام الملک طوسی تھا جس نے علم و ادب اور فنونِ مفیدہ کے عظیم کارنامے انجام دیے۔ اسی زمانے میں سلطنت خوارزم کی بنیاد پڑی۔ خوارزم شاہ نے بغداد پر فوج کشی کا ارادہ کیا جو عملی جامہ نہ پہن سکا۔ دوسری جانب تاتاریوں کا سیل بلا اٹھا اور چنگیز خاں نے خوارزمی سلطنت اور خلافتِ عباسیہ کا نام و نشاں مٹا دیا۔

صلیبی جنگیں

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ۱۰۹۵ء سے ۱۱۹۲ء تک تقریباً سو سال مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔ ان جنگوں کو تاریخ میں صلیبی جنگیں کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ سلسلہ بہت طویل عرصے جاری رہا، کبھی اس میں بڑی شدت پیدا ہوئی اور کبھی کمی آ گئی۔ اس لحاظ سے اسے تین حصوں میں تقسیم کر کے پہلی، دوسری اور تیسری صلیبی جنگ کا نام دیا گیا۔

ظہورِ اسلام سے پہلے عیسائیت تیزی کے ساتھ مشرق و مغرب میں پھیلتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ عرب کی سرزمین پر بھی اس کے واضح اثرات تھے۔ شام، عراق، یمن اور عرب میں تبلیغی ادارے مستعدی سے سرگرمِ عمل تھے اور لوگ عیسائی مذہب قبول کر رہے تھے۔ عہدِ رسالت میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ چھڑی۔ اس لحاظ سے موتہ کی جنگ، پہلی جنگ تھی جو اس عہد میں لڑی گئی۔ اس کے بعد ہی مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا جس نے براعظم یورپ کو بھی اپنے نرغے میں لے لیا۔ ایسی صورت میں اہلِ یورپ کو مسلمانوں سے دشمنی پیدا ہوئی اور اپنے اقتدار کی بحالی کے لئے بھرپور کوششیں کرتے رہے۔ ادھر جب سے مدینۂ منورہ میں اسلامی ریاست قائم ہوئی تھی، رقابت و مخاصمت کا جذبہ بڑھ رہا تھا جس نے آخر عیسائی طاقتوں کو صلیبی جنگوں پر اکسایا۔

اسلامی فتوحات نے یورپ کی مکمل ناکہ بندی کر دی تھی۔ بحری اور بری راستوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ اس عہد میں یورپ کی جو مذہبی، سیاسی اور معاشی حالت تھی وہ بھی جنگوں کا سبب بنی۔ عیسائی دنیا اس وقت اقتدار کی دو چکیوں کے درمیان تھی۔ ایک بادشاہ کے اقتدار کی سیاسی چکی اور دوسری پوپ کی مذہبی برتری کی چکی۔ ان دو طاقتوں کے درمیان طویل کشاکش عرصے سے جاری تھی۔ وہاں نہ کوئی سیاسی استحکام تھا اور نہ معاشی و معاشرتی فلاح و بہبود۔ اس طرح پورا یورپ

چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں بٹا ہوا تھا۔ کوئی مرکزیت نہ تھی۔ سیاسی انتشار، جہالت، عصبیت اور افلاس نے عوام کو انتہائی بدحال کر رکھا تھا۔ عیسائی قائدین نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھوکے ننگے عوام کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑکایا۔ خصوصاً فاروقی دورِ خلافت میں جب فلسطین پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو اس واقعے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور عیسائی دنیا نے صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا۔ پھر چونکہ قسطنطنیہ مسیحیت کا آخری محفوظ قلعہ تھا جو مسلمانوں کے تسلط سے آزاد تھا۔ اہلِ یورپ جانتے تھے کہ اگر مسلمانوں نے اسے فتح کر لیا تو ان کے لئے عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا۔ قسطنطنیہ کے قریب ایشیائے کوچک کی مسلم ریاست نے بھی دشمنی کی لہر کو تیز کر دیا۔ پانچویں صدی ہجری میں مسلمانوں کے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قیصرِ روم نے دو لاکھ فوج سے ایشیائے کوچک کی سلجوقی ریاست پر حملہ کر دیا، مگر شکست کھا کر مسلمانوں کی قید میں چلا گیا۔ دوسری طرف شمالی افریقہ کے حکمران یوسف بن تاشقین کی مدد سے اسپین کے مسلمانوں نے عیسائیوں کی متحدہ طاقت کو شکستِ فاش دی۔ ان تمام اسباب نے صلیبی جنگوں کے لئے میدان ہموار کیا۔

جب عیسائی دنیا کے مذہبی پیشوا پوپ اور عیسائی قائدین نے دیکھا کہ مسلمانوں کے اثرات یورپ کے ملکوں پر بھی پڑ چکے ہیں تو فیصلہ کن جنگ کرنے کے لئے پطرس راہب نے ہر ملک میں جا کر اشتعال انگیز تقریریں کیں اور پوپ نے فرانس میں عیسائی دنیا کی نمائندہ کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ "مسلمانوں کا ظلم بہت بڑھ چکا ہے، ان سے جنگ ضروری ہے اس لئے جو شخص اپنی صلیب کو نہیں اٹھائے گا وہ میرا ساتھ نہ دے گا، وہ میرا پیروکار نہیں سمجھا جائے گا۔" پوپ کے اس اعلانِ جنگ سے تقریباً تیرہ لاکھ عیسائی سرخ کپڑے کی صلیبیں لگائے فلسطین کی طرف روانہ ہوئے اور قونیہ کی سلجوقی ریاست کے حکمران قلیج ارسلان سے پہلا معرکہ ہوا جس میں عیسائیوں کی پہلی فوج تباہ ہو گئی۔ پھر دوسری فوج جس میں فرانس، انگلستان، جرمنی اور اٹلی حکمران اور امرا بھی تھے اور جس کی مجموعی تعداد دس لاکھ کے قریب تھی، وہ سلطان کے مقابلے پر آئی جس کا مقابلہ وہ نہ کر سکا۔ چنانچہ صلیبیوں نے قونیہ کو تباہ کیا، انطاکیہ کو لوٹا اور دوسرے شہروں کو غارت کرتے ہوئے سو لاکھ مسلمانوں کو قتل کرتے ہوئے بیت المقدس پہنچے۔ اس پر قبضہ کر کے وہاں بھی قتلِ عام کرتے رہے۔ پھر دمشق کی طرف بڑھے مگر قبضہ نہ کر سکے۔ البتہ پورا ملک شام ویران ہو گیا۔ ہزاروں عمارتیں مسمار ہوئیں اور لاتعداد کتب خانے جلا ڈالے۔

۵۴۳ ہجری میں جب وہ دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھے تو عمادالدین کے بیٹوں سیف الدین زنگی اور نورالدین زنگی نے مورچہ سنبھالا اور انھیں پسپا کر دیا۔ اس کا انتقام انھوں نے ادلیسیہ پر حملہ کر کے لیا جہاں پوری مسلم آبادی کو ختم کر ڈالا۔ نورالدین پھر مقابلے پر آیا اور ان کو بری طرح شکست دی جس کے نتیجے میں جرمنی اور فرانس کے بادشاہوں کی قیادت میں نو لاکھ کی ایک اور فوج آگئی جس نے دوسری صلیبی جنگ کا آغاز کیا۔

دوسری جنگ میں پہلا تصادم انطاکیہ کے قریب مسلم مجاہدین سے ہوا۔ صلیبی پسپا ہوئے لیکن انھوں نے بقیہ فوج کے ذریعے دمشق کا محاصرہ کر لیا مگر ناکام رہے۔ اب انھوں نے مصر پر حملہ کرنے کی ٹھانی اور اسکندریہ کا محاصرہ کیا۔ ان دنوں سلطان صلاح الدین ایوبی نے جو مصر کا فرماں روا ہو گیا تھا، صلیبیوں سے بھرپور جنگ کی۔ صلیبیوں کا سرغنہ اس وقت ریجی نالڈ تھا۔ اس نے ایک تقریر میں یہ کہا کہ اس کا ارادہ مدینہ پر حملہ کر کے شہر کو تاراج کرنے کا ہے۔ اس نے کچھ حاجیوں کو گرفتار بھی کر لیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اعلانِ جہاد کر دیا اور ایک فوج لے کر صلیبیوں پر ٹوٹ پڑا۔ تمام عیسائی حکمراں اور امراء گرفتار ہوئے۔ پھر اس نے یروشلم کا محاصرہ کیا۔ یہاں بھی کامیابی ہوئی اور تقریباً ۹۰ سال بعد بیت المقدس دوبارہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔

مسلمانوں کے سائنسی کارنامے

حیات و کائنات اور اپنے گرد و پیش کی دنیا کو سمجھنے کی انسان جو کوشش کرتا ہے اس کا نام سائنس ہے۔ مسلمانوں کا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ ان کا دین نہ صرف سائنسی تجربات و انکشافات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ علوم مفیدہ کو اختیار کرنے کی واضح ہدایت دیتا ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ حصولِ علم کی جدوجہد ہمیشہ جاری رکھی جائے۔ آغازِ اسلام کے یادگار دن سے بعد کے ادوار تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مسلمان حصولِ علم میں پیچھے رہے ہوں۔ ان علوم میں دینی علوم کے علاوہ وہ علوم بھی شامل ہیں جن کی بنیادوں پر بتدریج نئے علوم کا اضافہ ہوا۔ مثلاً علمِ ریاضی کو جدید سائنس میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔

مسلمان ریاضی دانوں کی بہت سی پیش قدمیوں میں سے ایک سب سے منفرد چیز رقوم میں اعداد کی جگہ کا تعین ہے اور اس سلسلے میں مسلمانوں کی سب سے اہم اختراع صفر کا تصور اور اس کی علامت کا استعمال ہے۔ یہی اسلامی ورثہ آج ہمارے عددی نظام کی بنیاد بن چکا ہے۔ زمانۂ حال کی اصطلاحات میں مسلمانوں کے علم ریاضی کی کئی اور اہم نشانیاں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک اصطلاح 'الجبرا' ہے جس کا مخرج عربی کا لفظ 'الجبر' ہے یعنی کسی نامکمل شے کو بحال یا مکمل کرنا۔ اس میدان میں جو کام پہلے ہو چکا تھا، مسلمانوں نے اسے ترقی دے کر تکمیل تک پہنچایا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا کام محمد ابنِ موسیٰ الخوارزمی نے کیا جس کا شمار عظیم ریاضی دانوں میں ہوتا ہے۔ ریاضی کا جدید تصور الگوارزم اسی کے نام سے مشتق ہے۔ اس کی تصنیف 'کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ' کے تراجم کئی زبانوں میں ہوئے۔

مثلثیات یعنی ٹریگنومیٹری ریاضی کا دوسرا بڑا علم ہے جس کو مسلمانوں نے منضبط کیا۔ یونانیوں کے نتائجِ فکر کو بنیاد بنا کر مسلمانوں نے جیومیٹری میں خاصا اضافہ کیا۔ مثال کے طور پر عمر خیام اور نصیر الدین طوسی کا نام لیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی تصانیف کا ایک حصہ طبعی فلسفے کے لئے وقف کیا تھا جو زندگی

اور زمین سے تعلق رکھنے والے علوم پر مشتمل تھا۔

ممتاز مسلمان ماہرین طبعیات میں البیرونی اور ابن سینا کے نام بہت نمایاں ہیں۔ مطالعۂ حرکت اور میکانیات کے مطالعے نے عمومی طور پر مسلمان سائنس دانوں کی رہبری کی اور اس سلسلے میں ابنِ الہیثم کے کارنامے کو مغربی سائنس داں بھی مانتے ہیں۔ اسی نے بصری سائنس پر ایک کتاب "کتاب المناظر" لکھی تھی جس کا ترجمہ سب سے پہلے لاطینی زبان میں ہوا تھا۔

ابنِ الہیثم کے کارناموں میں کرّۂ ہوا کے مظاہر کا مطالعہ، آئینوں کے بصری انحرافات، روشنی کے مختصر ترین راستے کے اصول کا تعین اور انعطافِ نور (Radiation) جیسے کارنامے ہیں۔ آنکھ کی حفاظت کے موضوع پر مسلمانوں نے طبی سائنس پر خصوصی توجہ دی۔ عربی زبان ہی نے لاطینی اور دوسری یورپی زبانوں کو بصریات کی بے شمار اصطلاحیں دیں۔ اس موضوع پر نہایت مستند مقالات میں سے ایک "تذکرۃ الکحالین" ہے جس کو مشہورِ زمانہ سائنس داں علی ابنِ عیسیٰ نے تحریر کیا تھا جو جراحی میں مخدّرات کے استعمال کی تجویز پیش کرنے والا پہلا شخص تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ تہذیب کے سفر میں سائنسی پیش رفت پر مسلمانوں کے احسانات دوسری ملتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اور اساسی نوعیت کے ہیں۔

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں جو سائنسی کارنامے انجام دیے اس سلسلے میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ میڈیکل سائنس کی اہمیت کو مسلمانوں نے شروع ہی سے بہت دلچسپی کے ساتھ اپنایا تھا۔ مثلاً رئیس الاطباء حکیم بوعلی سینا کتنے بڑے عالم اور علمِ طب کے عظیم پیشرو تھے۔ انھوں نے ایسی نادر کتابیں تصنیف کیں جو صدیوں تک اہم ترین حوالوں کا کام دیتی رہیں۔ ان کی کتاب "القانون فی الطب" عدیم المثال اثر کی حامل رہی ہے اور بے شمار زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوتا رہا ہے۔ ابنِ سینا کے علاوہ ابنِ رشد، الکندی اور الرازی جیسے بلند پایہ شخصیات کے کارنامے بھی کم نہیں۔

یہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان ہی تھے جنھوں نے باقاعدہ شفاخانے بنوائے جو عصرِ حاضر کی اصطلاح میں محض ہسپتال نہیں تھے بلکہ ان میں طب و جراحی کے ساز و سامان کی موجودگی کے ساتھ ساتھ طبی سائنس کے کتب خانے، لکچر ہال اور فنی عملے کے لئے اقامتی مکانات بھی تھے۔ نیز اساتذہ اور طلبہ کو وہ تمام سہولتیں میسر تھیں جو آج کی تجربہ گاہوں میں ہوتی ہیں۔

ایک اور اہم سائنسی مضمون "کیمیا" (کیمسٹری) پر بھی مسلم سائنس دانوں نے خاصا تحقیقی

اور تجرباتی کام کیا۔ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی ایام ہی سے علم کیمیا کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں مشہور و معروف فلسفی، طبیب اور کیمیادان جابر بن حیان نے آٹھویں صدی عیسوی میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں "کتاب السبعین" اور "کتاب المیزان" خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

دوسرا عظیم مسلم سائنس داں محمد ابن زکریا الرازی ہیں جنھوں نے اشیاء کو معدنی، نباتی اور حیوانی اقسام میں تقسیم کرنے کا نظریہ پیش کیا۔ علم کشید اس کا قابل ذکر کارنامہ ہے۔ خیال ہے کہ خمیری اشیاء میں سے الکحل کشید کر کے اسے طبی مقاصد کے لئے استعمال کرنے والا وہ پہلا شخص تھا۔ خود لفظ الکحل کا ماخذ عربی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر سب نہیں تو مسلم سائنس دانوں کی بہت بڑی تعداد کو فلسفہ، ادب اور دیگر کئی علوم و فنون پر دسترس حاصل ہونے کے علاوہ مختلف سائنسی علوم پر بھی مکمل عبور حاصل تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی سائنس کی موجودہ کیفیت اس کے شاندار ماضی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، لیکن آج کے دور میں بھی ڈاکٹر عبدالسلام، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، ڈاکٹر عطاء الرحمان، ڈاکٹر رضی الدین اور ڈاکٹر عبدالقدیر اور کئی دوسرے بڑے سائنس داں اسلامی دنیا کا نام روشن کر رہے ہیں۔

اسلامی ممالک اب اس حقیقت سے زیادہ باخبر ہوتے جا رہے ہیں کہ عہد ماضی میں عظیم مسلم سائنس دانوں نے جو کارنامے انجام دیے ان کو از سر نو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے یہ احساس بھی بڑھا ہے کہ اسلام میں احیاء العلوم کا انحصار امت مسلمہ کے اندر سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ پر ہے۔ ذی علم مسلمانوں کے سامنے رسول اکرمؐ کی یہ حدیث بھی ہے " اس امت کے آخری دور کی حفاظت بھی صرف اسی چیز سے ہوگی جس سے اس کا ابتدائی دور محفوظ ہوا تھا۔"

یہ بڑا خوش آئند عمل ہے کہ مسلم ممالک نے مشترکہ طور پر "اسلامی فاؤنڈیشن برائے سائنس اور ٹکنالوجی" کی بنیاد چند سال پہلے ہی قائم کر لی ہے اور دنیائے اسلام کے ممتاز سائنس داں ڈاکٹر علی قطانی اس کے نگراں ہیں۔ کاش یہ فاؤنڈیشن مسلم سائنس دانوں کی وہ حیثیت بحال کر سکے جو عہد ماضی میں ہمارے عظیم سائنس دانوں کو حاصل تھی۔

اسلام کا نظامِ معاشرت

اسلام سے پہلے دنیا میں جو معاشرتی نظام رائج تھے ان پر یا تو مطلق العنان حکمرانوں کی بالادستی تھی یا پھر قبائلی سرداروں کا تسلط۔ زیادہ تر معاشرے طبقاتی معاشرے تھے جن میں اعلیٰ طبقے کے امراء، جاگیرداروں، مذہبی پروہتوں، بڑے بڑے صنعتکاروں اور اعلیٰ فوجی افسروں سے ترتیب پاتے تھے۔ ان کو عیش و آرام بلکہ تعیشات کے تمام وسائل مہیا تھے اور نچلے طبقے کے لوگوں میں شدید احساس محرومی کے ساتھ ساتھ بے پناہ مصائب و آلام تھے۔ طبقہ داریت کی لعنت نے معاشروں کو مصنوعی بندشوں میں جکڑ کر فرق و امتیاز کی اتنی دیواریں حائل کر دی تھیں جن کو مذہب کا اشتراک بھی توڑ نہیں سکتا تھا۔ ایک طبقے سے دوسرے طبقے کی معاشرت نہ شادی بیاہ کے رشتے قائم ہونے دیتی تھی نہ انسانی مساوات کے کسی تصور کو پنپنے دیتی تھی۔ کنیزوں اور غلاموں کی تجارت عام تھی۔ ان سے جو سلوک کیا جاتا تھا وہ انسانیت سوز تھا۔ مثلاً تفریح کے لئے ان کو درندوں سے لڑانا، ان کو بدکاری کے لئے استعمال کرنا یا پھر بہت ہی گرے ہوئے خدمت کے کام لینا۔ بیشتر معاشروں میں شراب خوری، قمار بازی اور جنسی بے راہ روی کے فسانے عام تھے۔

عربوں کی معاشرتی زندگی میں بھی وہی تمام برائیاں موجود تھیں جو دنیا کے دوسرے معاشروں پر حاوی تھیں اس لئے محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی اس کی لعنتیں بچپن ہی سے آپ کے ذہن کو جھنجھوڑتی رہیں۔ بعثت کے بعد اور خصوصاً مدینے میں اسلامی ریاست کے قیام سے جو معاشرتی اصلاح رونما ہوئی وہ اتنی خوش کن اور انقلاب آفریں تھی کہ اس کے اثرات پورے عالم انسانیت کی میراث بنے۔

حضور اکرم ؐ نے معاشرے کی بنیاد خاندان پر رکھی اور خاندان کے افراد کی حیثیتوں کا اس طرح

تعین فرمایا کہ فلاحی معاشرے کا پہلا ستون مستحکم بنیادوں پر کھڑا ہو گیا۔ خاندان کے افراد میں شفقت و رحمت، اطاعت و حرمت، ہمدردی و رواداری، خلوص و محبت اور باہمی میل ملاپ کے جذبے پروان چڑھے۔ آپؐ نے اولاد کو والدین کی اطاعت کا حکم دیا نیز والدین کو اولاد اور آقا کو زیر دستوں سے شفقت و محبت کی تلقین کی۔

آپ نے کسی اور بنیاد پر نہیں صرف نظریے اور عقائد کی بنیاد پر پورے عالم انسانیت کو دو حصوں میں منقسم کیا کافر اور مسلمان۔ ثانی الذکر کے درمیان تو کسی طرح کی کوئی تفریق اور امتیاز باقی نہ رہنے دیا۔ مگر مسلمان اور کافروں کے مابین اعتقاد کی وجہ سے چند پابندیاں عائد کی گئیں۔ وہ بھی شادی بیاہ اور عبادات کے سلسلے میں۔ باقی معاملات اور دنیاوی اشتراک عمل، عام حقوق اور مجلسی تعلقات میں ان کو مساوی حقوق دئیے۔ غلاموں اور کنیزوں کے سلسلے میں آپ نے واضح طور پر فرمایا کہ ان سے برابری کا سلوک کرو۔ جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ۔ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔

ہر خاندان کا ایک بنیادی مسئلہ بیوی اور شوہر کے معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ آپؐ نے خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے دونوں کے حقوق و فرائض میں اعتدال و توازن، خلوص و محبت اور عدل و انصاف کے ضابطے مقرر فرمائے۔ خواتین کی عزت و آبرو اور معاشرے میں ان کی تعظیم و تکریم کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔ دور جہالت میں جو سلوک روا رکھا جاتا تھا اس کا مکمل سدِ باب کیا۔

اسلام سے پہلے جو معاشرتی برائیاں عوامی رسمیہ میں شامل تھیں اور نام نہاد مہذب معاشرے بھی ان سماجی برائیوں پر فخر کرتے تھے۔ اسلامی نظریۂ معاشرت نے ان کو جڑ سے ختم کرنے میں پہل کی۔ مثلاً شراب خوری کی لعنت عام تھی جو عربوں کی گھٹی میں بھی پڑی تھی۔ حکم ربّی کے تحت اسے حرام قرار دیدیا گیا۔ اسی طرح جوا کھیلنے کی برائی کو مٹایا اور زناکاری کے لئے سخت سزا یعنی سنگسار کرنے کا حکم ملا۔ سود خوری غریبوں اور ضرورت مندوں کے لئے وبال جان تھی۔ اسے بھی اسلام نے حرام قرار دیا۔ البتہ اس کی جگہ قرض حسنہ کی روایت قائم کی۔ محنت و مشقت کے کام صرف غلاموں اور کنیزوں سے لئے جاتے تھے۔ رسول پاکؐ نے بذات خود محنت طلب کاموں میں حصہ لیا۔ مثلاً مسجد نبوی کی تعمیر میں آپؐ خود بھی شریک رہے۔ اس طرح سب مسلمانوں کو تلقین کی کہ مشقت کے کاموں کو حقیر نہ سمجھا جائے یعنی اگر کوئی لکڑیوں کا گٹھا پیٹھ پر لاد کر لائے تو یہ کام اس بات سے بہتر ہے کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے۔

تاہم ہر معاشرے میں ایسے مستحقین بھی ہوتے ہیں جو معذور ہوں، بے سہارا ہوں، مسکین ہوں، واقعی ضرورت مند ہوں تو ان کی مدد کرنا انسانی ہمدردی کا تقاضہ ہے۔ اس لئے حضورؐ نے فرمایا "اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے" یہ بھی ارشاد ہوا کہ بہتر ہے تو اپنے وارث کو غنی چھوڑ کر مرے بہ نسبت اس کے کہ وہ تہی دست ہو اور لوگوں کے سامنے دستِ سوال پھیلاتا پھرے۔

امیروں اور دولت مندوں کو اکثر فضول خرچی اور دولت کی نمائش کا شوق ہوتا ہے اسلام میں اعتدال کی راہ اپنانے کا درس ہے۔ ارشادِ ربانی کے مطابق اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل رہتے ہیں۔

رسول اکرمؐ نے جبری مشقت، بیگار لینے اور بلا اجرت کسی سے خدمت لینے کی ممانعت فرمائی اور حکم دیا "مزدور کی مزدوری اس کا پسینا خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو"

بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام کا نظام معاشرت دلوں کو جوڑتا ہے توڑتا نہیں۔ چنانچہ آدمی کا آدمی سے رشتہ جوڑنے کی ہدایت کا ایک سلسلۂ لامتناہی اسلام کی اخلاقیات میں موجود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے "اور اپنے رشتے دار کو حق دے اور مسکین اور مسافر کو اور احسان کر اپنے والدین کے ساتھ، اپنے رشتہ داروں، ناداروں، مسکینوں، قرابت داروں، پڑوسیوں، ملنے جلنے والوں، غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ" ایک اور فرمانِ الٰہی ہے "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناروا طریقے سے نہ کھاؤ۔ بجز اس کے کہ تجارت ہو آپس کی رضامندی سے" اسی طرح رشوت، غصب، خیانت، ناپ تول میں کمی، چوری، یتیم کا مال کھانا اور ایسے ہی تمام دوسرے معاشرتی جرائم کو روکنے کے لئے اللہ تعالیٰ اور رسولِ برحق کے واضح احکام موجود ہیں۔

کوئی معاشرہ اس وقت تک تہذیب کی اعلیٰ و ارفع مثال قائم نہیں کرتا جب تک اس میں علم اور عالموں کی قدر نہ ہو۔ اسلام نے علم کی فضیلت اور عالموں کی تعظیم و تکریم پر جتنا زور دیا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ سرورِ کونینؐ نے مسلمانوں کو ایسی معاشرتی اقدار سے نوازا جو سراسر خیرِ کثیر کی ضامن ہیں۔

اسلام کا نظام سیاست و معیشت

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ نبوی سے پہلے دنیا صرف ایک ہی طرح کے سیاسی نظام سے عملی طور پر واقف تھی۔ وہ نظام شہنشاہیت و آمریت تھا۔ مطلق العنان حکمراں کو معبود یا معبود کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اس سے غلطی کا کوئی امکان کسی کے تصور میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ اسی حیثیت کے باعث اسے اقتدارِ اعلیٰ اور مکمل حاکمیت حاصل تھی۔ وہی قانون ساز بھی تھا اور قانون نافذ کرنے والا بھی۔ اسی کی عدالت سب سے بڑی عدالت تھی۔ اس کے فیصلے کے خلاف کسی دوسری عدالت میں چارہ جوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔ فوج کا سپہ سالار بھی زیادہ تر وہی ہوتا تھا اور نظامِ حکومت کا سربراہ بھی وہی۔ کسی ملک کو وہ اپنی فوج کے ذریعے چلاتا تھا اور کہیں جاگیرداروں اور امراء کے ذریعے۔ عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو پر اسے تمام اختیارات حاصل تھے۔ اس مطلق العنانی اور بلا قید حاکمیت نے سلطنت کی آبادی کو طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اکثریت کو حیوانی سطح سے بھی نچلا درجہ نصیب تھا۔ عوام کا پست طبقہ نہ حقوق رکھتا تھا نہ حقوق کو سمجھنے کا شعور رکھنے کی اجازت تھی۔ عدل و انصاف حکمرانوں کا حق تھا۔ اس قسم کی حاکمیت کے تسلسل نے وحشت و بربریت کا وہ دروازہ کھول دیا تھا کہ شریفوں کی عزتِ نفس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ انسانیت اور درندگی کا فرق مٹ چکا تھا۔

جن پسماندہ و درماندہ خطوں میں کوئی مرکزی سیاسی نظام نہ تھا وہاں قبائلی رسم و رواج تھے۔ ان کی تنظیم میں نہ کوئی حکمراں تھا نہ سیاسی قانون اور نہ قانون نافذ کرنے والی کوئی طاقت۔ قبیلے کا سردار اور اس کے کچھ حاشیہ بردار پورے قبیلے پر چھائے رہتے۔ معمولی تنازعات کا فیصلہ بھی تلوار اور خوں ریزی کرتی تھی۔ اس لئے اگر قبائل کے درمیان ایک مرتبہ تلوار چلتی تو پھر برسوں ہی چلتی

رہتی تھی۔ اس قبائلی نظام کی ساری خصوصیات جزیرہ نما عرب میں موجود تھیں۔

سرورِ دو عالمؐ نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اعلان کر کے بنیادی طور پر "قیصریت" کے حق کا انکار کر دیا اور کسی حکمراں اور بادشاہ کی اسلام کے سیاسی نظام میں کوئی گنجائش نہ رکھی۔ الحکم للہ فرما کر آپ نے قانون سازی کے تمام اختیارات انسانوں کی بجائے قانونِ الٰہی کے تابع کر دیئے۔ اس طرح عالم انسانیت میں پہلی بار مساوات کی بنیاد رکھی گئی۔ اس انقلابِ عظیم نے نہ صرف یہ کہ حاکم و محکوم کا فرق ختم کیا بلکہ فرماں روائی کے مفہوم ہی کو بدل دیا۔ آپ نے خود اپنی حیثیت یہ بتائی کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسول اور خلیفہ ہیں۔ اسی کے احکام کی خود تابعداری کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اتباع کا حکم دیتے ہیں۔ یہ بھی واضح ہو گیا کہ آپ کے بعد جو اسلام کی سیاسی تنظیم کا سربراہ ہو گا وہ آپ کا جانشین خلیفہ سمجھا جائے گا۔ آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ و جاری کرے گا۔ نہ خود کوئی قانون بنائے گا اور نہ خدائی قانون میں کوئی ترمیم و اضافہ کرے گا۔ اس کا کام حکمرانی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت ہو گا۔ احکامِ خداوندی کا اطلاق خلیفہ اور عوام پر یکساں ہو گا۔ اس سیاسی تنظیم نے سب کے یکساں حقوق مقرر کر دیئے۔ ظلم و تشدد، حق تلفی و حق سلبی، بے رحمی و ناانصافی اور ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو گیا۔

ملک کا معاشی نظام بہت حد تک سیاسی نظام کے تابع ہوتا ہے۔ اسلام سے پہلے طبقاتی معاشروں اور مطلق العنان حکومتوں میں امراء کو تمام تر معاشی مراعات حاصل تھیں یا پھر جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے تاجر بھی زندگی کی آسائشوں سے بہرہ ور تھے۔ غریب عوام کی معاشی حالت پست سے پست تر سطح پر رہتی تھی۔ نچلا طبقہ غلاموں، چھوٹے کاشتکاروں اور محنت کشوں پر مشتمل تھا جس کا کام حکمراں طبقے اور طبقۂ امراء کی خدمت کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہر ملک میں سود کی لعنت موجود تھی جس کا شکار بھی غریب کاشتکار اور مزدور ہوتے تھے۔ سود لینا مذہبی لحاظ سے جائز سمجھا جاتا تھا جیسا یہودیوں نے جائز کر رکھا تھا۔ ملک کی صنعت و تجارت پر جاگیرداروں اور مہاجنوں کا قبضہ تھا۔ کسی مذہب اور کسی قوم میں وراثت کا کوئی قانون موجود نہ تھا جو دولت اور جائداد کو زیادہ افراد تک پھیلا سکے۔ بس سب سے بڑا بیٹا باپ کے بعد مختارِ کل سمجھا جاتا تھا۔

حضور نبی کریمؐ نے سب سے پہلے تو حکومت کا مفہوم بدلا اور ایسے نظامِ سیاست کی بنیاد رکھی جس میں طبقات کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر سود کو ہر سطح پر ناجائز اور حرام قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں وراثت کا ایسا عادلانہ نظام قائم ہوا کہ پورے خاندان نے اطمینان کا سانس لیا۔ نظامِ زکوٰۃ سے غریبوں، ناداروں اور محتاجوں کی کفالت کا معقول انتظام ہو گیا۔ ساتھ ہی ہر قسم کی فضول خرچی، دولت کی نمود و نمائش اور ہوسِ زر سے روکا گیا اور یہ سب کچھ احکامِ الٰہی کے تحت کیا گیا۔ فرمانِ الٰہی نے واضح کیا "اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خبر دیدو (التوبہ)

رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں دولت صرف کرنے کی ترغیبیں دیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا "شیطان تم کو ناداری کا خوف دلاتا ہے اور بخل جیسی شرمناک بات کا حکم دیتا ہے، اللہ تم سے بخشش اور مزید عطا کا وعدہ کرتا ہے (البقرہ)" "اور تم نیک کاموں میں جو خرچ کرو گے وہ تم کو اللہ کی طرف سے پورا پورا واپس ملے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہ ہو گا۔" "اگر صدقات علانیہ دو تب بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر دو اور غریب لوگوں تک پہنچا دو تو زیادہ بہتر ہے۔" "اور احسان کرو اپنے ماں باپ کے ساتھ۔ اپنے رشتے داروں، نادار مسکینوں، قرابت داروں، پڑوسیوں، اجنبی ہمسایوں، اپنے ملنے جلنے والوں، دوستوں، مسافروں، لونڈیوں اور غلاموں کے ساتھ۔" "اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور اذیت پہنچا کر ملیا میٹ نہ کرو۔ تم نے جو کچھ کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین سے اگایا ہے، اس میں سے عمدہ اموال اللہ کی راہ میں صرف کرو نہ یہ کہ بدتر مال چھانٹ کر اس میں دینے لگو۔" (البقرہ)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا نظامِ سیاست یا نظامِ معیشت، دونوں میں اللہ اور اس کے رسولِ برحقؐ کی رضا جوئی سب سے افضل ہے۔ معیشت کو اجتماعی زندگی میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو ہمارے جسم میں ریڑھ کی ہڈی کو۔ اسلام نے اس کے استحکام اور بہترین صلاحیتوں کی صورت پیدا کی۔

تہذیب کا سفر اور اسلام

اسلام زندگی کی ازلی و ابدی حقیقتوں کا آئینہ اور عالم انسانیت کے لئے رہتی دنیا تک خیرِ کثیر کا ضامن ہے۔ اسلام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا پیغام عالمگیر ہے جس میں اعلیٰ وارفع اخلاقی و روحانی تعلیمات موجود ہیں۔ اس دینِ کامل کی روح کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں اور یہ زبردستی کسی کے سر نہ تھوپا جائے۔ قرآن حکیم صرف ان لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا "اے نبیؐ! ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بشارت دینے والا اور ہدایت دینے والا نیز اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔" امن پسندی اسلام کا لازمی خاصہ ہے۔ نوعِ انسانی کی اصل وحدت، تمام انسانوں کے ایک مشترک آغاز اور ان کی مشترک قسمت پر مبنی داستان مساوات اسلام کی روح میں مضمر ہے۔ "لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و زن دنیا میں پھیلا دیئے۔"

اسلامی نقطۂ نظر سے نسل یا قومیت کا امتیاز، ذات یا طبقے کا فخر، پیدائشی حق یا کوئی اور نسلی فضیلت، ان میں سے کوئی بات اطاعتِ الٰہی اور خدمتِ خلق پر برتری نہیں رکھتی۔ رسولِ اکرمؐ کا ارشادِ مبارک ہے "تمام نوعِ انسان ایک خاندان کی طرح ہیں جس کا نگہبان اللہ تعالیٰ ہے جس کے نزدیک سب سے محبوب شخص وہ ہے جو اس خاندان یعنی عالمِ انسانیت کے لئے زیادہ کار آمد ہے" ایک اور ارشاد مبارک ہے "عربی کو عجمی پر، سفید فام کو سیاہ فام پر برتری حاصل نہیں۔ برتری صرف اس کو حاصل ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔" نوعِ انسانی کے اغراض و عمل میں اتحاد پیدا کرنے اور انسانی مساوات قائم کرنے کا اس سے بہتر اظہار نہیں ہو سکتا، لیکن اسلام کے عالمگیر

کی وجہ سے صرف یہی نہیں کہ اسلام آخری اسلامی مذہب ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس سے پہلے کے تمام مذاہب کی روح اسلامی تعلیمات میں شامل ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عملی زندگی کے لئے اسلام نے جو اصول دیے ہیں وہ بقائے انسانی اور تہذیبِ انسانی کے سفر میں ہمیشہ رہنما اصول بنے رہیں گے۔

اسلام اپنی تہذیبی روح میں اتحاد و یگانگت، اخوت و مساوات، عدل و انصاف، صدق و صفا، ہمدردی اور ولداری اور امن و آشتی کی خصوصیات رکھتا ہے۔ اسلام ایک ایسا نسخۂ کیمیا ہے جس میں تمام ربانی سچائیاں یک جان ہوگئی ہیں۔ یہ ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے ہر متلاشی اپنی حقیقت، فیضان اور اطمینانِ قلب کا آبِ حیات پا سکتا ہے۔ کرۂ ارض پر اللہ کے خلیفہ کی حیثیت سے انسان کسی ایک مقام پر رہنے کے لئے مکلف نہیں۔ البتہ تین مقدس مراکز ایسے ہیں جو تین الہامی مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا سنگم ہیں، وہ یہ ہیں، مکہ مکرمہ جہاں بیت اللہ شریف ہے، مدینہ منورہ میں روضۂ رسول ؐ اور یروشلم میں مسجدِ اقصیٰ۔ ان مقدس مقامات کو چھوڑ کر دنیا کے باقی تمام مقامات درجے میں برابر ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "وہی تو ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ تم اس کے اطراف و جوانب میں چلو پھرو اور خدا کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ پیو"۔

تہذیبی لحاظ سے اسلام کی اقلیم ہی سب سے بڑی اقلیم ہے جس میں جغرافیائی اور تصوراتی عالمگیر حیثیتیں آپس میں گلے مل کر ایک ہو جاتی ہیں اور خیال مجسم ہو کر ایک اٹل حقیقت بن جاتا ہے۔ اسلام کو پورے عالمِ انسانیت سے روشناس کرانا درحقیقت ایک نیک کام ہے بشرطیکہ اس میں تشدد اور قوت کی بجائے نرمی اور معقول ترغیب و تلقین سے کام لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں فرمایا "اے نبی ؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت اور عمدہ نصائح کے ذریعے دعوت دیجیے اور ان کے ساتھ بہترین طریقے پر بحث کیجیے"۔

اسلام کو ناحق بدنام کرنے والے اکثر ان آیاتِ ربانی کا حوالہ دیتے ہیں جن کا تعلق صرف جہاد سے ہے۔ نادان مخالفین یہ نہیں سمجھتے کہ جہاد اللہ تعالیٰ کے لئے جہد و عمل سے عبارت ہے اس کا مفہوم جنگ و جدل نہیں۔ طلوعِ اسلام کے آغاز ہی سے کفر و باطل کی طاقتیں دینِ حق کی دشمن بن گئیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان طاقتوں نے جب مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو آخری چارہ کار یہی تھا کہ ان کی جارحانہ و ظالمانہ سرکشی کے جواب میں دفاعی جنگ لڑی جائے۔

دراصل اسلام ہی مذاہبِ عالم میں پہلا مذہب ہے جس نے جنگ کے دوران بھی اعلیٰ اخلاقی قدروں اور احکام ربانی کو ملحوظِ خاطر رکھنے کا درس دیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے "اگر تم بدلہ لو تو بس اس قدر جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو، لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے۔"

اسلام جہاں جہاں بھی پہنچا وہاں اس نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اسلام کی روحانیت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ تہذیب و تمدن پھیلانے والا دین ہو۔ اسلام تہذیب و شائستگی کو فروغ دینے والا نظامِ حیات و کائنات ہے۔ اسلامی معاشرے کا مقصد اسلام کے نظریے کی روشنی میں ایسی مذہبی اور سماجی فضا سازگار کرنا ہوتا ہے جس میں لوگ ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے بستے ہیں، اکٹھے عبادت کرتے اور ایک مشترکہ نصب العین پر عمل کرتے ہیں۔

اسلام معاشرتی انتشار اور افتراق کی بجائے اجتماع اور اتحاد و یگانگت کی ترغیب دیتا ہے۔ کام کاج اور عبادات کی سہولتیں فراہم کرنے کے علاوہ اسلامی معاشرہ تہذیب و ثقافت کی تعمیری سرگرمی کا بھی محرک ہوتا ہے۔

اسلام کی سیدھی سادی سچی تعلیم یہی ہے کہ انسانیت کی بہتر سے بہتر خدمت کی جائے تمام نسلی، لسانی، جغرافیائی، طبقاتی اور طرح طرح کے فروعی تنازعات کو ختم کر کے عالمی سطح پر ایک ایسا نظامِ عدل و انصاف بروئے کار آئے جو امن و آشتی اور تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا محور ہو۔ اقوام کے درمیان مفاہمت اور رواداری کی فضا پیدا ہو تاکہ ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا
مروّت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

ہندوستان کی آریائی تہذیب

آریائی تہذیب نے دنیا کی قدیم تہذیبوں پر جو اثرات ڈالے ان کی نوعیت مختلف ملکوں میں مختلف رہی ہے۔ مثلاً ایران میں جو آریائی قبیلے جا بسے انہوں نے ایرانی تہذیب کے ارتقاء کا فریضہ انجام دیا اور یونان میں جو آریائی نسلیں آباد ہوئیں انہوں نے یونانی تہذیب کے خدوخال نکھارے۔ اسی طرح درۂ خیبر کے راستے جو آریائی قبیلے برصغیر پاک و ہند میں داخل ہوئے انہوں نے ہند آریائی تہذیب کو جنم دیا۔

ہندوستان میں آریاؤں کی آمد اب سے چار ہزار برس پہلے شروع ہوئی اور آریائی قبیلے وسط ایشیا کے علاقوں سے ادھر آئے۔ پہلے وہ پنجاب میں پانچ دریاؤں کی سرزمین پر بسے پھر کشمیر اور دوسرے کئی علاقوں میں پھیل گئے۔ اس طرح ان کی آبادیاں زیادہ تر کاشتکاری اور گلہ بانی کی غرض سے ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں بڑھنے لگیں۔

آریائی قبیلوں سے پہلے اس وسیع و عریض سرزمین پر کئی قدیم قومیں آباد تھیں۔ جن میں نمایاں حیثیت دراوڑی لوگوں کی تھی جو سیاہ رنگ اور مضبوط جسامت کے لوگ تھے ان کے بارے میں تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ وہ کب اور کس طرح یہاں آئے تھے۔ بہرحال یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ آریائی قبیلوں سے دراوڑوں کی جنگیں ہوئیں جو صدیوں جاری رہیں اور کافی خوں ریزی کے بعد آریاؤں نے غلبہ پایا۔ ان جنگوں کا حال ہندوؤں کی قدیم کتابوں مثلاً رگ وید کے ذریعے معلوم ہوتا ہے جس میں یہاں کی قدیم قوموں کو جنگلی اور بربری کہا گیا ہے۔ مگر حقیقت میں دراوڑی لوگ نہ جنگلی

تھے نہ غیر مہذب اور بربری بلکہ انہوں نے قدیم زمانوں میں مہذب زندگی کے وہ نقوش اجاگر کئے تھے جن کا ثبوت موہن جو دڑو، ہڑپہ اور کئی دوسرے قدیم تہذیبی خطوں کے آثارِ قدیمہ سے ملتا ہے۔

آریائی لوگوں نے ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد دو اہم کام انجام دیئے، ایک یہ کہ قدیم باشندوں سے جنگیں کرکے ان کو شمالی ہند سے جنوبی علاقوں کی طرف کوچ کرنے پر مجبور کیا۔ دوسرا کام یہ کہ انہوں نے مذہبی کتابیں تصنیف کیں جو رگ وید کے نام سے رزمیہ گیتوں اور مذہبی بھجنوں کی شکل موجود ہیں اور جن سے آریائی نسلوں کی فتوحات، طرزِ زندگی اور مذہبی عقیدوں کا پتہ چلتا ہے۔

آریائی دیوتاؤں کی تعداد کافی تھی ان دیوتاؤں کی مورتیں بنا کر انہوں نے اپنی عبادت گاہیں بنائیں جو مندر کہلائیں۔ شمالی ہند پر قبضہ جمانے کے بعد آریاؤں نے اسے آریہ ورت کا نام دیا یعنی آریائی نسلوں کا دیس۔ آگے چل کر وہ زمانہ آتا ہے جسے دورِ شجاعت یا انگریزی میں Epic Age کہتے ہیں۔ یہ زمانہ ایک ہزار سال قبل مسیح سے ۵۰۰ قبل مسیح تک شمار ہوتا ہے۔ اس سلسلے کی دو رزمیہ داستانیں 'رامائن' اور 'مہابھارت' کے نام سے موسوم ہیں۔ رامائن میں اجودھیا کے راجہ دسرتھ کے سب سے بڑے بیٹے رام چندر جی کو زبردست ہیرو کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ مہابھارت کی داستان کا محور کوروں اور پانڈوں کی جنگ ہے جس میں کرشن جی مہاراج نے بھی حصّہ لیا۔ مذہبی لحاظ سے ہندو رام چندر جی اور شری کرشن جی کو اوتار کا درجہ دیتے ہیں اور ان کے بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے رامائن اور مہابھارت میں مستند حقائق موجود نہیں۔ البتہ ان کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے۔

جیسے جیسے آریائی قبیلوں نے فتوحات حاصل کیں اور شمالی ہند کے زرخیز علاقوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ کئی آریائی ریاستیں بھی وجود میں آگئیں۔ ہر ریاست کا راجہ الگ

تھا۔ اس کے درباریوں میں امراء اور قبائلی سردار ہوتے تھے جن کو انتظامی امور بھی سونپے جاتے تھے۔ ریاستیں بڑی بھی تھیں اور چھوٹی چھوٹی بھی جن میں اقتدار کی جنگ جاری رہتی تھی۔ مثلاً مہابھارت کی جنگ میں شمالی ہند کی تمام ریاستیں شریک ہوئیں۔

آریائی تہذیب میں ذات پات کی بندشیں زیادہ سخت تھیں۔ برہمنوں کا شمار اعلیٰ ذات اور اعلیٰ طبقے میں ہوتا تھا جو مذہبی اعتبار سے بھی بڑا درجہ رکھتے تھے۔ برہمنوں کے بعد کھشتریوں یا چھتریوں کا درجہ تھا جو پہلے دور شجاعت میں جنگی کارناموں کے سبب برہمنوں سے افضل سمجھے جاتے تھے لیکن بعد میں ان کی حیثیت ثانوی ہوگئی۔ تیسرا طبقہ دیشوں کا تھا جو زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت سے وابستہ تھا۔ زیادہ تر ٹیکس اسی طبقے سے وصول کئے جاتے تھے۔ چوتھا اور سب سے نچلا طبقہ شودروں کا تھا جن کو اچھوت کہا جاتا تھا۔ اس طبقے کے لوگ زیادہ تر قدیم نسلوں کے غیر آریائی باشندے تھے جن کو آریائی سرداروں نے غلام بنالیا تھا۔ ان کے ذمّہ گھروں کی صفائی پالتو جانوروں اور مویشیوں کی خدمت اور محنت و مشقت کے چھوٹے چھوٹے کام تھے۔ ان لوگوں کو نیچ ذات کا سمجھا جاتا تھا۔ یہ آریائی عبادت گاہوں میں داخل نہیں ہوسکتے تھے۔ نہ ان کے بھجن اور اشلوک سُن سکتے تھے۔ اگر اس کے خلاف کوئی شودر بھجن وغیرہ سُن لیتا تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا گرم سیسہ ڈال دیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طبقے کو آریہ سماج میں سب سے زیادہ مظلوم طبقے کی حیثیت حاصل تھی۔

آریائی معاشرے میں بڑی ذاتوں کی خواتین کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سیتاجی کا کردار عورت کا معیار خدمت اور پارسائی کی دلیل تھا۔ ماں کی خدمت اولاد پر فرض سمجھی جاتی تھی۔ عورتوں کو حکومت کے معاملات اور سیر و تفریح میں برابر کا درجہ حاصل تھا۔

آریاؤں میں شراب کثرت سے استعمال کی جاتی تھی۔ جوا کھیلنا بھی عام تھا۔ مہابھارت کی جنگ کا خاص سبب یہی ہوا تھا کہ پانڈوں کے سب سے بڑے بھائی یدھشٹر نے جوئے میں اپنی بیوی درجپدی کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا اور وہ کوروں کے قبضے میں چلی گئی تھی۔

شروع شروع میں آریاؤں کی مذہبی رسمیں بہت سادہ تھیں۔ پھر ایک ایسی مافوق الفطرت ہستی کا تصور پیدا ہو گیا تھا جس نے زندگی اور کائنات کی تخلیق کی تھی۔ اس کو "پرماتما" اور "برھما" کا نام دیا گیا۔ بعد میں برہما کو کائنات کا خالق، کائنات کو قائم رکھنے والا "وشنو" اور کائنات کی ہر چیز تباہ کرنے والا "شو" تھا۔ اس طرح تین دیوتاؤں کی پوجا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کے بتوں کی پوجا ہونے لگی۔

رفتہ رفتہ مختلف تہذیبی رجحانات و میلانات اور اصلاحی تحریکوں نے آریائی تہذیب کے خدوخال میں خاصی تبدیلیاں پیدا کیں۔ بودھ مت کی تحریک، جین مت کی تحریک اور خصوصاً اسلام کی تعلیمات نے آریائی تہذیب میں انقلابی تبدیلیاں رونما کیں، جس کی جھلکیاں ہندوستان کے مسلم فرمارواؤں کے عہد میں ملتی ہیں۔

ہند آریائی تہذیب پر ایرانی اور یونانی اثرات

اب سے ڈھائی ہزار سال قبل ہندوستان میں آریائی ریاستوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ شمالی ہندوستان کے علاوہ جنوبی علاقوں میں بھی آریائی مقبوضات بڑھ گئے تھے۔ نئے نئے علاقوں کو فتح کیا جارہا تھا اور نئی نئی ریاستیں قائم ہو رہی تھیں۔ کوہ ہمالیہ اور دریائے نربدا کے درمیان تقریباً سولہ آریائی ریاستیں تھیں۔ ان تمام ریاستوں پر مختلف ہندو خاندان حکمراں تھے۔ چھوٹی اور بڑی ریاستوں کی کثیر تعداد کے سبب خانہ جنگی بھی ہوتی رہتی تھی۔ اکثر بڑی ریاستیں چھوٹی ریاستوں کو فتح کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتی تھیں۔

ان سیاسی حالات میں کوئی بھی بیرونی طاقت ہندوستان پر حملہ کرکے اپنے قدم جما سکتی تھی۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں ایرانیوں نے ہندوستان پر حملے شروع کر دیے تھے اور ایرانی شہنشاہ دارا کے زمانے میں دریائے جہلم تک کا علاقہ ایرانی سلطنت میں شامل ہو گیا تھا اور ایرانی سلطنت کا ایک صوبہ قرار دے دیا گیا تھا۔ ایران نے پنجاب کے لوگوں پر اپنے تہذیبی و تمدنی اثرات قائم کئے۔ ان کے طرز حکومت، طرز تحریر اور تعمیر کے فن کو پنجاب میں کافی فروغ ہوا۔ پنجاب کے لوگ ایرانی فوج میں شامل ہو گئے اور بعض مورخین کے مطابق جب ایران اور یونان کی جنگیں ہوئیں تو ان میں ہندوستان کے فوجی ایران کی طرف سے شریک ہوئیں۔ لیکن ایرانی سلطنت کو زوال ہوا تو جو علاقے ایران کے زیر اقتدار تھے ان پر یونانیوں کا قبضہ ہو گیا اور پہلا یونانی حکمراں جس نے ہندوستان کی سرحدوں کو عبور کیا، سکندر اعظم تھا جس کے حملے کے بعد سے ہی ہندوستان کی تاریخ کا صحیح طور پر آغاز ہوتا ہے۔

۳۲۷ ق م میں ایران کو فتح کرنے کے بعد سکندر دریائے سندھ کو عبور کرکے آسانی

سے ٹیکسلا پہنچ گیا جہاں کے راجہ نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ٹیکسلا کے بعد پنجاب کے راجہ پورس کی ریاست پر حملہ کیا۔ دونوں طرف سے ہزاروں سپاہی مارے گئے۔ راجہ پورس کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار کر کے سکندر کے سامنے لایا گیا مگر راجہ کی بہادری کا سکندر پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے پورس کی جیتی ہوئی حکومت اسے واپس کر دی اور دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ سکندر اپنی فتوحات کو اور بڑھانا چاہتا تھا لیکن اس کی فوج راضی نہ ہوئی اور مجبوراً اسے واپس ہونا پڑا۔ واپسی سے پہلے سکندر نے اپنے مفتوحہ علاقے کو تین صوبوں تقسیم کیا جن کے نام گندھارا، سندھ اور پنجاب تھے۔ ان صوبوں کے لئے اس نے اپنے گورنر مقرر کئے۔ جنھوں نے کئی نئے شہر ان علاقوں میں آباد کئے اور مجموعی طور پر تینوں صوبوں میں یونانی تہذیب و تمدن کے اثرات بھی نمایاں ہوئے جو آریائی تہذیب میں شامل ہو کر ہماری تہذیب و تمدن کا حصہ بن گئے۔

سکندر کے حملے سے جو یونانی اثرات ہندوستان پر پڑے تھے وہ زیادہ تر شمال مغربی علاقوں تک ہی محدود رہے۔ اس زمانے میں ایک بڑی ریاست مگدھ کی تھی جس پر نندا خاندان کی حکومت تھی اور سکندر چاہتا تھا کہ اسے بھی فتح کر لے مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور وہ واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جن علاقوں پر یونان کا قبضہ ہوا تھا ان کے قرب و جوار کی آبادی کے ہندوؤں نے حملہ کر دیا اور انھیں کافی حد تک آزاد کرا لیا۔ ان جنگوں میں ہندوستان کے مستقبل کی ایک حکمراں شخصیت چندر گپت موریا نے بڑی بہادری دکھائی حالانکہ وہ نندا حکمراں کا ایک فوجی افسر تھا اور راجہ کے عتاب نے اسے جلاوطن کر کے پنجاب بھجوا دیا تھا۔ اس جلاوطنی کے زمانے میں اس کی ملاقات چانکیہ سے ہوئی جو بہت بڑا شاطر تھا اس نے چندر گپت کی مدد کی اور چندر گپت نے پنجابی سپاہیوں کی مدد سے ۳۲۲ ق م میں مگدھ کی ریاست پر قبضہ کر کے چانکیہ کو وزیرِ اعظم بنایا اور موریہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ پھر تھوڑے ہی عرصے میں وہ ایک طاقتور حکمراں بن گیا اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو فتح کر کے پنجاب کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔

جب سکندر کی مشرقی فتوحات کے وارث سیلوکس (Seleucus) کو پنجاب میں یونانیوں کی شکست کا علم ہوا تو اس نے سندھ کو عبور کر کے پنجاب پر حملہ کیا۔ چندر گپت نے اسے شکست دے دی،

اور دونوں میں اس شرط پر صلح ہوئی کہ پانچ سو ہاتھی سیلوکس کو چندر گپت موریہ نے دیے اور ان کے بدلے کابل، قندھار، ہرات اور بلوچستان کے علاقے موریہ سلطنت میں شامل ہو گئے۔ سیلوکس نے اپنی بیٹی کی شادی بھی چندر گپت سے کر دی تاکہ یونان اور ہندوستان میں جنگ کا پھر کوئی امکان نہ رہے۔

اس طرح موریہ سلطنت کا شمار ایشیا کی سب سے بڑی سلطنت میں ہونے لگا۔

چندر گپت موریہ کے عہد کی تاریخ کے دو اہم ماخذ ہیں۔ ایک تو یونانی سفیر میگھستینیز کی یادداشتیں اور دوسرے چانکیہ کی تصنیف، ارتھ شاستر، ان دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی سلطنت کتنی وسیع تھی اور انتظام سلطنت کتنا مستحکم۔ اس نے پوری سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اپنے خاندان کے معتبر افراد کو صوبوں کا گورنر بنایا۔ ان سب کی نگرانی وہ خود کرتا تھا۔ انتظام سلطنت کے لئے تیس محکمے قائم کئے جن میں خزانہ، فوج، رفاہ عامہ، جاسوسی، زراعت، صنعت وحرفت، اور تجارت جیسے اہم محکمے شامل تھے۔ ہر محکمے کا انتظام پانچ ماہرین کے بورڈ کو کرنا ہوتا تھا۔ ٹیکسوں کی تعداد کم تھی۔ کسانوں سے پیداوار کا ایک چوتھائی ٹیکس کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔ شہری انتظام کے لئے میونسپلٹی کی طرح کے ادارے قائم تھے۔ چندر گپت، امور سلطنت کے اہم معاملات میں اپنے وزیروں سے مشورہ کرتا تھا۔ عدل وانصاف کا اعلیٰ نظام تھا۔

ایک عظیم الشان ہندوستانی سلطنت پر چندر گپت نے چوبیس سال حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بندوسار حکمراں بنا اور پھر اشوک جسے تاریخ میں اشوک اعظم کہا جاتا ہے۔

موریہ سلطنت کے عروج میں یونانی اثرات کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ ان اثرات کی بدولت تہذیبی سفر میں اہم سنگِ میل نظر آتے ہیں۔

غزنوی سلطنت

تاریخ عالم میں محمود غزنوی کا نام ایک عظیم فاتح کی حیثیت سے آتا ہے جس نے غزنوی سلطنت کو بام عروج پر پہنچایا۔ غزنوی سلطنت کی بنیاد ایک ترک امیر الپتگین نے رکھی تھی جو احمد بن اسمٰعیل سامانی کا غلام تھا۔ اپنی صلاحیتوں سے وہ اموی خلیفہ عبدالملک کے عہد میں مختلف عہدوں پر فائز رہا۔ بعد میں وہ عبدالملک کی وفات ہوتے ہی خراسان چھوڑ کر افغانستان چلا گیا اور وہاں غزنی شہر پر قبضہ کر کے غزنوی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ الپتگین کی وفات پر اس کا بیٹا ابواسحاق تخت نشین ہوا، مگر وہ چند ماہ بعد مر گیا۔ اس کے بعد سبکتگین نے تخت سنبھالا جس کی صلاحیتوں سے سلطنت مضبوط ہوئی، لیکن اس میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا۔ سبکتگین کے بعد محمود غزنوی تخت نشین ہوا جس نے اپنے باپ کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا۔ اس نے غزنوی سلطنت کو شمال میں خراسان اور ترکستان، مشرق میں پنجاب اور مغرب میں ایران تک پھیلا دیا۔

غزنوی سلطنت کے قیام سے ہی نوزائیدہ سلطنت کا تصادم شمالی ہند کے ہندو راجا جے پال سے ہوا۔ سبکتگین کے عہد میں دونوں کے درمیان دو جنگیں ہوئیں۔ پھر جب سلطان محمود غزنوی کا زمانہ آیا تو اس نے جے پال اور اس کے بیٹے انند پال کو زبردست شکست دے کر اس کے تمام حلیفوں کو جو نگر کوٹ، قنوج، تھانیسر، متھرا، اجمیر، کالنجر، گوالیار اور گجرات کے حکمراں تھے۔ یکے بعد دیگرے سزا دی۔ عام روایت یہ ہے کہ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور سب سے بڑا حملہ گجرات کے عظیم الشان مندر پر تھا جو سومناتھ کا مندر کہلاتا تھا۔ اس حملے سے جو زبردست خزانہ ملا اس سے غزنوی سلطنت مالامال ہو گئی۔

روایت ہے کہ محمود غزنوی نے ان تمام ریاستوں سے بدلہ لینے کی ٹھانی تھی جنھوں نے جے پال اور اس کے بیٹے انند پال کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے اسے کئی حملے کرنا پڑے لیکن چونکہ گجرات کا علاقہ دور دراز

تھا اور راستے میں بے آب و گیاہ صحرائی علاقے پھیلے ہوئے تھے اس لئے سومناتھ پر حملہ کرنے کی بھرپور تیاری کرنا ہوتی تھی۔ ادھر ہندوستان کے تمام راجے، مہاراجے اسے ایسا مرکز بنائے ہوئے تھے کہ اس کی حفاظت کا زبردست انتظام کیا گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر محمود نے اس مندر پر حملہ کیا تو خود برباد ہو جائے گا۔ لیکن محمود غزنوی اور اس کی فوج کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ پچھلے حملوں میں بہت مالِ غنیمت ملا تھا۔ اس نے پوری طاقت سے حملہ کیا۔ بڑی سخت مزاحمت ہوئی اور جب ہندو راجاؤں اور مندر کے محافظوں نے دیکھا کہ سومناتھ دیوتا کی حفاظت نہیں ہو سکتی تو انھوں نے بھاری رقوم دینے کی پیشکش کی۔ محمود غزنوی کے دل میں ان رقومات کے حصول کا خیال بھی آیا، مگر اس کے عقلمند غلام ایاز نے جو مشیرِ خاص بھی تھا یہ کہا: "آپ بت شکنی کرنے نکلے ہیں، بت فروشی کے لئے نہیں۔" بہر کیف محمود غزنوی کا حملہ کامیابی سے ہمکنار ہوا اور وہ سب منکر الزر کی سرکوبی کرکے بہت سا مال و متاع لے کر غزنی واپس چلا گیا۔ واپس پہنچ کر اس نے غزنی شہر کو عروس البلاد بنانے پر بہت رقم خرچ کی اور تہذیبی و تمدنی لحاظ سے بھی ایسے کارنامے انجام دیے کہ اس عظیم فاتح کا نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے لکھ دیا گیا۔ وہ خود بھی عالم فاضل اور راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور اس کی خواہش تھی کہ غزنی علم و ادب میں ممتاز مقام حاصل کرے۔

غزنی سلطنت اور محمود غزنوی لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی نے عظیم فتوحات کے ساتھ ساتھ غزنی کو علم و تمدن کا بھی مثالی مرکز بنا دیا جس کی نظیر اس عہد میں نہیں ملتی۔ غزنی میں اس نے ایک بہت بڑا علمی عجائب گھر، ایک عالیشان کتب خانہ اور ایک بہت بڑی جامعہ قائم کی جس کے لئے دور دور سے بلند پایہ عالموں اور فنونِ لطیفہ کے ماہروں کو غزنی کھینچ بلایا۔ فارسی شعر و ادب کی ترقی و توسیع پر بطورِ خاص توجہ دی گئی۔ کہتے ہیں کہ تقریباً چار سو شعراء اس کے دربار سے وابستہ تھے ان میں عنصری، فرخی، اسدی، منوچہری اور فردوسی جیسے قادر الکلام بھی شامل تھے۔ عنصری اس کے دربار کا ملک الشعراء تسلیم کیا جاتا تھا۔ علما اور فضلا میں بھی بڑے بلند پایہ لوگ تھے مثلاً البیرونی، بیہقی، عتبی، ابو محمد ناصحی، ابو العباس، خواجہ احمد ابن حسن میمندی، ابو نصر مشکان، ابو الفتح اور کئی مورخ، فلسفی، محدث، فقیہ، مفسر، طبیب، مہندس وغیرہ۔

فقہ پر خود محمود غزنوی کی تصنیف کردہ کتاب کا نام لیا جاتا ہے جو "تفرید الفروع" کے نام سے موسوم ہے۔

محمود غزنوی کے پاس دولت کی کمی نہ تھی جسے اس نے فضول کاموں میں ضائع نہیں کیا بلکہ طرح طرح کے تہذیبی کاموں اور غزنی کو خوبصورت ترین شہر بنانے کا جو ارمان تھا اسے پورا کرنے میں اسے مال و دولت سے بڑی مدد ملی۔ غزنی میں جب محمود نے بہت ہی سرسبز و شاداب باغ لگوا کر اپنے لئے محل بنوایا اور وہاں اعیان حکومت، امرائے سلطنت اور خود شاہ مملکت کی ضیافت کی تھی تو اس موقع پر شاہ سبکتگین نے کہا تھا: "یہ باغ اور محل بہت عمدہ اور دلفریب ہے مگر اس قسم کا باغ اور مکان ہر وہ امیر بنا سکتا ہے جس کے پاس دولت ہے مگر بادشاہوں کے لئے لازم ہے کہ وہ ایسی عمارت تعمیر کریں جس کی مثال دوسرے امراء تیار نہ کر سکیں، ایسی عمارت علم و عمل ہی سے بنتی ہے۔" محمود نے باپ کی یہ نصیحت گرہ میں باندھ لی اور پھر ساری زندگی اس پر عمل پیرا رہا۔ وہ خلافت کی مرکزیت کا حامی تھا اور اس کی بالادستی کو قبول کرتے ہوئے وہیں سے حکمرانی کا اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔ اس نے اکثر خلیفہ کی خدمت میں تحفے اور نذرانے بھیجے۔ دربار خلافت سے محمود غزنوی کو یمین الدولہ والملت کا خطاب ملا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ مشہور و معروف شاعر فردوسی کو شاہنامہ لکھنے کے لئے محمود غزنوی ہی نے کہا تھا اور ہر شعر کے لئے ایک اشرفی مقرر کی تھی، لیکن جب شاہنامہ مکمل ہوا اور فردوسی نے اسے محمود غزنوی کی خدمت میں پیش کیا تو وہ ایفائے وعدہ نہ کر سکا اور فردوسی کو محروم واپس جانا پڑا اور وہ اس صدمے سے بہت نڈھال ہوا۔ ادھر محمود کو اس کے مشیروں نے احساس دلایا کہ فردوسی کو حسب وعدہ انعام ملنا چاہیئے۔ مگر جب انعام کی ڈھیروں اشرفیاں فردوسی کے گھر بھیجی گئیں تو اس وقت فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔ تاریخ نویسوں کا اس بارے میں کچھ اختلاف ہے، لیکن اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں کہ محمود غزنوی ایک علم دوست حکمراں اور عظیم فاتح تھا۔

عیسائیوں کی مذہبی کتابیں

عیسائیوں کی مذہبی کتاب جسے بائبل اور عرف عام میں انجیل مقدس کہا جاتا ہے دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ عہد نامہ عتیق کہلاتا ہے جسے انگریزی میں Old Testament کہتے ہیں اور دوسرا حصہ عہد نامہ جدید یعنی New Testament۔ پہلے حصے میں وہ تمام قدیم مذہبی صحیفے شامل ہیں جن میں توراۃ و زبور جیسی الہامی کتب شمار ہوتی ہیں۔ دوسرے میں ۲۷ اجزا ہیں۔ ۴ جزو انجیل مقدس کے اور باقی ۲۳ جزوں میں پادریوں کے خطوط اور مکاشفات شامل ہیں۔ چوں کہ عیسائیت کی بنیادیں یہودیت پر قائم ہوئی تھیں اور حضرت عیسیٰؑ کا تعلق بھی اسی قدیم مذہب سے تھا اس لیے عیسائیت اور یہودیت کی تعلیمات میں خاصی مماثلت پائی جاتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے حواریوں نے پیغمبر عیسائیت کی زندگی اور تعلیمات کے کوائف کو قلمبند کیا۔ ممکن ہے ان کی زندگی ہی میں انجیل مقدس کا کچھ حصہ ضابطۂ تحریر میں آگیا ہو، مگر اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ مختلف رسالوں میں جو تحریریں جمع ہوئیں اور جن میں سے چار کو مستند تصور کیا گیا۔ ان کے نام انجیل متی، مرقس، لوقا اور یوحنا ہیں۔ یہ رسالے حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں یا سینٹ پال کے مریدوں نے ترتیب دیے اور ان کے قدیم ترین نسخے یونانی زبان میں محفوظ ہیں۔

عیسائیت کی اشاعت چونکہ یہودیت کی بنیادوں پر ہی استوار ہوئی تھی اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا مقصد بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کو تلاش کرنا تھا اس لئے یہودیت اور عیسائیت کی مذہبی تعلیمات میں بڑی مماثلت پائی گئی۔ حضرت عیسیٰؑ نے خدا کی توحید اور رسولوں پر ایمان لانے کی تعلیم دی تھی۔ اچھے اور برے اعمال کی جزا اور سزا کا سبق دیا تھا اور لوگوں کو اس یوم الحساب

سے ڈرایا تھا جب ہر شخص کے اعمال کی باز پرس ہوگی۔ علاوہ ازیں صبر و قناعت، رواداری، ہمدردی اور عجز و انکسار کا درس تھا، لیکن آپ کے بعد حق و صداقت کی تعلیم کو بھلا کر لوگوں نے عیسائیت پر یونانی تصورات غالب کر لیے۔

سینٹ پال نے پہلی صدی عیسوی ہی میں کلیسائی نظام قائم کر دیا تھا اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا بتایا تھا۔ سینٹ پال کے بعد عیسائیت میں خدا کا تصور اور زیادہ پیچیدہ ہوتا گیا اور عیسائی تین فرقوں میں بٹ گئے، لیکن تثلیث کے عقیدے کو نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کلیساؤں میں حضرت عیسیٰؑ کے مجسمے رکھے گئے۔ پھر اسکندریہ کے عیسائی علماء نے حضرت مریم کو مادرِ خدا کا خطاب دے کر انھیں بھی لائقِ عبادت قرار دیا اور ان کے بت بھی کلیساؤں میں سجا دیے گئے۔
اس طرح عیسائیت میں بت پرستی کا رواج چل نکلا، لیکن آگے چل کر عیسائی دنیا میں کئی تحریکیں بھی پیدا ہوئیں جنھوں نے پاپائے روم کی ہمہ گیر عظمت سے انحراف کی صورتیں پیدا کیں اور عیسائیت میں کئی فرقے پیدا ہو گئے۔ خصوصاً مارٹن لوتھر نے قدامت پسندی کے خلاف آواز اٹھائی اور زیادہ توجہ عیسائیوں کی اخلاقی حالت سدھارنے کی طرف دی۔

عیسائیت کی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور قدیم عیسائیت کا جو ابتدائی آٹھ عیسوی صدیوں پر محیط رہا۔ اسی دور میں اسے رومن سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ دوسرا دور نویں صدی عیسوی سے سولھویں صدی عیسوی تک جس میں روم کی کلیسائیت سارے یورپ میں تسلیم کی گئی۔ اسی دور میں مغربی ممالک کی عیسائی ریاستیں روم کے پوپ کی اطاعت گزار سمجھی گئیں۔ علاوہ ازیں مشرق میں بھی عیسائیت کا دوسرا مرکز قسطنطنیہ بنا۔ اس طرح مشرق میں جو عیسائیت پھیلی اسے تقلید پسند (Eastern Northodox) کہا گیا۔ اسی درمیانی دور میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین صلیبی جنگیں ہوئیں۔ تیسرا دور موجودہ دور ہے جو سولھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا اور تا حال قائم ہے۔ اس عرصے میں مختلف اصلاحی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ خصوصاً ایسی تحریکیں بھی جنھوں نے عیسائی مذہب کو انسان کی ذات تک محدود کر دیا اور مذہب کو ذاتی معاملہ بنا دیا۔
یورپ میں جیسے جیسے سائنسی علوم اور مادی وسائل کی ترقی ہوئی عیسائیت کی قدیم تصورات میں بھی نشیب و فراز رونما ہوئے اور عیسائی دنیا مذہبی طور پر کئی اہم فرقوں میں تقسیم ہو گئی جن میں تین

کی اہمیت نمایاں ہے۔ ایک فرقہ مشرق کے تقلید پسندوں کا، دوسرا فرقہ روایتی عیسائیت یعنی رومن کیتھولک کا اور تیسرا فرقہ عیسائیت کے جدید رجحانات رکھنے والوں یعنی پروٹسٹنٹ کا۔

مشرق کے تقلید پسند تو پہلے ہی روم کی پاپائیت کے اثرات سے باہر آگئے تھے۔ ان کے نزدیک اعتقاد سے زیادہ طریقۂ عبادت اور اقرار گناہ کو اہمیت حاصل ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں آکر نجات کا باعث بنیں گے۔ تقلید پسندوں کے لیے عبادت کے سات طریقے ہیں یعنی عیسائیت میں خود کو داخل کرنا جسے بپتسمہ (Baptisma) کہتے ہیں، گناہوں سے توبہ کرنا، مقدس احکامات کی پیروی، ظہور ربانی یعنی خدا کی عبادت میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی عبادت کا شامل ہونا، مذہبی تہوار منانا، شادی کرنا اور مریضوں کی خبر گیری پر توجہ دینا۔ یہ طریقے اور اعتقادات مشرقی ملکوں تک محدود نہ رہے بلکہ یورپ، امریکا، افریقہ اور آسٹریلیا میں بھی پھیلے۔ رومن کیتھولک فرقہ عبادت سے زیادہ اعتقادات پر زور دیتا ہے۔ مثلاً اگر دنیا کی تخلیق، زوالِ آدم، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت، روزِ جزا، جنت اور دوزخ کے وجود پر یقین کامل ہو تو عیسائی مذہب میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اس فرقے میں پادریوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو کلیسا کے لئے وقف کر دیں۔

سولہویں صدی عیسوی میں جرمنی کے مصلح مارٹن لوتھر نے جو اصلاحی تحریک چلائی اسے پروٹسٹنٹ کہا گیا۔ مارٹن لوتھر کے زمانے میں کلیساؤں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے گناہوں کے معافی نامے بہت بڑی تعداد میں فروخت ہونے لگے جن کے خلاف لوتھر نے آواز اٹھائی۔ اس کا کہنا تھا کہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا، معافی نامے خریدنے سے بہتر ہے۔ لوتھر کو کلیسا سے خارج کر دیا گیا۔

لوتھر کے علاوہ ایک اور مصلح جان کالون کا نام آتا ہے جو عیسائیت کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی تعلیمات کے مطابق خدا قادرِ مطلق ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل اس کے اختیار میں ہیں۔ اسے انسانوں کے تمام اعمال کا علم ہے۔ کالون کے نزدیک انسان کی نجات کا تعلق اچھے اعمال سے ہے، کلیسائی نظام سے نہیں۔

امامِ عمرانیات علامہ ابنِ خلدون

عرب فاتحین پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ایشیا اور افریقہ میں اسلام کا بول بالا کرنے کے بعد یورپ میں داخل ہوئے اور اسپین پر اسلامی پرچم لہرادیا جس کے بعد بے شمار عرب خاندان وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ ان میں جنوبی عرب کے مشہور قبیلے حضرموت کا ایک شخص خالد بن عثمان بھی تھا جس نے اسپین کے شہر اشبیلیہ میں سکونت اختیار کر لی۔ یہی وہ خالد ہے جو آگے چل کر خلدون یعنی خالدِ اعظم کہلایا۔ وہ اشبیلیہ میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا اور کچھ دنوں اس شہر کا حاکم بھی رہا۔ لیکن نویں صدی ہجری میں جب مسلمانوں کو عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے سبب اسپین چھوڑنا پڑا تو خلدون نے طیونس کو اپنا مسکن بنایا۔

ابنِ خلدون یکم رمضان ۷۳۲ھ مطابق ۲۷ مئی ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی پھر قرآن مجید حفظ کیا۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ دیگر علوم پر بھی دسترس حاصل کی بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ وہ مختلف ریاستوں میں بڑے بڑے عہدوں پر رہے اور تین سال جیل کی ہوا بھی کھائی۔ آخر اپنی ساری توجہ اس عظیم تصنیف پر لگادی جسے "مقدمہ ابنِ خلدون" کہتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۷۰ء سے ۱۳۷۷ء کے عرصے میں لکھی گئی۔ ۵۲ سال کی عمر میں وہ بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے جس کی بنا پر انھیں مصر میں جامع ازہر میں درس و تدریس کی ذمہ داری دی گئی وہاں عرصے تک وہ فقہ مالکی کے استاد رہے۔ اسی زمانے میں وہ ایک بڑے صدمے سے دوچار ہوئے۔ ان کے بیوی بچے طیونس سے مصر آرہے تھے کہ جہاز سمندری طوفان میں پھنس کر غرقاب ہو گیا۔ ابنِ خلدون کو خبر ملی تو انھوں نے بے ساختہ کہا "اس حادثے نے مجھے مال، خوش بختی اور اولاد سے محروم کر دیا۔" آگے چل کر انھیں بادشاہِ مصر کی ہمرکابی کا مرتبہ بھی حاصل ہوا جو تیمور لنگ کا مقابلہ کرنے شام جا رہا تھا، لیکن مصر میں بغاوت ہو جانے کے سبب قاہرہ واپس آگیا اور ابنِ خلدون دمشق ہی میں رہ گئے۔ انھوں نے

دمشق کو قتلِ عام سے بچانے کے لئے تیمور سے ملاقات کی، وہ بہت متاثر ہوا اور شمالی افریقہ کے حالات پر کتاب لکھنے کی فرمائش کی جس کی انھوں نے تعمیل کر دی۔

تیموری دربار سے رخصت ہو کر وہ مصر واپس آگئے اور "تاریخ عرب و بربر" لکھی جو سات جلدوں پر مشتمل ہے اور دنیا بھر کی لائبریریوں کی زینت بنی۔ ۲۱ رمضان ۸۰۸ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۴۰۶ء میں ۷۸ سال کی عمر میں قاہرہ میں وفات پائی۔ علامہ ابنِ خلدون کا نام آج بھی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی حالات و حوادث کا جائزہ اپنی تصانیف میں بڑی عالمانہ بصیرت سے پیش کیا ہے۔ خصوصاً مقدمہ ابنِ خلدون کے تراجم دنیا کی بیشتر ترقی یافتہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

علامہ ابنِ خلدون نے سب سے زیادہ تحقیقی کام تاریخ و تہذیب پر کیا۔ مقدمہ ابنِ خلدون اور تاریخ عرب و بربر کے علاوہ آخر عمر تک بہت سی کتابیں لکھیں جو ناپید ہو چکی ہیں۔ البتہ جن کتابوں کے نسخے دستیاب ہیں ان میں تبصرہ بر اصولِ شریعت، رسالہ علم الحساب، تشریحاتِ فلسفۂ ابنِ رشد، شرح قصیدۂ بردہ اور خلاصۃ التحصیل فخر الدین راز جیسی کتابیں شامل ہیں۔

ابنِ خلدون کے سیاسی نظریات کی تفصیل مقدمہ ابنِ خلدون میں موجود ہیں۔ دیگر مفکرین کی طرح وہ بھی اجتماع کو انسانی فطرت کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔ خلافت کو بہترین طرزِ حکومت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک امرِ الٰہی کے قوانین موجود ہیں اور کوئی ان میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ خلیفہ مطلق العنان نہیں ہو سکتا۔ اسے اپنے اعمال کے لئے خدا کے سامنے اور افعال کے لئے عوام کے سامنے جوابدہ ہونا چاہیئے۔ خلافت کی درجہ بندی کرتے ہوئے انھوں نے سب سے بہتر اور افضل درجہ رسول مقبولؐ کا قرار دیا ہے۔ ان کے بعد خلفائے راشدین کی خلافت۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خلیفہ اپنا جانشین نامزد کر سکتا ہے بشرطیکہ نامزد کردہ شخص اس کا عزیز نہ ہو، لیکن اگر مصلحتِ وقت کا تقاضا ہو کر بیٹے کو ولی عہد بنایا جائے تو اس میں مضائقہ نہیں۔ وہ خلافت یا دینی حکومت کو کسی ایک قوم میں رکھنے کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک خلیفہ میں چار صفات ضروری ہیں۔ علم، عدالت، کفایت اور اعضاء و حواس کی سلامتی۔

ابنِ خلدون پہلے مسلم مفکر ہیں جنھوں نے سیاست میں معاشی مسائل کو اہمیت دی ہے۔ ان کا مشہور مقولہ ہے "سلطان اور مملکت دنیا کے سب سے بڑے بازار ہیں۔" ابنِ خلدون کی نظر

میں کوئی علم ایسا نہیں ہے جو تاریخ کے دائرہ کار سے باہر ہو۔ وہ تاریخ نویسی کو صرف تنقیدی تاریخ تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ اس ارتقائی دور میں جو عوامل و رجحانات ظہور پذیر ہوئے ان کو انھوں نے فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے "تاریخ محض انسان کے ماضی کے واقعات نہیں بلکہ اس میں اندازِ فکر، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور محسوس کرنے کے اثرات بھی شامل ہیں"۔ دنیا کے بیشتر محققین و مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ ابنِ خلدون جدید فلسفہ علم التاریخ کے بانی ہیں۔ انھیں امام عمرانیات کا درجہ بھی دیا جاتا ہے کیونکہ وہ علم عمرانیات کے موجد اعلیٰ ہیں۔ وہ اس علم کو بنیادی طور پر مشرقی علم تصور کرتے ہیں۔ ابنِ خلدون کی عظمت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے پہلی بار زمانے کی روش سے ہٹ کر سوچا اور حال کا جائزہ ماضی کی روشنی میں لیا اور یہ اس دور کے لحاظ سے ایک انقلابی قدم تھا۔ ابنِ خلدون کے نظریات میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف یہ نظریہ ہے کہ وہ تعلیم کو معاشی ضرورت کے مقابل عیاشی کا نام دیتے ہیں۔ یہ ایک سائنٹفک سوچ تھی۔

مغربی اہلِ قلم نے ہر دور میں ابنِ خلدون کے کارناموں کو بہت سراہا ہے۔ مثلاً ٹائن بی (Toynbee) نے لکھا "ابنِ خلدون اس ستارے کی مانند ہے جو ماحول کی تاریکی کے مقابلے میں زیادہ روشنی سے چمکا"۔ کارس اساوی کا کہنا ہے " ابنِ خلدون کا مقام تاریخ میں اتنا اونچا ہے کہ نہ تو اس کے ہمعصروں میں کوئی اس جیسا تھا اور نہ بعد میں کوئی اس جیسا ہوا"۔ اہلِ قلم نے علامہ ابنِ خلدون پر جو کچھ کہا اور لکھا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وسیع نظر مفکر اور عظیم مورخ تھے اور عالم اسلام کے زندۂ جاوید سپوت۔

تسخیرِ کائنات

ایک مشہور قصّہ ہے کہ کوئی گمنام سائنس داں جس نے کام تو سائنسی تحقیق پر بہت کئے
تھے مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کی شہرت کسی ایسے کارنامے سے ہو جو دوسروں نے انجام نہ دیے ہوں
وہ شب و روز اپنی تجربہ گاہ میں مختلف تجربے کرتا رہتا اور اگر کوئی نئی بات دریافت کرتا تو اپنے
گنے چنے دوستوں کو بھی بتا دیتا۔ ایک دن اس کا بے تکلف دوست ملنے آیا۔ دیکھا تو موصوف
کسی نئے تجربے میں مصروف تھے۔ دوست نے چوٹ لگاتے ہوئے کہا۔ کیوں بیکار اپنی جان
کھپاتے ہو۔ دیکھو میرے پاس کہانیوں کی یہ کتاب ہے جس میں اڑن کھٹولے کا ذکر ہے۔ میں
تم کو اس وقت بڑا سائنس داں مانوں گا جب تم ایسا ہی اڑن کھٹولا بناؤ۔" سائنس داں
مسکرایا اور جب اس کا دوست جانے لگا تو آہستہ آہستہ سے اپنے دوست کا ہاتھ دباتے ہوئے
اس نے کہا۔ "اطمینان رکھو، میں تم کو اڑن کھٹولا بنا کر دکھا دوں گا۔"

یہ تو خیر بیتے ہوئے زمانے کی بات تھی۔ اب انسان نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ تسخیرِ کائنات
میں وہ کتنا اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ بہت ہی تیز رفتار جہاز، خلائی جہاز، مصنوعی سیارے
اور چاند ستاروں پر کمندیں ڈالنے والی ایجادات منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے جو
قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے اس کی تصدیق تسخیرِ کائنات کے سائنسی کارناموں سے ہو
رہی ہے۔ بے شک۔ وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے
حکم سے کشتیاں اس میں چلیں۔ اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو اپنی قدرت
سے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر
کرنے والے ہیں (سورۃ الجاثیۃ ۴۵- ۱۲- ۱۳)

مسلمانوں نے اپنے عہدِ زریں یعنی دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں اعلیٰ پیمانے پر علوم کی جو تلاش و تحقیق کی اس کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔ سب سے پہلی اور اولین وجہ تو یہ ہے کہ مسلمان اس وقت قرآن مجید اور پیغمبرِ اسلام آنحضرتؐ کے بار بار دیے گئے احکام کی تعمیل کر رہے تھے۔ دمشق یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد الحجاز الخطیب کے مطابق قرآن حکیم کی ۲۵۰ قانونی آیات کے مقابلے میں ۷۵۰ آیات میں اہلِ ایمان کو مطالعۂ فطرت اور غور و فکر، عقل کے زیادہ سے زیادہ استعمال اور سائنسی جستجو کو معاشرے کی زندگی کا لازمی جزو بنانے کی ہدایات دی گئی ہیں۔

دوسری وجہ علما کا وہ اعلیٰ و ارفع مقام ہے جو اسلام میں عالموں کو عطا کیا گیا۔ تیسری وجہ یہ کہ اسلام کی بین الاقوامی حیثیت ہے۔ اہلِ اسلام نے حصولِ علم و حکمت میں کسی قسم کا کوئی تعصب روا نہ رکھا، کیونکہ حق کی تلاش کرنے والے کے لئے صداقت سے بڑھ کر کوئی شے نہیں ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کی تعلیمات میں ایک اہم فریضہ طلبِ علم ہے۔ آغازِ اسلام کے پہلے یادگار دن سے لے کر اس وقت تک جبکہ مسلمان حصولِ علم و حکمت میں پیش پیش رہے اور مسلمان اہلِ علم و اہلِ حکمت نے وہ کارنامے انجام دیے جو چراغِ راہ ثابت ہوئے اور جن کی بدولت تسخیرِ کائنات کے بہت سے مرحلے آسان ہوئے۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشادِ ربانی ہے "زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں ان ہوشمندوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے وقت ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔"

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو علم و حکمت کی بہت بڑی دولت سے نوازا ہے یعنی قرآن و حدیث میں ایسے فکر انگیز و نتیجہ خیز فرمودات موجود ہیں جن کو عملی جامہ پہنا کر مسلمانوں نے تسخیرِ فطرت اور تسخیرِ کائنات کے شعبے میں ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے۔